سالنامہ ۲۰۰۷ء

سہ ماہی

الاقربأ

اسلام آباد

ترک مصنف: اُرحان پاموک

الاقرباء فاؤنڈیشن، اسلام آباد

سہ ماہی الاقرباء اسلام آباد

(تہذیب و معاشرت، علم و ادب اور تعلیم و ثقافت کی اعلیٰ قدروں کا نقیب)

جلد نمبر ۱۰ شمارہ نمبر ۱ جنوری۔مارچ ۲۰۰۷ء

الاقرباء فاؤنڈیشن۔اسلام آباد

مکان نمبر ۳۶۴ سٹریٹ نمبر ۵۸ آئی ۸/۳ اسلام آباد

فون ۴۴۳۲۶۸۶ فیکس ۰۵۱-۲۱۰۲۶۷۰

E-mail: alaqrebaislamabad@hotmail.com

بیرونِ ملک معاونینِ خصوصی

یورپ

بیرسٹر سلیم قریشی

برکلے چیمبر۔ 2۔ اے برکلے روڈ۔

لیٹن سٹون (Leytonstor) لندن۔

ای II 3 ڈی جی فون (0208)5582289

فیکس (0208) 5583849

ای میل: qureshi@ss.life.co.uk

امریکہ

محمد اویس جعفری

218 نارتھ ایسٹ 175 سٹریٹ سیاٹل (Seattle)

واشنگٹن 3516-98155 (یو۔ایس۔اے)

فون 8094-361 (206) دفتر 5321-679 (360)

فیکس 0414-361 (206)

ای میل jafreyomi@gmail.com

زرِ تعاون

فی شمارہ	۸۰ روپے
سالانہ (مع محصول ڈاک)	۳۵۰ روپے
بیرون ملک فی شمارہ	۷ ڈالر/ ۵ پاؤنڈ
بیرون ملک سالانہ	۳۰ ڈالر/ ۲۰ پاؤنڈ

کوائف نامہ

شمارہ	جنوری۔ مارچ ۲۰۰۷ء
ناشر	سید ناصر الدین
کمپوزنگ	نعیم کمپوزرز۔ اسلام آباد
طابع	ضیاء پرنٹرز۔ اسلام آباد

مندرجات

مضامین و مقالات

خاکہ۔افسانہ۔انشائیہ۔کہانی

بین الاقوامی ادب

نعت۔ سلام و منقبت

غزلیات

منظومات

قطعات و رباعیات

نقد و نظر

متفرقات

مراسلات

خبرنامہ الاقرباء فاؤنڈیشن

اداریہ

ادب کا نوبل انعام ۔۔۔معیار و ملحوظات

گذشتہ ایک صدی سے بھی زیادہ مدت سے یہ سلسلہ جاری ہے کہ زندگی کے اہم ترین شعبوں میں نمایاں ترین خدمات انجام دینے والوں کو ہر سال عالمی سطح پر اعزاتِ استحسان و تکریم سے نوازا جاتا ہے جس کا اہتمام سکینڈ ینیویا کے ملک (Scandanavian Country) سوئیڈن کی ایک اکیڈیمی کی جانب سے کیا جاتا ہے۔ عام تاثر یہی ہے کہ انعام یافتگان کے تعین سے قبل اُن کی متعلقہ شعبہ میں خدمات اور کارکردگی کو ایک سخت ترین معروضی معیار کے تحت تنقید و تجزیہ کی میزان سے گزارا جاتا ہے چنانچہ امنِ عالم اور فلاحِ انسانی جیسے شعبوں کے علاوہ ادب کے شعبہ میں بھی عطائے اعزاز کا جسے نوبل انعام (Nobel Prize) کا نام دیا گیا ہے سلسلہ جاری ہے۔ ۱۹۰۱ء میں جب اس سلسلہ کا آغاز ہوا تو پہلا نوبل فرانس کے معروف اہل قلم فرینکوئس آرمنڈ (Francois Armand) کو جس کا قلمی نام سُلی پروڈھومے (Sully Proudhomme) تھا اس اعتراف کی بنا پر دیا گیا کہ اُس کی شعری نگارشات اعلیٰ ترین فکر، فنکارانہ مہارت اور دل و دماغ کی بہترین صلاحیتوں کے امتزاج کا نمونہ ہیں۔ اور اب ادب کا تازہ ترین نوبل انعام برائے سال ۲۰۰۶ء ترکی کے گزشتہ چند برسوں میں عالمی شہرت حاصل کرنے والے ادیب اُرحان پاموک (Orhan Pamuk) کو دیا گیا ہے۔

پاموک کا نام بین الاقوامی منظر پر اُس وقت خاص طور پر اُبھر کر آیا جب ۱۶ دسمبر ۲۰۰۵ء کو ترکی میں اُس کے خلاف اس الزام کے تحت ایک فوجداری مقدمہ کی کارروائی کا آغاز ہوا کہ وہ ملک کے تشخص کی توہین کا مرتکب ہوا ہے اس الزام کا پس منظر یہ تھا کہ اُس نے سوئٹزرلینڈ کے ایک اخبار کو اپنے انٹرویو میں ترکی کو جنگ عظیم اول میں دس لاکھ آرمینیوں کے قتل عام اور ماضیء قریب میں تیس ہزار کُردوں کے قتل کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ پاموک کے ناولوں کے مطالعہ سے ترکی کے تشخص کی کثیر الجہتی سے متعلق جو ملوکیت سے مملو پُر ثروت ماضی پر مبنی ہے مصنف کی ایک ذہنی تلاش اور جستجو کا واضح احساس

ہوتا ہے چنانچہ ترکی کے ماضی پر اس تنقیدی رویے کو مغرب میں پذیرائی ملی اور چونکہ ترکی یورپی یونین میں شمولیت کیلئے درخواست دے چکا تھا اس لئے از رہِ مجبوری ترکی نے یورپی یونین کے دباؤ کے آگے سرِ تسلیم خم کیا اور ۷ فروری ۲۰۰۶ء کو پاموک کے خلاف الزامات واپس لے کر مقدمہ ختم کر دیا۔

اس پس منظر کے ساتھ یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ ۱۲۔ اکتوبر ۲۰۰۶ء کو جب پاموک کو نوبل پرائز سے نوازا گیا تو اُسی روز فرانس کی پارلیمنٹ کے ایوانِ زیریں میں ایک بل کی منظوری دی گئی جس کے تحت آرمینی قتلِ عام کی تکذیب کو قابلِ تعزیر جرم قرار دیا گیا جبکہ ترک حکومت آرمینی قتلِ عام کے لئے شورش پسندوں کو متہم گردانتی ہے۔ حالات و واقعات کا معروضی جائزہ لینے سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ پاموک کی تحریروں میں سلطنتِ عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد اسلام اور لادینیت کا تصادم' روایت و جدت اور جدید ترکی کی جانب سے مغربی سانچوں میں ڈھلنے کی جارحانہ کاوش نمایاں موضوعات ہیں اس کے ناولوں میں جو اظہارِ رائے کی آزادی کے مظہر ہیں مشرق و مغرب کے تصادم و تضادات کو وجہ نزاع نہ بنانے کے پیغام کی صدائے بازگشت بھی سنائی دیتی ہے پاموک اعتدال کے نقطۂ نظر اور انسانی یاسیت سے لگاؤ کے ایک مخصوص رجحان کا حامل نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ اُسے مغرب میں محبوب گردانا گیا لیکن ہم وطنوں میں بوجوہ معتوب! تاہم اُس کی فنکارانہ صلاحیتوں بلکہ ''معجزاتِ قلم'' کا برملا اعتراف کیا جاتا ہے۔

یہ تمام متذکرہ وجوہ اس واضح حقیقت کو تقویت پہنچاتی ہیں کہ سویڈن کی اکیڈمی کی عطائے اعزازات کا پیمانہ اور معیار و ملحوظات معروضی کم اور اضافی زیادہ ہیں یہی وجہ تھی کہ پاموک کے لئے نوبل انعام کے اعلان پر خود اُس کے اہلِ وطن ورطۂ حیرت میں تھے کہ اس انعام کا مستحق شام کے معروف و مقبول شاعر علی احمد سعید کو سمجھا جا رہا تھا جبکہ یاسر کمال جیسے بین الاقوامی صلاحیت کے حامل عظیم ناول نگار کو یہ انعام کئی دہائیوں قبل مل جانا چاہیے تھا' ایک تازہ مثال انڈونیشیا کے ناول نگار پرامویدیا اناننا تو ئیر (Pramoedya Ananta Toer) کی ہے جن کے بارے میں عام تاثر یہی ہے کہ انہیں نظر انداز کر کے صریح ناانصافی کی گئی چنانچہ انعامات کے تعین میں فکری و نظری عصبیت کی

کارفرمائی پر اس لئے بھی یقین آجانا چاہیے کہ گزشتہ ایک صدی سے بھی متجاوز مدت میں جنوبی ایشیا میں اگر کسی کو نوازا گیا تو وہ صرف رابندرناتھ ٹیگور تھے جنہیں ۱۹۱۳ء میں نوبل انعام کی شکل میں سُرخاب کا پَر عطا کیا گیا اور اس سے قبل یا بعد بشمول علامہ اقبالؒ جیسے عظیم مفکر اور اہلِ قلم کسی کو مستحق نہیں گردانا گیا فیض مرحوم بھی لینن پرائز کے تو حق دار ٹھہرائے گئے لیکن نوبل پرائز کی اُن کی آرزو تشنۂ تکمیل رہی۔

ارفع ادب کے ضمن میں ہمارا ذہن تین بنیادی خصوصیات کو تسلیم کرنے پر مائل نظر آتا ہے یعنی (۱) زمان و مکاں سے ماورائیت، (۲) آفاقیت اور (۳) انسانیت۔ لیکن محسوس ہوتا ہے کہ سویڈن کی اکیڈمی کے صاحبانِ مقتدر خود فکری افلاس کی حد تک ذہنی تنگ دامانی کا شکار ہیں' انہیں ادب عالیہ کی یہ تین اقدار صرف نام نہاد اور بے لگام آزادیء اظہار رائے کے حق اور ان کے اپنے تعبیر کردہ حقوقِ انسانی میں نظر آتی ہیں جبکہ بالخصوص اسلام کو ''مذہبِ محض'' قرار دینا جہل یا عصبیت کی بدترین شکل ہے کہ مبادیاتِ اسلام کا سرسری مطالعہ ہی اُس کے مکمل ضابطہء حیات ہونے کا تیقن فراہم کرتا ہے اور متذکرہ تین اوصافِ ادب کا علمبردار نظر آتا ہے۔ بقولِ اقبالؒ:

مکّہ نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام　　　جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم!

لہٰذا ہمیں ہرگز تعجب نہیں کہ گزشتہ ایک صدی میں صرف ۱۹۸۸ء میں مصر کے نجیب محفوظ کو بوجوہ نوبل انعام کا سزاوار ٹھہرایا گیا گزشتہ ایک سو پانچ برس کے انعامات میں صرف سات یا آٹھ انعامات ایسے نظر آتے ہیں جو ترقی پذیر دنیا کے ممالک کے حصے میں آئے جن میں دوبار جنوبی افریقہ اور دوبار ہی جاپان کے اہلِ قلم شامل ہیں باقی تمام انعامات اہلِ مغرب کی نذر ہوئے جن میں ایسے نام بھی نظر آئیں گے جو صرف خطابت کی بنا پر نوازے گئے۔

گُل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی　　　اے خانہ برانداز چمن کچھ تو اِدھر بھی

اورحان پاموک جن کا تعلق اگرچہ تیسری دنیا کے ایک اہم ملک سے ہے پاکستان میں نسبتاً کم متعارف ہیں ان کے ناولوں کے تراجم دنیا کی کم و بیش چالیس زبانوں میں ہو چکے ہیں جن میں انگریزی زبان کے پانچ تراجم شامل ہیں۔ ہمارے ہم وطن پروفیسر عمر میمن اُن کے ایک ناول کا ترجمہ

کر چکے ہیں۔ فہمیدہ ریاض نے بھی اس طرف توجہ دی ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے ہاں زبان و ادب سے متعلق ادارے بالخصوص وہ جو سرکاری سرپرستی میں قائم ہیں اور قومی زر مفوضہ کا ضیاع زیادہ اور درست استعمال کم کر رہے ہیں، انہیں بین الاقوامی ادب پاکستان کی قومی زبان میں منتقل کرنے کے اہداف تفویض کیے جائیں اور ان میں سے بعض سربراہان کو ذاتی نشر و اشاعت کیلئے اپنی منصبی حیثیت کو استعمال نہ کرنے کی ہدایت کی جائے چنانچہ اس طرح ممکن ہو سکے گا کہ ہمارے اہل قلم جو فکر و فن کی بے پایاں صلاحیتوں سے بہرہ مند ہیں ادب میں بین الاقوامی رجحانات و موضوعات سے زیادہ تفصیلاً متعارف ہو سکیں اور عالمی سطح کے اُس قلم قبیلہ کے شانہ بشانہ آ سکیں جس کی گرفت میں نبضِ عالم بھی ہے اور نظم عالم بھی۔

''ایک اک کر کے ستاروں کی طرح ٹوٹ گئے''

ابھی قاسمی صاحب کا غم تازہ تھا کہ وقت نے یکے بعد دیگرے کئی زخم اور لگائے اس طرح ۲۰۰۶ء کا سال جاتے جاتے اُردو ادب کی کہکشاں سے کچھ ایسے ستارے توڑ کر لے گیا جن کے بعد روشنی تو ہے مگر بہت مدھم بہت نحیف! شوکت صدیقی اور منیر نیازی رخصت ہوئے تو ۲۰۰۷ء نے آغاز ہی میں وہ سفا کی دکھائی کہ محسن بھوپالی اور الیاس عشقی کی مفارقت نے شعر و ادب کو نڈھال کر کے رکھ دیا۔ محسن تو ویسے بھی 'حیات و موت' کے اس سنگم سے گزرنے کے منتظر بیٹھے تھے۔

صحرا کی امانت ہوں سرِ کنجِ بہاراں　　　　بیٹھا ہوں بلاوا مرا جب تک نہیں آتا

محسن بھوپالی (عبدالرحمان) نے بہ اعتبار پیشہ انجینئر ہونے کے باوجود بھرپور شعری و ادبی اور ثقافتی زندگی گزاری ان کا نام مشاعروں کی فہرست شعرا کی زینت سمجھا جاتا تھا۔ وقت کے ہر نشیب و فراز سے بڑے دلیرانہ انداز سے گزرے۔ رفاقتوں اور رقابتوں دونوں ہی کا حق ادا کیا۔ فکر شعر کو زندگی کے تلخ و شیریں حقائق پر مرتکز رکھا اور ''نیرنگئی سیاست دوراں'' کو بھی بحیثیت شاعر آڑے ہاتھوں لیا۔ ان کے عہد کی تاریخ انہیں کبھی فراموش نہیں کر سکتی ویسے بھی محسن جو سرمایہ فکر و فن نسلِ نو

کے سپرد کر گئے ہیں وہ اُنکے نام کو زندہ رکھے گا۔ ان کی تقریباً دو درجن تصانیفِ نظم ونثر میں اُن کے پہلے مجموعہءِ شعری ''شکستِ شب'' اور ''نظمانے'' سے صرفِ نظر ممکن نہیں کہ اس نئی صنفِ سخن کے حسنِ ایجاد کا سہرا ان کے سر تھا۔ ڈاکٹر الیاس عشقی بھی جنہیں علمی وادبی حلقے ریڈیو پاکستان کے حوالے سے بہتر جانتے ہیں، ایک محقق اور صاحبِ نظر ادیب کی حیثیت سے یاد رکھے جائیں گے زیر نظر شمارہ میں بھی سرمدؔ کی رباعیات کے اردو تراجم پر اُن کا محققانہ تبصرہ اُن کی وسعتِ مطالعہ اور نقد و نظر کی صلاحیتوں کا مظہر ہے اور یہی غالباً اُن کی آخری تحریر ہے۔

شوکت صدیقی ہمارے ایسے ناول نگار تھے جن کی بصیرتِ فکر اور بلاغتِ نظر سے اُن کی قابلِ رشک فن کارانہ عظمت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ اہلِ وطن ''خدا کی بستی''، ''تیسرا آدمی''، ''اندھیر اور اندھیرا'' اور ''راتوں کا شہر'' جیسی ناول وافسانہ کی صنفِ ادب میں لازوال تحریروں کو کبھی نہ بھلا سکیں گے ''خدا کی بستی'' اور ''جانگلوس'' کی ٹیلیوژن پر ڈرامائی تشکیل نے شوکت صدیقی کے نام کو زندہ جاوید بنا دیا ہے وہ عوام کے دکھ درد خصوصاً معاشی مسائل کی سحر انگیز عکاسی کے ماہر تھے۔ قلم کی ایسی طاقت اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو ودیعت فرماتا ہے وہ خوش نصیب ہوتے ہیں اور زندہ جاوید بھی۔

اسی کہکشاں کا ایک ستارہ منیر نیازی بھی تھے جو اپنی شخصیت اور فن کے اعتبار سے منفرد کہے جا سکتے ہیں۔ منیر حلقہ اربابِ ذوق لاہور کے اُس عہد کی۔ ناقابلِ فراموش یادگار تھے جس میں ناصر کاظمی۔ انتظار حسین۔ انجم رومانی، شہزاد احمد اور احمد مشتاق وغیرہ نمایاں اہلِ قلم تھے۔ منیر نیازی کا پہلا شعری مجموعہ ''تیز ہوا اور تنہا پھول'' شائع ہوا تو اُس کے بعد سے ان کی شناخت کے خدوخال اور واضح ہونا شروع ہوئے اور یہ سفر جب نوے کی دہائی میں ''کلیاتِ منیر'' کی اشاعت پر منتج ہوا تو وہ شہرت کے نقطہءِ عروج پر پہنچ چکے تھے شہرت کی اس معراج تک پہنچنے میں اُن کے اُن گیتوں اور غزلوں کا بنیادی کردار ہے جنہیں نسیم بیگم۔ نور جہاں۔ اور مہدی حسن جیسے عظیم فنکاروں نے نغمہ وموسیقی کے سحر انگیز زیر و بم میں ڈھال کر امر بنا دیا۔

خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

ڈاکٹر محمد معز الدین

مثنوی مولانا رومؒ

مثنوی مولانا روم کی عظمت اور اہمیت کا اندازہ مولانا جامیؔ کے محض ایک شعر سے کیا جا سکتا ہے جو عام طور سے پڑھے لکھے شخص کی زبان پر اس کتاب کے نام کے ساتھ خود بخود آجاتا ہے۔

مثنوی ءمولوی ءمعنوی　　　ہست قراں درزبانِ پہلوی

خلیفہ عبدالحکیم اپنی معروف تصنیف ''حکمت رومی'' میں لکھتے ہیں کہ ''بحیثیت تفسیر قرآن مثنوی معنوی کو قرآن کریم سے کئی حیثیتوں سے مماثلت حاصل ہے۔ اور یہ بھی ایک وجہ مماثلت ہے کہ تمام فرقے مثنوی سے سند حاصل کرکے اپنے عقائد کو ثابت کرنا چاہتے ہیں ''یھدی بہ کثیراً و یضل بہ کثیراً''۔ قرآن کریم کا انداز اختیار کرتے ہوئے مثنوی کو بھی اس طرح شروع کیا گیا ہے کہ جس طرح سورۂ فاتحہ تمام فرقان حمید اور کتاب حکیم کا لب لباب ہے۔ اسی طرح روح کو بانسری سے تشبیہ دے کر تمام عرفان و تصوف کا خلاصہ پہلے صفحہ پر چند اشعار میں پیش کردیا ہے۔ مثنوی کے تمام دفتر انہی اشعار کی شرح ہیں۔''

اس معرکتہ الآرا مثنوی کے مصنف مولانا جلال الدین رومیؒ جو عرف عام میں صرف مولوی یا مولانا یا مولانا روم کے نام سے مشہور ہیں۔ ۱۲۰۷ء مطابق ۶۰۴ ہجری، بلخ میں پیدا ہوئے۔ اور ترکی کے شہر قونیہ میں مدفون ہیں۔ روم دراصل شہر قونیہ کا پرانا نام ہے۔ مولانا روم کا زمانہ نہایت پر آشوب زمانہ تھا۔ ہلاکو کی ہلاکت سامانیوں سے زمانہ لرز اٹھا تھا۔ انہیں نامساعد حالات میں مولانا نے اپنی تعلیم مکمل کی اور پھر روحانیت کی طرف مائل ہو گئے اور ایک صوفی درویش شمس تبریز کی صحبت نے زندگی بدل دی۔ آپ سے والہانہ عقیدت نے عشق کا درجہ حاصل کرلیا۔ شمس تبریز کی جدائی نے قلب وجگر کو مضطرب کردیا۔ جو بالآخر مثنوی کی صورت میں زندۂ جاوید تصنیف پر منتج ہوئی۔

مثنوی مولانا روم چھ دفتروں پر مشتمل ہے۔ یہ ایک طویل صوفیانہ اور اخلاقی تصنیف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مثنوی حضرت حسام الدین چلپیؒ کی تحریک پر تخلیق کی گئی۔ جنہوں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ آپ

بھی سنائی اور عطار کے پایہ کی کوئی چیز پیش کریں۔ یہ سن کر مولانا نے چند اشعار ان کے سامنے پیش کئے جو پہلے سے لکھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد جب اور جیسے مولانا پر شعر وارد ہوتے تو حسام الدین چلپی ؒ کو لکھواتے رہتے اور یوں بالاقساط یہ مثنوی چھ دفتروں میں تیار ہوگئی۔ مثنوی اخلاق اور پند و نصائح کی حکایتوں سے لبریز ہے اور از دل خیز و بر دل ریز د کی مثال ہے۔

مولانا روم ایک عظیم انسان اور باعمل صوفی تھے اور صاحب عرفان و بصیرت مفکر۔ اپنا سلسلہ فکری اعتبار سے سنائی اور عطار جیسے بزرگ صوفی شعراء سے ملاتے ہوئے کہا کہ۔

عطار روح بود و سنائی دو چشم او　　　ما از پے سنائی و عطار آمدیم

بقول مولانا شبلی نعمانی ''فارسی زبان میں جس قدر کتابیں نظم و نثر میں لکھی گئی ہیں کسی اور میں ایسے دقیق، نازک اور عظیم الشان مسائل اور اسرار نہیں مل سکتے جو مثنوی میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ فارسی پر موقوف نہیں اس قسم کے نکات اور حقائق کا عربی تصنیفات میں بھی مشکل سے پتہ لگتا ہے'' یہی وجہ ہے کہ علماء و صوفیا اور ارباب فن نے مثنوی کی طرف برابر توجہ فرمائی اور ہر زمانے میں یہ مقبول رہی اور آج بھی یہ زندۂ جاوید ہے اور ایک انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مثنوی مولانا روم مسلمانوں کے لئے تو ایک تہذیبی ورثے کا درجہ رکھتی ہے۔ مشرقی علوم بالخصوص فارسی ادب کے مطالعے کی تکمیل اس کے بغیر ممکن نہیں۔ مولانا نے ملت اسلامیہ کو امید، ولولے اور استقلال کا درس دیا ہے۔ زندگی جہد مسلسل کا نام ہے۔ مایوسی اور نومیدی ''زوال علم و عرفان ہے'' مثنوی روم زندگی میں صبح امید کی تابناک اور روشن کرنیں بکھیرتی ہے بقول مولانا روم ''ہمہ آفتاب بینم، ہمہ آفتاب گویم''۔ بلاشبہ مثنوی مولانا روم فکر اسلامی کا انمول گنجینہ ہے اور علم و عرفان کا بیش بہا خزینہ۔ مشرق و مغرب دونوں نے اس کا برملا اعتراف کیا ہے۔ کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر آر۔ اے نکلسن نے اس کا انگریزی زبان میں نہایت خوبصورت ترجمہ کیا ہے۔

علامہ اقبال اپنے آخری زمانے میں صرف قرآن حکیم اور مثنوی مولانا روم کا مطالعہ فرماتے تھے۔ ''میں ایک مدت سے مطالعہ کتب ترک کر چکا ہوں۔ اگر کبھی پڑھتا ہوں تو صرف قرآن یا مثنوی

معنوی" (مکتوب بنام حکیم محمد حسین عرشی امرتسری، اقبال نامہ، مؤرخہ ۱۹ مارچ ۱۹۳۵ء۔)

علامہ اقبال مولانا روم کے عقل و وجدان کے حسین امتزاج کے معترف اور مداح ہیں۔ اپنی کتاب بالِ جبریل میں لکھتے ہیں کہ

ہم خوگر محسوس ہیں ساحل کے خریدار — اک بحرِ پُر آشوب و پُر اسرار ہے رومیؔ

تو بھی ہے اسی قافلۂ شوق میں اقبال — جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومیؔ

اس عصر کو بھی اس نے دیا ہے کوئی پیغام — کہتے ہیں چراغ رہ احرار ہے رومیؔ

مولانا روم کے نزدیک عرفان حقیقی خود شناسی کا نام ہے۔ اسی پہچان سے آفاق کی پہچان ہے اور آفاق کی پہچان ذات باری کی پہچان ہے۔ "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ"

معاشرے کے جمود و تشکیک نیز یونانی فلسفے کے زیر اثر تعقل کی جو گرد فکر اسلامی پر چھا گئی تھی اس کو مولانا روم نے اپنے روح پرور اشعار سے پاک وصاف کیا اور اپنے پُر اثر اور حیات آفریں کلام سے ملت اسلامیہ کی ذہنی اور روحانی تربیت کی۔ عقل و وجدان کے ذریعہ بے شک ساحل تک ہماری رسائی ہو سکتی ہے مگر زندگی کے بحر بیکراں میں بغیر عشق الٰہی اور جذب صادق کے ہم غوطہ زن نہیں ہو سکتے عشق ایک حرکی قوت ہے جو انسان کو منتہائے کمال تک پہنچا سکتی ہے۔ مولانا رومی کے نظامِ فکر میں عشق کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما — اے دوائے جملہ علت ہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما — اے تو افلاطون و جالینوسِ ما

علامہ اقبال کے کارگاہ فکر میں بھی عشق کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے یہاں "علم ہے ابن الکتاب" عشق ہے "ام الکتاب" رومی کا مطالعہ ہمارے درد کا درماں بہم پہنچا سکتا ہے۔ بقول اقبال

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا — تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

پیر رومی را رفیق راہ ساز — تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

غرض کہ رومی کے انقلاب بداماں اشعار اور حیات پرور پیغامات سے ذہن کی بالیدگی اور قلب ونظر کی کشادگی کا سامان پیدا ہوتا ہے۔

؎ تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را　　گاہے گاہے باز خواں ایں قصہء پارینہ را

مثنوی مولانا روم میں حیات وکائنات کی ماہیت، حقیقت تک علم وعقل کی نارسائی، جبر وقدر کے مسئلے، عشق کی جلوہ سامانی، خیر وشر کی آویزش، عالم اسباب وعلل، مسئلہ وحدت الوجود، حقائق زندگی کی تشریح وتفسیر کے ساتھ کیا کچھ نہیں۔ عمل پیہم اور سعی مسلسل کی تبلیغ وتلقین کرتے ہوئے اور زندگی کی شب تار کو صبح درخشاں سے بدلنے کی تدبیر بتاتے ہوئے مولانا کہتے ہیں کہ جد وجہد سے ہی انسان منزل مراد تک پہنچ سکتا ہے۔ اور گوہر مقصود حاصل کر سکتا ہے　ع　جہد کن تا مست ونورانی شوی

اور انسان بالآخر مرد خدا اور انسان کامل بن سکتا ہے

مردِ خدا بحر بود بے کراں　　مردِ خدا بارد دُرِ بے سحاب

مردِ خدا دارد وصد ماہ وچرخ　　مردِ خدا دارد صد آفتاب

غرض کہ مثنوی مولانا روم فلسفہ وحکمت، تصوف وطریقت، معارفِ قرآنی کا دلآویز مرقع ہے معرفت الٰہی کے ساتھ اس میں انسانی ترقی کے امکانات اور اصلاحِ معاشرہ کے بے پناہ اسالیب وعوامل کی گرہ کشائی کی گئی ہے۔ اس مثنوی کی اہمیت، افادیت اور ضرورت آج بھی اسی طرح برقرار ہے جس طرح آٹھ سو سال پہلے تھی۔ اور مولانا رومؒ زندہ وپائندہ ہیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق　　ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

"The world of today needs a Rumi to create an attitude of hope and to kindle the fire of enthusiasm for life"

(Reconstruction of Religions Thought in Islam by Allama Iqbal-Capt II, P/121)

ڈاکٹر معین الدین عقیل

ایران میں اقبال کا حالیہ مطالعہ

ایران میں اقبال کے مطالعے کی تاریخ دو ادوار میں تقسیم ہے' لیکن وہاں مطالعہء اقبال کو اولاً کوئی بہت حوصلہ افزاء صورت حال میسر نہ آئی تھی۔ اس کی ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ جس زمانے میں جنوبی ایشیا یا ہندوستان میں اقبال بڑی حد تک اپنی شاعری اور ایک حد تک اپنی فکر کے لحاظ سے مسلمانوں کی توجہ اور مقبولیت کا مرکز بن گئے تھے۔۔ وہ وقت ایران میں جدیدیت اور مغربیت کے اثرات کی زد میں تھا اور وہاں کے معاشرے میں جدید رجحانات اور مغربی تصورات تیز رفتاری سے اپنے اثرات کے لیے جگہ بنا رہے تھے اور ماضی پرستی' روایت پسندی اور ادب و فن میں رومانیت اور کلاسیکیت کی پسندیدگی اور قبولیت کے لیے بہت کم گنجائش باقی رہ گئی تھی اس لیے اس وقت اقبال اور ان کی شاعری اور فکر سے دلچسپی کے لیے ایرانیوں میں کوئی نرم گوشہ پیدا ہوتا ہوا نظر نہ آتا تھا۔

یہ دور ایران میں خود کلاسیکی فارسی ادب اور شاعری کے مطالعے کے لحاظ سے بہت خوش کن بھی نہ تھا۔ اور پھر اس صورت میں کہ جب بات ایران سے باہر۔۔۔ خصوصاً ہندوستان یا جنوبی ایشیا کی فارسی زبان یا ادب کی ستائش یا قدر افزائی کی ہو۔۔۔ تو ہمارے غالب' شبلی' گرامی اور اقبال کیا توجہ حاصل کرتے۔ چنانچہ اُس وقت تک جب تک قیام پاکستان کے بعد' ایران میں قیام پاکستان کے محرکات و عوامل اور جد و جہد کا چرچا عام ہونے۔۔۔ اور تہران میں پاکستان کے سفارت خانے کی کوششوں کے زیر اثر سالانہ یوم اقبال کے انعقاد اور اس میں ایرانی اکابر، ادیبوں، شاعروں اور دانش وروں کی شرکت اور ان کے مطالعہ اقبال کا سلسلہ شروع ہونے تک۔۔۔۔ اقبال' ان کی شاعری اور ان کی فکر ایک غیر اہم موضوع کی حیثیت رکھتی تھی۔ یعنی جب ملک الشعراء بہار' سعید نفیسی اور مجتبیٰ مینوی جیسے اکابر شاعروں اور نقادوں نے اقبال کی جانب توجہ کی اور اقبال کی شاعری اور فکر کو اپنا موضوع بنایا۔ ایران میں اقبال کی شخصیت و حیثیت' محاسنِ شاعری اور فکری امتیاز سامنے آئے اور ایران بھر کے عوام میں ان کی مقبولیت عام ہونے لگی۔ تو اس طرح وہاں مطالعہ اقبال کے دور اول

کا آغاز ہوا۔

مطالعہ اقبال کے اس دورِ اول کو مذکورہ بالا اکابرین کے ساتھ ساتھ علی اکبر دہخدا، علی اصغر حکمت۔ گلچین معانی اور منوچہر طالقانی جیسے مقتدر محققین، نقادوں اور دانشوروں سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ ان بزرگوں میں سے مجتبیٰ مینوی نے تو اقبال کو اپنے خصوصی مطالعے کا بھی موضوع بنایا اور ایک مستقل کتاب ان کی شاعری اور فکر پر تحریر کی۔

مطالعہ اقبال کے ضمن میں ایرانی اکابر کی دلچسپی و توجہ کے لحاظ سے دوسرے دور کا آغاز ڈاکٹر علی شریعتی اور ان کے مطالعہ اقبال کو سمجھنا چاہیے، جب ۱۹۷۰ء میں ڈاکٹر شریعتی اور ان کے ہم خیال دانشوروں اور اسلامی تحریک کے داعیوں نے یوم اقبال کا انعقاد کیا اور ڈاکٹر شریعتی نے اس میں ایک پر مغز اور فکر انگیز خطبہ پیش کیا جو بعد میں ان کی اقبال پر مستقل تصنیف ''ما و اقبال'' میں شامل ہوا۔ اس کتاب کے توسط سے ڈاکٹر علی شریعتی کی شخصیت اور فکر پر اقبال کے اثرات بھی سامنے آتے ہیں اور آج ایران جس انقلابی اسلامی تحریک کے نتیجے میں ایک اسلامی جمہوریہ اور اسلامی مملکت کی تصویر پیش کر رہا ہے۔۔۔ اور جن افکار و خیالات کے زیر اثر وہاں اسلامی انقلاب کامیابی سے ہم کنار ہوا وہاں ہم ڈاکٹر شریعتی اور بعض دیگر دانشوروں کے توسط سے فکر اقبال کو بھی ایران کی انقلابی اسلامی تحریک کا ایک عامل، محرک اور سبب سمجھ سکتے ہیں۔

اس دور انقلاب اور تحریک اسلامی کے اس عرصے میں فکر اقبال نے جس طرح ایرانی دانشوروں اور مفکروں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے اور ان پر اپنے اثرات قائم کیے ہیں۔۔۔ ان کا ایک مظہر علامہ آیۃ اللہ خامنہ ای کے مطالعہ اقبال کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔۔۔ اور یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ اسلامی انقلاب کے ایک ہراول رہنما۔۔۔ اقبال کی فکر سے کس طرح اور کس حد تک متاثر تھے اور اقبال کے تعلق سے وہ کس قسم کے عقیدت مندانہ اور والہانہ جذبات سے سرشار تھے۔ اور ان کی تحریک اور سرپرستی میں ایران میں مارچ ۱۹۸۶ء میں بین الاقوامی اقبال کانگریس کا اہتمام اقبال سے ان کے معتقدانہ جذبات کا ایک واضح ثبوت ہے۔

اقبال کو ایران سے جو محبت و نسبت تھی اور جس امید و اعتماد کے تحت انہوں نے تہران کو عالم اسلام کے ایک مرکز کے طور پر دیکھنا چاہا تھا:۔

طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا　　　شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

ان کی اس آرزو و خواہش نے ایرانی زعماء کو بجا طور پر اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ آیۃ اللہ خامنہ ای کا کھلے لفظوں میں خود کو اقبال کا مرید قرار دیتے ہوئے اعتراف کہ ایران میں اسلامی جمہوریت نے اقبال کی آرزو اور خواہش کے نتیجے میں عملی صورت اختیار کر لی ہے آیۃ اللہ کا کہنا کہ اگر اقبال آج زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ وہ جس قوم کو یہاں اپنے پیروں پر کھڑا دیکھنے کے خواہاں تھے وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو چکی ہے۔ ایک انقلابی رہنما اور ایک سربراہ مملکت کی طمانیت قلبی اور اطمینان کی وہ صورت ہے جسے وہ اپنی قوم اور مملکت کے لیے خود بھی دیکھنے کا آرزومند ہے۔ اور وہ یہ اعتراف بھی کرتا ہے کہ اس تحریک اور جدوجہد کا ایک عامل اقبال اور اس کی فکر بھی ہے۔

علامہ خامنہ ای تو اقبال کی ستائش اور تحسین میں اس حد تک پرجوش ہیں کہ انھیں اقبال کی شاعری کو شعری معجزات میں شمار کرنے میں بھی تامل نہیں! اور اس حد تک وہ اقبال کو پسند کرتے ہیں کہ تمام غیر ایرانی، فارسی شاعروں کے مقابلے میں محض اقبال کو فوقیت دیتے ہیں۔ یہ اعتراف اس بات کا بھی مظہر ہے کہ علامہ خامنہ ای کا مطالعہ کس قدر بسیط اور گہرا ہے کہ پوری فارسی شاعری کی روایت کو سامنے رکھ کر اقبال کے بارے میں وہ یہ رائے دیتے ہیں، جو صرف ایران کی حد تک محدود نہیں بلکہ ماورا النہر اور سارا وسط ایشیا، افغانستان اور ہندوستان اس میں شامل ہیں۔

اقبال کی ایک اور عظمت کا حوالہ علامہ خامنہ ای کھلے لفظوں میں دیتے ہیں کہ اقبال نے، اگرچہ ان کی اپنی زبان فارسی نہیں لیکن انہوں نے اپنی شاعری میں فارسی کو اس طرح استعمال کیا ہے کہ شاید کم ہی ایرانی شاعر ایسے لطیف پیرائے اور محاسن شعری کے ساتھ شعر کہہ سکتے ہیں اور ایرانی شاعروں کے مقابلے میں اقبال کو یہ اعجاز و اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ نہ صرف فارسی بلکہ سبک ہندی، طرز عراقی اور طرز خراسانی میں مہارت کے ساتھ شعر کہتے رہے ہیں۔ علامہ خامنہ ای کے خیال میں اقبال کی فارسی دانی اور ادب سے ان کی نسبت و قربت کے باوجود انہیں صرف شاعر کہنا ان کے حقیقی مرتبے کو کم کرنے کے مترادف ہے۔ یہ ایک بہت بڑا خراج تحسین ہے جو علامہ خامنہ ای نے اقبال کی نسبت بیان کیا ہے۔

ایک شاعر کے ساتھ ساتھ، یا ایک شاعر سے بڑھ کر جناب خامنہ ای کے خیال میں اقبال ایک عظیم مصلح اور رہنما بھی تھے اور ہندوستان کی تحریک آزادی میں ان کا مقام تمام رہنماؤں سے اس حد تک بلند تھا کہ کسی رہنما کا مقابلہ بھی ان سے نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں علامہ خامنہ ای نے قائداعظم محمد علی جناح مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی سب ہی کا ذکر کیا ہے مگر ان میں فوقیت اقبال کو دی ہے۔

علامہ خامنہ ای کے مطابق اقبال کے نظام فکر میں ''خودی'' ان کا امتیازی فلسفہ تھا جس کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ مسلمان اقوام کو اقبال کی اس خودی کو سمجھنے اور اختیار کرنے کی ضرورت ہے خاص طور پر مسلمان رہنماؤں کیلئے ضروری ہے کہ وہ اقبال کے پیغام کو سمجھیں اور اس پر عمل کریں۔ دراصل خود خامنہ ای اقبال کے اس پیغام کو حوالہ بنا کر اپنا نقطہ نظر اپنی قوم تک پہنچانا چاہتے ہیں کہ اسلام بذات خود انسانی معاشروں کی فلاح و بہبود کے لیے مکمل ترین صفات کا حامل ہے اور یہ کسی اور نظریے یا نظام کا محتاج نہیں۔ ان کے خیال میں اقبال کا بھی بنیادی پیغام یہی تھا۔

اقبال کے بارے میں علامہ خامنہ ای نے جو خیالات بیان کیے ہیں اور اقبال کو موجودہ عہد میں وہ جو کچھ سمجھتے ہیں اس اعتبار سے انہوں نے اقبال کو مشرق کا بلند ستارہ قرار دیا ہے افسوس ہے، علامہ خامنہ ای کی رسائی اقبال کے محض فارسی کلام تک رہی اور اس کو بنیاد بنا کر انہوں نے اقبال کو مشرق کے ستارے سے موسوم کیا، لیکن اگر انہوں نے اقبال کے خطبات اور اردو کلام سے بھی استفادہ کیا ہوتا اور اقبال کا وہ رنگ و آہنگ بھی دیکھا ہوتا جو اقبال نے بہ انداز دیگر اردو میں تخلیق کیا تھا تو شاید وہ اقبال کو ''آفتاب مشرق'' سے کم نہ سمجھتے۔ لیکن بہر حال آیۃ اللہ خامنہ ای کے ان خیالات اور ان کی وہ خواہش اور کوشش کو' جو وہ فکر اقبال اور مطالعہ اقبال کو ایران میں فروغ دینے اور پھیلانے کیلئے انجام دیتے رہے ہیں' ایران میں مطالعہ اقبال کے امکانات کو کہیں زیادہ روشن اور حوصلہ افزاء صورت میں سامنے لا رہے ہیں۔ وہ بے حد خوش آیند اور قابل ستائش ہے۔

ڈاکٹر شاہد اقبال کامران

اسلام، اقبال اور عالم اسلام کا سیاسی اتحاد

☆ اسلام اور عالم اسلام کی حقیقی غرض و غایت، اقبال کی نظر میں

☆ جمال و اقبال کا تصور اتحاد عالم اسلامی

☆ اقبال کا اسلامی بین الاقوامیت کا تصور

☆ اقبال کا تصور صحبتِ اقوام

عالم اسلام کے سیاسی اتحاد کے بارے میں اقبال کے تصور کی نوعیت اور غایت کو صحیح تناظر میں سمجھنا ضروری ہے۔ اقبال کا رجحان اسلام کو ایک روایتی مذہب خیال کرنے کی طرف نہیں رہا۔ وہ اسلام کو ایک ایسا تجربہ قرار دیتے ہیں جو عالم انسانیت کو رنگ، نسل، زبان اور علاقے جیسی مادّی قیود سے آزاد کر کے یکجا کرنے کی خاطر کیا گیا۔ ان کے نزدیک ''اگر عالم بشریت کا مقصد اقوام انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہستیوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظام اسلامی کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آسکتا۔ کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطہ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے''۔(۱)

قومی اور نسلی نقطہ نگاہ کو یکسر تبدیل کر کے ایک خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کا آئیڈل اپنی جگہ، لیکن بیسویں صدی کے اوایل میں نسلی اور وطنی قوم پرستی نے مغربی اقوام کو انسانی سطح پر کسی وحدت کی طرف مائل کرنے کی بجائے باہم برسرِ پیکار کر دیا۔ اقبال نے اس پیکار عظیم اوّل کے وقوع سے بہت پہلے ہی اس کا اندازہ کر لیا تھا۔ میرا اشارہ اس معروف نظم نما غزل کی طرف ہے جسے اقبال نے کیمبرج سے

مخزن کے نام ارسال کیا تھا اور جو مخزن کے مارچ ۱۹۰۷ء کے شمارے کی زینت بنی تھی اور بعد ازاں بانگ درا میں مارچ ۱۹۰۷ء کے زیر عنوان شائع ہوئی۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے! کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا!
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

اقبال کے نزدیک ناپائیدار آشیانے کی شاخِ نازک کے دو پہلو تھے ایک نسلی و وطنی قومیت کا تصور، جس نے انسانی مطمحِ نظر کو محدود اور مجروح کر دیا تھا اور دوسرے زر پرستی اور زر طلبی کا جنون، کہ جس نے ایک سیاسی عقیدے کی صورت میں اپنی عمارت گری کا آغاز کر دیا تھا اور جسے معروف اصطلاح میں سرمایہ دارانہ نظام کہتے ہیں۔ اس نظام سیاست کے انجام کے بارے میں اقبال کا اندازہ پہلی عالمگیر جنگ کی صورت میں درست ثابت ہوا۔ اقبال اس نسلی اور وطنی قومیت کو تہذیب نوی کا تراشیدہ بت قرار دیتے ہیں۔

اپنی ۱۹۱۰ء والی ڈائری میں اقبال وطن پرستی، کے زیر عنوان شذرے میں اپنے اس تاثر کو مزید واضح کرتے ہیں۔ ''اسلام کا ظہور بت پرستی کے خلاف ایک احتجاج کی حیثیت رکھتا ہے۔ وطن پرستی بھی بت پرستی کی ایک نازک صورت ہے۔ مختلف قوموں کے وطنی ترانے میرے اس دعوے کا ثبوت ہیں کہ وطن پرستی ایک مادی شے کی پرستش سے عبارت ہے۔ اسلام کسی صورت میں بت پرستی کو گوارا نہیں کرسکتا۔ بت پرستی کی تمام اقسام کے خلاف احتجاج کرنا ہمارا ابدی نصب العین ہے۔ اسلام جس چیز کو مٹانے کے لیے آیا تھا، اسے مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کا بنیادی اصول قرار نہیں دیا جاسکتا۔ پیغمبر اسلام کا اپنی جائے پیدائش مکہ سے ہجرت فرما کر مدینے میں قیام اور وصال، غالباً اسی حقیقت کی طرف مخفی اشارہ ہے۔'' (۳)

وطنی قومیت سے اس قدر بے زاری کی دو بڑی وجوہ، اقبال کے معاصر سیاسی تناظر میں کچھ یوں نظر آتی ہیں۔ اوّل یہ کہ وطنی یا جغرافیائی قوم پرستی کا تصور مغرب میں رہبانیت کی طرف مائل مذہب کی عملی سیاسی زندگی سے علیحدگی کے عوض وجود میں آیا۔ مغرب نے بنائے اتحاد مذہب کی بجائے، جغرافیے یا وطن کو بنا کر ایک کمی یا خلا کو پورا تو کر لیا لیکن اس کے نتیجے میں بظاہر نظر آنے والی مادی کامیابیوں کے باوجود، عالم انسانیت کے وسیع تر مطمحِ نظر کو نقصان پہنچا پہلی اور دوسری عالمگیر جنگیں اس وطنی اور علاقائی قوم

پرستی کے نتائج خیال کی جاسکتی ہیں۔قومیت کا یہی مادی تصور انگریزوں کے زیر نگیں برصغیر میں منتقل ہوا۔
اقبال نے بطور ایک سیاسی مدبر کے بھانپ لیا تھا کہ اس سحر انگیز تصور کے لازمی نتیجے کے طور پر برصغیر کے مسلمانوں کو اپنے اسلامی تشخص سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔لہذا تاریخ کے اس فیصلہ کن موڑ اور مقام پر اقبال نے اپنے عقیدے کی روشنی میں مسلمانانِ برصغیر کی سیاسی راہوں کو منور کرنے کی نظریاتی جدوجہد کا آغاز کیا۔خطبہ الٰہ آباد (۱۹۳۰ء) کے آغاز میں اقبال مسیحیت اور اس کے رہبانی نظام، کلیسا کی وسیع آمرانہ حکومت اور اس کے اثرات اور لوتھر کے احتجاج کی وجوہ پر بحث کرتے ہوئے اور اسے درست قرار دیتے ہوئے سیاسیات اور اخلاقیات پر اس کے اثرات کا ذکر کرتے ہیں کہ انہی اثرات کی وجہ سے اہل مغرب کو کسی تصور یا نظریے کی بنیاد پر متحد ہونے کی ضرورت پیش آئی، یہ ضرورت وطنی قومیت اور نسلی مطمح نظر پر توجہ نے پوری کی۔اقبال کے نزدیک اسلام عیسائیت سے بالکل ہی مختلف مذہب ہے، لہٰذا ایسا امکان موجود ہی نہیں کہ اسلام کو بھی عیسائیت جیسے تجربات کا سامنا کرنا پڑے۔خطبہ الہ آباد میں اقبال نے برصغیر کے مسلمانوں کے سامنے مستقبل کا سیاسی لائحہ عمل طے کرنے کے لیے ایک بنیادی سوال رکھا یعنی یہ کہ آئندہ کی سیاسی جدوجہد میں مسلمانوں کے لیے ان کے مذہب کی حیثیت کیا ہوگی؟ کیا ان کا مذہب ان کے لیے عملی وسیاسی معنی ومفہوم اپنے اندر رکھتا ہے؟ یا یہ کہ وہ محض عقائد وتوہمات کا ایک نجی سا سلسلہ ہے جسے دنیاوی مسائل سے الگ تھلگ کر دینا چاہیے؟ دراصل مسلمانانِ برصغیر کی سیاسی زندگی کا یہی وہ مقام ہے جہاں یہ فیصلہ ہونا تھا کہ مسلمان متحدہ قومیت یا وطنی قومیت کے اس جدید سراب میں محو ہو جائیں یا بہ حیثیت مسلمان اپنا الگ تشخص بحال رکھتے ہوئے اپنے لیے علیحدہ سیاسی لائحہ عمل متعین کریں۔اس طویل پس منظر کو بیان کرنے کا مقصد محض یہ ہے کہ اُن وجوہ کو سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ جن کی بنا پر اقبال نے وطنی وجغرافیائی اور نسلی قومیت کے مقابل مسلمانانِ برصغیر کے لیے متبادل کے طور پر ایک ایسی اسلامی بین الاقوامیت کا تصور پیش کیا کہ جو بنیادی طور پر غیر وطنی اور غیر جغرافیائی ہو اور ''جس میں مرکزِ اتحاد وطن نہ ہو بلکہ اشتراک تمدن ہو۔'' (۴)

اقبال کے تصورِ قومیت کی اساس یہی تصورات ہیں اس منفرد تصور قومیت کو ایک تسلسل اور

ارتقائی تناظر میں سمجھنے کے لیے ۱۹۱۰ء کا خطبہ علی گڑھ، ملت اسلامیہ ایک عمرانی مطالعہ، ۱۹۳۰ء کا خطبہ الہٰ آباد اور ۱۹۳۸ء میں اسلام اور قومیت پر مولانا حسین احمد کے بیان کا جواب، جو روزنامہ انسان، لاہور میں ۹ مارچ ۱۹۳۸ء یعنی اقبال کی وفات سے قریباً ایک ماہ قبل شائع ہوا بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے پہلے خطبے میں اقبال نے اپنے تصور قومیت کی عمرانی توضیحات پیش کی ہیں۔ خطبہ الہ آباد میں اپنے تصور قومیت کی سیاسی جبکہ مضمون ''جغرافیہ اور مسلمان'' میں اقبال نے نہایت صراحت کے ساتھ اپنے تصور قومیت کو خالصاً مذہبی نقطۂ نظر سے واضح کیا ہے۔ بایں ھمہ، اس تصور قومیت نے ہندوستان کی عملی سیاست میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے سیاسی راستوں کو جدا جدا کر دیا۔

اگرچہ مسلمانان برصغیر نے صدیوں سے اپنا تاریخی، سیاسی، اور ثقافتی رشتہ اقوام ہند کی بجائے مشرق وسطیٰ اور وسطی ایشیاء کے ساتھ جوڑ رکھا تھا اور بقول اقبال برصغیر کے آدھے حصے کا رخ مشرق وسطی کی جانب اور پشت ہندوستان کی طرف ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ برصغیر کے مسلمان سلاطین کی طرف سے مرکزی خلافت سے علامتی نسبت کا سلسلہ، یہ سب کچھ یہ باور کرا رہا تھا کہ مسلمانان برصغیر کا مستقبل دنیائے اسلام کے ساتھ وابستہ رہا ہے۔ خطبہ الہ آباد کے آغاز میں اقبال نے نہایت فخر کے ساتھ اس امر کا اظہار کیا تھا کہ ''دنیا بھر میں شاید ہندوستان ہی ایسا ملک ہے جس میں اسلام کی وحدت خیز قوت کا بہترین اظہار ہوا ہے'' (۵) لہٰذا ہندوستان کے مسلمانوں کا اجتماعی تجربہ اور اس کے نتائج ہی مسلمانان عالم کے سیاسی اتحاد کی اساس بن سکتے ہیں۔ یہاں مسلمانان برصغیر نے رنگ، زبان، نسل، تاریخ، معاشی مفادات اور جغرافیے کو اتحاد و یکجہتی کا جواز اور بنیاد ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ سیاسیات کا ایک طالب علم جانتا ہے کہ عربوں کے نسلی تفاخر کے احساس نے اسلام کے وحدت خیز انسانی مطمح نظر کو دھندلا دیا تھا۔ یا یہ کہ ایرانی مسلمان کے ساتھ ساتھ اپنے ایرانی ہونے پر اور اسی حوالے سے اپنی قبل از اسلام تاریخ کے ساتھ اپنے ذہنی رابطے اور تسلسل پر بھی اصرار کرتے نظر آجاتے ہیں۔ اسی طرح افغان مسلمان کہ اقبال کو غالباً سب سے زیادہ امیدیں انہی کے ساتھ وابستہ تھیں، اپنی دینی حمیت، غیرت اور کہستانی سادگی کے باوجود اپنی رسم اور اپنے رواج اور اپنی قبائلی عصبیت کی گرفت سے اوپر اٹھنے پر تیار نہیں ہوا۔ یہ اعزاز صرف برصغیر کے

مسلمانوں کو حاصل ہوا ہے کہ انہوں نے اپنے دینی حوالے کو دیگر تمام نسبتوں پر ترجیح دی۔ اور انہی کے تجربے کی بنیاد پر عالم اسلام میں ایک ایسے سیاسی اتحاد و یک رنگی کا ظہور قیاس کیا جا سکتا ہے جس کی اساس کامل مساوات کے اصول پر ہو۔ اور جہاں مسلمانانِ عالم اپنے انفرادی اور وطنی مطمحِ نظر ایک طرف رکھ کر حیات و کائنات کے بارے میں ایک جیسے نصب العین کی بنیاد پر متحد ہونے کیلئے آمادہ و تیار ہوں۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اقبال کے نزدیک اسلام عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے۔ (۶) اقبال لکھتے ہیں کہ ''۔۔۔ قدیم زمانے میں ''دین'' قومی تھا۔ جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں نسلی قرار پایا جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ ''دین'' انفرادی اور پرائیویٹ ہے جس سے بدبخت یورپ میں یہ بحث پیدا ہوئی کہ دین چونکہ پرائیویٹ عقاید کا نام ہے اس واسطے انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف ''اسٹیٹ'' ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی، نہ انفرادی اور پرائیویٹ بلکہ خالصاً انسانی ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔'' (۷)

تو ایک اہم نکتہ جو واضح ہو کر سامنے آیا وہ یہ ہے کہ اقبال اسلام کو ایسا دین خیال کرتے ہیں جس کا مقصد عالم بشریت کو تمام تر مادی امتیازات سے بالاتر کرنے اور متحد و منظم ہونے کی طرف مائل کرنا ہے۔ اس تسلسل میں امر واقعہ یہ ہے کہ دنیائے اسلام کا کوئی بھی ملک یا ریاست اپنے قومی، جغرافیائی اور وطنی مفاخر کی بجائے، صرف اسلامی اور انسانی سطح پر اتحاد و یکجہتی کی طرح قدم بڑھا سکتے ہیں۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں مسلمانانِ عالم کا سیاسی زوال اپنی انتہا پر تھا۔ اقبال جس ملت کو ملتِ احمد مرسلؐ، ملتِ اسلام، ملتِ بیضا، ملت ختم رسلؐ، ملت عربی اور ملتِ گردوں وقار کہتے ہیں وہ ملتِ مرحوم اور ملتِ مظلوم بن چکی تھی۔ بیسویں صدی میں اسلامی دنیا کا سیاسی زوال اپنی انتہا پر پہنچا اس سیاسی زوال کی نظریاتی وجہ نسلی اور وطنی قوم پرستی کا مغربی تصور تھا کہ جسے استعمار سفید نے اسلامی دنیا میں پھیلا دیا تھا۔ خلافتِ عثمانیہ کے اپنے انجام تک پہنچنے کی وجوہ متعدد ہوں گی لیکن بڑی وجہ یہ بنی کہ مغربی تصور قومیت کے رواج یا مقبولیت کی وجہ سے ملتِ اسلامیہ کی بنائے اتحاد اسلام کی بجائے رنگ، نسل اور

علاقہ بن گئی۔ عرب قوم پرستی نے آزادی اور مکمل خود مختاری کے نام پر ملتِ واحد کو تقسیم در تقسیم کے ایک ایسے عمل سے دو چار کر دیا، جو ابھی تک جاری و ساری ہے۔ ایک بالکل دوسرے پہلو سے دیکھیں تو خلافت عثمانیہ بطور ایک ادارہ اپنی افادیت اور عالمِ اسلام کے لئے اپنے اندر مرکزیت کی کشش کو کھو رہا تھا۔ ایک تو اس سوال کی وجہ سے کہ منصبِ خلافت کسی فردِ واحد کا حق ہے؟ یا اس کے جملہ اختیارات کو کسی منتخب آئینی ادارے کے سپرد کیا جا سکتا ہے؟ چھٹے خطبے 'الاجتہاد فی الاسلام' میں اقبال نے ان نکات پر اچھی بحث پیش کی ہے۔ وہ اشارہ کرتے ہیں عالمگیر خلافت کا تعلق صرف ضرورت اور مصلحتِ وقت سے ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ دراصل جب تک اسلامی سلطنت قائم و دائم تھی' عالمگیر خلافت کے تصور پر عمل ممکن تھا۔ لیکن جب بھی اسلامی سلطنت متعدد آزاد و خود مختار ریاستوں میں تقسیم ہو گئی تو یہ تصور قابل عمل نہ رہا۔ اقبال کا خیال یہ ہے کہ عصر حاضر میں مسلمان اپنی تنظیم میں عالمگیر خلافت کے اس تصور سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے، بلکہ بعض صورتوں میں تو یہ تصور آزاد و خود مختار اسلامی ریاستوں کے اتحاد میں حائل رہا، اقبال ایران کی مثال پیش کرتے ہیں کہ جو ہمیشہ ترکی سے الگ رہا محض اس لئے مسئلہ خلافت میں اس کو عقیدتاً ترکوں سے اختلاف تھا۔ (۸)

اقبال ملتِ اسلامیہ کو اپنی سیاسی تاریخ سے بصیرت حاصل کرنے کی دعوت دیتے ہوئے خلافت کے مسئلے پر ترکوں کے طرزِ عمل کی تحسین کرتے ہیں۔ ایسے سیاسی حالات میں اقبال نے عالمِ اسلام کے سیاسی اتحاد کے لئے جس راہِ عمل کی طرف اشارہ کیا، اس کی تہہ میں عالمِ اسلام کی سیاسی صورتِ حال بالعموم اور ترکوں کے سیاسی تجربات بالخصوص کارفرما ہے وہ ترک قوم پرست شاعر ضیاء گوک آلپ پاشا کے خیالات میں بھی ایک تازگی اور توانائی محسوس کرتے ہیں، اپنے خطبے الاجتہاد فی الاسلام، میں بھی انہوں نے ضیاء کی بعض منظومات کا حوالہ بڑے پر جوش انداز میں دیا ہے۔ اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اقبال کو ضیاء کے ہاں اس بین الاقوامی نصب العین کی جھلک نظر آتی ہے۔ جو دراصل اسلام کا منتہائے نظر ہے، مگر جس کو شروع شروع کی عربی شہنشاہیت (دولت امویہ و عباسیہ) نے پس پردہ ہی نہیں، پسِ پشت ڈال رکھا تھا۔ (۹)

اقبال اسی پس منظر میں عالم اسلام کے سیاسی اتحاد کے لیے ایک قابل عمل راہ تجویز کرتے ہیں ''بحالتِ موجودہ تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ امم اسلامیہ میں ہر ایک کو اپنی ذات میں ڈوب جانا چاہیے۔ اپنی ساری توجہ اپنے آپ پر مرتکز کر دیں، حتیٰ کہ ان سب میں اتنی طاقت پیدا ہو جائے کہ باہم مل کر اسلامی جمہوریتوں کی ایک برادری کی شکل اختیار کر لیں۔'' (۱۰)

اقبال کی اس تجویز کا مطالعہ اقبال کے عہد کی سیاسی صورتِ حال کو سامنے رکھ کر کرنا چاہیے۔ اقبال غلام ہندوستان کے فرد تھے جہاں مسلمانوں کو اپنی اجتماعی ہستی کی حفظ و بقا کا مسئلہ درپیش تھا۔ اقبال نے برصغیر کے مسلمانوں کے اجتماعی شعور کی نمائندگی کرتے ہوئے حکومت و طاقت کے نشے میں سرشار انگریزوں، عددی اکثریت کے زعم میں مبتلا مغرور اور جارح ہندوؤں اور بعض نادان نیم سیاسی مسلم تنظیموں کو سیاسی محاذ پر شکست دے کر مسلمانانِ برصغیر کی اجتماعی ہستی کی بقا اور سیاسی زندگی کی آزادی کا اہتمام کیا اقبال کی ان نظریاتی مساعی کا نمونہ آج عالمِ اسلام کے لئے نظریاتی محاذ پر حیاتِ نو کی نوید بن سکتا ہے۔

اقبال کی مذکورہ بالا تجویز بنیادی طور پر سید جمال الدین افغانی کے اتحاد عالمِ اسلامی کے تصور سے متصل معلوم ہوتی ہے۔ اقبال سید جمال الدین افغانی کا ذکر کرتے ہوئے خاصے پر جوش ہو جاتے ہیں۔ ''مولانا سید جمال الدین افغانی کی شخصیت کچھ اور ہی تھی۔ قدرت کے طریقے بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ مذہبی فکر و عمل کے لحاظ سے ہمارے زمانے کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ مسلمان افغانستان میں پیدا ہوتا ہے۔ جمال الدین افغانی دنیائے اسلام کی تمام زبانوں سے واقف تھے۔ ان کی فصاحت و بلاغت میں سحر آفرینی ودیعت تھی۔ ان کی بے چین روح ایک اسلامی ملک سے دوسرے اسلامی ملک کا سفر کرتی رہی اور اس نے ایران اور ترکی کے ممتاز ترین افراد کو متاثر کیا۔ ہمارے زمانے کے جلیل القدر علماء جیسے مفتی محمد عبدہ اور نئی پود کے بعض افراد جو آگے چل کر سیاسی قائد بن گئے، جیسے مصر کے زاغلول پاشا وغیرہ انہیں کے شاگردوں میں سے تھے۔ انہوں نے لکھا بہت کم اور کہا بہت۔ اور اسی طریقے سے ان تمام لوگوں کو جنہیں ان کا قرب حاصل ہوا چھوٹے چھوٹے جمال الدین بنا دیا۔ انہوں نے کبھی نبی یا مجدد ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ پھر بھی ہمارے زمانے کے کسی شخص نے روح اسلام میں اس قدر تڑپ پیدا نہیں کی

کہ جس قدر انہوں نے کی تھی۔ ان کی روح اب بھی دنیائے اسلام میں سرگرمِ عمل ہے اور کوئی نہیں جانتا اس کی انتہا کیا ہوگی'' (۱۱)

سید جمال الدین افغانی کی تحریک اتحاد عالم اسلامی کی اساس یہ تھی کہ جملہ اسلامی ممالک میں جمہوری اور دستوری عناصر کو تقویت پہنچائی جائے۔ سید جمال الدین افغانی کی اقبال کے نزدیک سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ اپنے عہد کے سب سے زیادہ ترقی پسند مسلمان تھے۔ اُن کی اہمیت یہ بھی ہے کہ وہ مسلم ممالک میں ملوکیت، جاگیرداری اور ان دونوں اداروں کے لازمی جھے ملائیت پر ضرب کاری لگاتے ہیں اور نادان مسلمان حکمرانوں کو جمہوری اور دستوری طرز حکومت کی طرف مائل کرتے نظر آتے ہیں۔ سید جمال کا تصور یہ تھا کہ آزاد خود مختار دستوری و جمہوری مسلم ممالک کے نمائندے ایک کانگرس کی شکل اختیار کر سکتے ہیں دراصل سید جمال الدن افغانی کے نزدیک یہ کانگریس ایک مشرقی جمعیت اقوام یا مسلم ممالک کی جمعیت ہو جو مغرب کی سرمایہ دارانہ شہنشاہیت کے اس بڑھتے ہوئے طوفان کے مقابل مسلمانوں کی اجتماعی حفظ و بقاء کا اہتمام کر سکے، اقبال اس حوالے سے خود کو سید جمال کے تصور کے قریب پاتے ہیں۔ اگرچہ اقبال کسی اسلامی سیاسی وفاق یا اسلامی کانگریس وغیرہ کا کوئی نہایت واضح مربوط اور منظم تصور پیش نہیں کرتے۔ لیکن مغرب کے سرمایہ دارانہ استبداد کا مقابلہ اور مسلمانان عالم کو بالخصوص اور اقوام مشرق کو بالعموم اس مقابلے کیلئے تیار کرنے کا عزم ضرور رکھتے ہیں اور اسی عزم کو بنائے اتحاد بنانا چاہتے ہیں۔

صحبتِ اقوام کے بارے میں اقبال کا تصور نہایت واضح اور روشن ہے ضرب کلیم کی ایک معنی خیز نظم ''مکہ اور جنیوا'' میں اقبال کہتے ہیں۔

اِس دور میں اقوام کی صُحبت بھی ہوئی عام　　　پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود　　　اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم!
مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام　　　جمعیّتِ اقوام کہ جمعیّتِ آدم! (۱۲)

اقبال کے نزدیک جمعیّتِ آدم یا ملتِ آدم کی منزل اسلام کا حقیقی مطمحِ نظر اور مسلمانانِ عالم کی جملہ اجتماعی سیاسی مساعی اور جدوجہد کا مقصود ہونا چاہئے۔ اقبال کے نزدیک عالمِ اسلام کا حقیقی اور موثر

اتحاد اگر ظہور پذیر ہوگا تو '' آزاد اور خود مختار وحدتوں کی ایک ایسی کثرت میں جن کی نسلی رقابتوں کو ایک مشترک روحانی نصب العین نے توافق و تطابق سے بدل دیا ہو۔ میں تو کچھ یونہی دیکھ رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ شاید ہم مسلمانوں کو بتدریج سمجھا رہی ہے کہ اسلام نہ تو وطنیت ہے، نہ شہنشاہیت، بلکہ ایک انجمنِ اقوام، جس نے ہمارے خود پیدا کردہ حدود (قومی، وطنی، نسلی، جغرافیائی) اور نسلی امتیازات کو تسلیم کیا ہے تو محض سہولت تعارف کیلئے، اس لئے نہیں کہ اس کے ارکان اپنا اجتماعی مطمح نظر محدود کر لیں۔'' (۱۳)

حوالے رحواشی

۱۔ مضمون: جغرافیائی حدود اور مسلمان، حرف اقبال (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اشاعت اوّل اگست ۱۹۸۹ء) ص ۲۲۲، ۲۲۳

۲۔ نظم: وطنیت، بانگ درا، کلیاتِ اقبال (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، طبع سوم ۱۹۹۶ء)

۳۔ شذراتِ فکر اقبال، محمد اقبال، اردو مترجم: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مرتبہ ڈاکٹر جاوید اقبال (لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع دوم ۱۹۸۳ء) ص ۸۳

۴۔ اقبال نئی تشکیل، عزیز احمد (لاہور، گلوب پبلشرز، ۱۹۶۸ء) ص ۴۲

۵۔ خطبہ الٰہ آباد، حرف اقبال، ص ۲۰

۶۔ جغرافیائی حدود مسلمان، حرف اقبال ص ۲۲۳

۷۔ جغرافیائی حدود مسلمان، حرف اقبال ص ۲۲۳

۸۔ خطبہ: الاجتہاد فی الاسلام، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، محمد اقبال، اردو مترجم سید نذیر نیازی (لاہور: بزم اقبال، طبع دوم ۱۹۸۳ء) ص ۲۴۳، ۲۴۴

۹۔ تشکیل جدید، ص ۲۴۵

۱۰۔ تشکیل جدید، ص ۲۴۶

۱۱۔ پنڈت نہرو کے جواب میں حرف اقبال، ص ۱۲۷

۱۲۔ نظم: مکہ و جنیوا، ضرب کلیم، کلیات اقبال اردو، ص ۵۷، ۵۸

۱۳۔ تشکیل جدید، ص ۲۴۶

ڈاکٹر مزمّل بھٹی

انسانی معاشرہ میں رسم الخط کا ارتقاء

آیئے! ہم پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن اس سلسلے میں ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے عَلَّمَ بِالْقَلَمِ:
سیکھو قلم کے ساتھ۔ قرآن علم ہے اور وسیلہ علم بھی۔ وہ کیسے؟ الرَّحْمٰنُ o عَلَّمَ الْقُرآن o خَلَقَ الْاِنْسَانَ
عَلَّمَهُ الْبَیَان o یعنی بڑے رحم والے رب نے قرآن سکھایا۔ اُسی نے آدم کو پیدا کیا۔ اس کو بولنا سکھایا۔
پھر پہلی وحی۔ اِقْرَاْ۔ "پڑھ" نازل ہوئی اس کی تفصیل دیکھیے۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِی خَلَقَ o خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ o اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ o الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ o عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ o

"پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، انسان کو لوتھڑے سے، تو پڑھتا رہ۔ تیرا رب کرم والا ہے جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا جس نے انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا"

ان آیات کریمہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ زبان اور تحریر کا رشتہ جسم و جاں کا سا ہے۔ ایک کو دوسرے سے جدا کر ہی نہیں سکتے۔ اظہار خیال کے لیے دونوں کا طریقہ کار اگرچہ مختلف ہے لیکن دونوں ایک ساتھ رہ کر ہی انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ متذکرہ بالا آیات مبارکہ کی رو سے زبان اور رسم الخط کا علم خدا کی طرف سے ودیعت ہوا۔ اگر ماہرین تعلیم کو اس پر اعتراض ہو تو اس کا جواب سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۳۱ میں موجود ہے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا   اور اللہ نے آدم کو تمام نام سکھا دیے۔

ایک گواہی اور بھی ہے۔ سورۃ قلم کی پہلی آیت مبارکہ "نٓ" وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ، "ن قسم ہے قلم کی اور اس کی جو کچھ فرشتے لکھتے ہیں۔ آگے ہم سورۃ "الانفطار" کی آیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔
وَاِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ o کِرَامًا کَاتِبِیْنَ o یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ o یقیناً تم پر نگہبان عزت کرنے والے،

لکھنے والے مقرر ہیں۔ جو کچھ تم کرتے ہو وہ جانتے ہیں۔ یہ تمام قرآنی آیات اس بات کی شہادت ہیں کہ قلم کے ذریعے سے کلام الٰہی کی روحانیت قلم کار کی ذات میں منتقل ہوتی ہے اور یہ اس روحانیت کا نور ہے جو قلم کار کی شخصیت کو روشن کر کے معاشرے میں اُسے منفرد بنا دیتا ہے۔ یہ تو تھا میرا یقین بحیثیت مسلمان کہ قلم، علم اور تحریر ساری روایات وہبی ہیں۔ ساری صلاحیتیں خداداد ہیں۔ ہم صرف تربیت و مشق کی معرفت نکھار حاصل کرتے ہیں۔ جو کہ بہت ضروری ہے۔

زبان کی طرح تحریر یا لکھنے کے فن کے بارے میں ماہرین کی رائے کیا ہے۔ اب ہم اسے تاریخی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ رسم الخط مختلف آوازوں کی تحریری علامتوں یعنی حروف ہجا کا ایک نظام ہے۔ لفظ رسم الخط۔ دو عربی الفاظ۔ رسم اور خط کا مجموعہ ہے "رسم" کے معنی ہیں۔ دستور، رواج، قانون یا طور طریقہ اور خط سے مراد لکیر، نشان یا لائن کے ہیں۔ لہٰذا رسم الخط سے مراد کسی قانون یا دستور کے مطابق کھینچی گئی لکیریں یا نشانات ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ حروف کی صوتی شکل یعنی وہ آوازیں جو حروف کو مقررہ نشانات کے ذریعے واضح کریں وہ رسم الخط ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق۔

"رسم الخط سے مراد وہ نقوش و علامات ہیں۔ جنہیں حروف کا نام دیا جاتا ہے۔ اور جن کی مدد سے کسی زبان کی تحریری صورت کا نام رسم الخط ہے۔"

اسی سلسلے میں پروفیسر محمد سجاد مرزا کا خیال ہے کہ

"رسم الخط ایسی علامات ہیں جو انسان کسی مقررہ طریقے کے بموجب اپنے خیالات اور واقعات کے تحفظ اور ان کے اظہار اور ترسیل کے لیے استعمال کرتا ہے۔"

یعنی وہ آوازیں جذبات و خیالات کے اظہار کا ایک طریقہ کار ہے جن کا تعلق ہمارے ہاتھ اور آنکھ سے ہے جن کی معرفت ہمارے احساسات کی ترجمانی ممکن ہے رسم الخط کب، کہاں کیسے ایجاد ہوا۔ اہل مغرب تو یقیناً اپنا ہی کوئی حوالہ ڈھونڈتے ہیں۔ مگر "لوحِ محفوظ" کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ اپالو گیارہ کی کامیابی کے لیے سفرِ معراج اور رفتار براق ہی کی سمت کو اختیار کیا گیا۔ ہم جن آیات قرآنی کا حوالے دے چکے ہیں، کوئی بھی ذی شعور ان حوالوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ کائنات کی ہر چیز نے بتدریج

ترقی کی ہے۔ چنانچہ زبان اور رسم الخط کا ارتقائی عمل بھی ایسے ہی مکمل ہوا۔ ڈاکٹر سلیم اختر اپنے مخصوص انداز میں رسم الخط کی کہانی اساطیری واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اساطیر میں ایسے دیوتا اور دیویاں ملتی ہیں جنہوں نے انسانوں کو لکھنا سکھایا۔ جو میرے خیال میں ایک روایتی وجہ ہے البتہ اس سے آگے کی تحریر قابلِ قبول ہے کہ پرانے زمانے میں تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی چند ایک لوگ پجاری، پروہت، کاہن، بخوبی لکھنا پڑھنا جانتے تھے پھر کچھ شعراُ حکمرانوں تک پہنچ رکھتے تھے۔ جو عام آدمی سے دور تھے۔ لوگوں کیلئے لکھنا ایک حیران کن عمل تھا۔ لہٰذا انہوں نے یہ بات تصور کر لی یہ دیوتاؤں کا کام ہے۔ دراصل اساطیر یونانی لفظ Mythology کا ترجمہ ہے اور Mythos کا مطلب ہے منہ سے ادا کیا گیا۔''

اسی حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے سبطِ حسن نے اپنی کتاب ''ماضی کے مزار'' میں ''لوح و قلم کا معجزہ'' کے عنوان سے کافی تفصیلات دی ہیں۔ انہوں نے اپنے مضمون کا آغاز تیرھویں (۱۳) صدی قبل مسیح کی ایک مصری تحریر سے کیا ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ ''وہ اپنی لوحوں اور نرسل کے قلموں کو اپنی اولاد سے زیادہ چاہتے تھے'' آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ ''تحریر کا فن سب سے پہلے دجلہ و فرات کی وادی ہی میں وضع ہوا'' گو مصریوں اور پھر فنیقیوں نے بھی یہ ہنر جلدی سیکھ لیا تھا لیکن اولیت کا شرف بہرحال قدیم عراقیوں ہی کو حاصل ہے۔ ورقہ کی کھدائی کے دوران ایک ذیکورات دریافت ہوا۔ جس کی اونچائی پینتیس (۳۵) فٹ تھی۔ اس کے ملبے سے کارتوس نما کئی مہریں ملیں جن پر مناظر کے نقوش کندہ ہیں ان میں سے کسی مہر پر قتل کا منظر نقش ہے۔ کسی پر مویشیوں کے ریوڑ، کسی پر شیر کو حملہ آور دکھایا گیا ہے اور ایک مہر پر پروہت کو مذہبی رقص میں محو دکھایا گیا ہے۔ اس ملبے سے مٹی کی تختیاں بھی ملی ہیں جن پر تصویری نقوش کندہ ہیں مثلاً بیل کا سر۔ ایک مرتبان پر بھیڑیں۔ اس کے متعلق خیال ہے کہ یہی انسان کی پہلی تصویری، تحریری کاوش ہے۔

بہرحال رسم الخط، زبان ہی کی طرح ایک سماجی روایت ہے۔ اس روایت کی تمام صورتیں یا

اس کا نظام مشرق میں۔ایران،عراق، کنعان،مصر،لبنان، ہندوستان اور پاکستان میں دستیاب شواہد کی بدولت ہم دیکھ سکتے ہیں۔پروفیسر محمد سلیم کی رائے ہے:

> ''تحریر کی ایجاد بتدریج ہوئی ہے۔انسان نے پہلے تصویروں اور پھر خاکہ نگاری کے ذریعے مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی۔خاکہ نگاری سے بات نقوش تک جا پہنچی۔اس سے مزید ترقی کرکے انسان نے حلق سے نکلنے والی آوازوں کے لیے نقوش مقرر کر لیے۔یہی نقوش حروف ابجد یا حروف الف۔با،کہلائے''

اس سے یہ ظاہر ہوا۔کہ سب سے پہلے کسی خیال کو ایک تصویر سے ظاہر کیا گیا۔لیکن اس سے پہلے بہت معمولی اشارے زبان کا کام کرتے ہوں گے۔آہ۔واہ۔شدتِ جذبات میں تالی بجا کر مسرت کا اظہار، ناک کی لونگ کا اشارہ کرکے عورت کے متعلق کچھ کہنا۔مونچھ کا اشارہ مرد کا حوالہ بنا۔پھول کسی معصوم بچے کی بابت کہنا۔یا خوبصورتی مراد لینا۔یہی وہ رمزیہ علامتیں تھیں جن سے پھر لفظ تراشے گئے۔ مثلاً ستارے (☆) کو''اَن'' کہتے تھے۔لہٰذا ستارے کا نشان آواز''اَن'' کو ظاہر کرنے لگا۔اسی طرح ڈھول کو خبر رسانی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا بہت سے ممالک میں آج بھی اس کا استعمال ہے مثلاً ماہ رمضاں میں سحری کے وقت ڈھول بجا کر جگانے کی رسم آج بھی ہے یا پھر بینڈ یا پریڈ کے دوران''ردم'' ڈھول کی تھاپ سے ہی بنتا ہے روشنی کے لیے جہاں سورج منبع ہے وہ پیغام رسانی یا نئے دن کی علامت بھی ہے،اسی طرح گاڑی کی لائٹس یا ٹریفک کنٹرول کے اشارے اس کی ترقی یافتہ صورتیں ہیں۔

تاریخی اعتبار سے سب سے پہلا رسم الخط''سومیری'' یا''سمیری'' قرار پایا احساس کو ظاہر کرنے کے لیے لکیروں سے گرہیں اور گرہوں سے کچھ تصویریں بناتے بناتے ابلاغ کے لیے پتھر،لکڑی اور ہڈی پر نقش بنائے جانے لگے۔لکڑی کے دندانے ابھار کر یا لکیریں کھینچ کر گنتی کی جاتی تھی۔اس سارے سفر میں قدیم ترین سفر سومیریوں کا ہے۔جسے سومیری رسم الخط کہا جاتا ہے۔سومیری کے بارے میں قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ قوم حضرت نوح کے بیٹے یوناطن کی اولاد تھی (یہ ابنِ سعد کا قول ہے) جبکہ اعجاز راہی کا کہنا ہے کہ یہ قوم بہت پہلے یہاں آباد ہو چکی تھی۔یوسف بخاری کی تحقیق کے مطابق''سمیری خط''

حضرت نوح کے طوفان سے پہلے ایجاد ہو چکا تھا۔یعنی چار ہزار قبل مسیح۔ان کی یہاں موجودگی حقائق سے ثابت ہو چکی ہے۔دیگر اہم کاموں کے علاوہ فنِ تحریر ان کی ایجاد ہے۔حقیقی تعبیرات اور مجازی تعبیرات سے اظہار کیا جاتا تھا۔حقیقی تعبیرات سے مراد کوئی شکل بنا کر اس کا ظاہری مفہوم لینا۔انسان کی تصویر سے انسان اور جانوروں کی تصویر سے جانور کا اظہار ہو۔مجازی تعبیرات میں دور کے معنی پوشیدہ تھے سورج، چاند، ستارے رات کی علامت، کمزور پچکی ہوئی پسلیاں بھوک (جیسا کہ بدھا کے بت) پاؤں میں بیڑیاں دکھا کر غلام کی نشاندہی کرنا۔

سومیری یا سمیری خط کے بارے میں محمد اسحاق صدیقی کی رائے ہے کہ پہلے یہ اوپر سے نیچے کی طرف لکھا جاتا تھا بعد میں ۳۲۰۰ قبل مسیح میں اسے بائیں سے دائیں طرف لکھا جانے لگا۔لیکن اعجاز راہی نے اس بات سے اختلاف کیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ سمیری خط عربی کی طرح دائیں سے بائیں طرف لکھا جاتا تھا۔

رشید اختر ندوی نے صرف اتنا اضافہ کیا کہ سومیری رسم الخط میں تصویروں کے ساتھ ساتھ علامات بھی استعمال کی جاتی تھیں۔گیان چند نے میخی خط کے متعلق لکھا ہے کہ پہلے یہ اوپر سے نیچے اور پھر بائیں سے دائیں طرف لکھنے کا رواج ہوا ان کے مطابق میخی خط کو ہی سومیری خط کہتے ہیں اس کے متعلق بیشتر محققین کی رائے وہی ہے۔جو اسحاق صدیقی کی ہے۔

میخی یا پیکانی رسم الخط

اس خط کا رواج تقریباً ۳۰۰۰ قبل مسیح سے ہوا اور سنِ عیسوی کے آغاز تک رہا۔یہ خط ایران سے لے کر ایشیا کوچک تک مُروّج تھا۔اس کے نشانات کھونٹی، تیر کے پھل اور کیل کی شکل کے ہوتے تھے۔اسی بنا پر اسے میخی یا پیکانی اور مسماری ناموں سے پکارا جاتا تھا۔انگریزی میں اسے کنسیفارم (Cunciform) کہتے ہیں۔جو لاطینی لفظ کیونس "میخ" اور "فارما" (Farma) کی شکل سے ملتا جلتا ہے۔سنِ عیسوی کے بعد آہستہ آہستہ یہ خط اپنی صورت کھو گیا۔لیکن محققین نے دوبارہ اس کی طرف توجہ کی۔مگر خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی یوں خط میخی اجنبیت کا شکار ہو گیا۔آپ جانتے ہیں کہ میخی خط کی ابتدا سمیری قوم سے ہو چکی تھی۔اس میں چھ سو (۶۰۰) مختلف نقوش استعمال کیے جاتے تھے۔

اکادی خط

مورخین کا کہنا ہے کہ عراق کے شمال میں سامی نسل کی قوم اکادی آباد تھی اس قوم نے سمیری نقوش وعلامات کی آوازیں بھی قائم کیں اپنی نئی آوازوں کے لیے نشانات بھی نئے بنا لئے انہی نشانات کو 'اکادی خط' کہا جانے لگا۔

بابلی خط

بابل حکومت کا پہلا بادشاہ حمورابی تھا۔ اس کی حکومت اکادتک قائم تھی۔ اسے بابل کے نام سے پکارا جانے لگا۔ حمورابی سے پہلے بولی اور لکھی جانے والی زبان اور قوم اکادی ہی کہلاتے تھے لیکن بعد میں انہوں نے اپنی شناخت کے لیے اور زبان کے لیے بابلی کا نام اختیار کرلیا۔ رسم الخط کے حوالے سے اس قوم نے یہ جدت پیدا کی کہ پرانے مُروّجہ خطوط ونشانات ترک کرکے ان کی جگہ نئے طرز کے خطوط اپنا لیے۔ لفظ بابل سے مراد خدا کا دروازہ تھا۔

آشوری خط

وادی دجلہ وفرات کا شمالی علاقہ آشوریہ یا اسیر کہلاتا تھا۔ جو شہر کے دیوتا کے نام سے ماخوذ تھا۔ رسم الخط کے ارتقا کا عمل کچھ اس انداز سے جاری تھا کہ خط کا ارتقائی سفر طے کرتے کرتے علامتوں یا نشانات کی تعداد دھیرے دھیرے کم ہو رہی تھی۔ بابلی خط میں چھ سو چالیس (۶۴۰) نشانات تھے اور آشوریہ خط میں یہ تعداد گھٹ کر پانچ سو ستر (۵۷۰) رہ گئی تھی۔ اعجاز راہی نے ''تاریخ خطاطی'' میں لکھا ہے کہ ''آشوری خط'' فنقیی خط سے ماخوذ ہے''۔ یہ بات تاریخی اعتبار سے غلط ہے کیونکہ ''فنقیی خط'' کا زمانہ بہت بعد کا ہے اور فنقیی صوتی تخفیف Acro Phonic Principle کے مطابق خالص حروف استعمال کرتے تھے۔ البتہ سومیری، اکادی، بابلی اور آشوری خط وادی دجلہ وفرات میں مستعمل تھے بلکہ ان خطوط کا استعمال دیگر مقامات پر بھی ملتا ہے مثلاً ترکی کے پرانے شہر قیصریہ سے کھدائی کے دوران پیکانی رسم الخط کی تختیاں ملی ہیں۔ جس کا زمانہ ۲۳۰۰ قبل مسیح ہے۔ یوغاز ترکی کے موجودہ دارالحکومت انقرہ کے

نزدیک ہے اور حیٔ قوم میں سات سوستر ہ (۷۱۷) میخی خط مروج تھا (جو اس وقت وہاں آباد تھی)

اسی طرح تل لامرہ مصر کا ایک پرانا علاقہ ہے یہاں سے ۱۸۸۷ء میں تین سوبیس (۳۲۰) مٹی کی تختیاں ملی ہیں جن پر حکمرانوں کے فرمان اور پیغامات درج ہیں۔

تحقیق کے مطابق راش شاسرہ شام کے علاقہ میں سولھویں صدی قبل مسیح میں خط میخی استعمال ہوتا تھا۔ آرمینیا کے لوگ بھی اس خط کو ذریعہ اظہار بنائے ہوئے تھے۔ البتہ آشوریوں نے اپنی ضروریات کے مطابق اس میں کچھ تبدیلیاں کر رکھی تھیں۔ لیکن ساتویں صدی کے بعد اس رسم الخط کا کوئی کتبہ نہیں تھا۔ کیونکہ آرمینیا میں جب آریا قوم آباد ہو گئی تو یہ خط متروک ہو گیا۔

چھٹی اور چوتھی صدی میں فارس میں پیکانی خط ہی استعمال ہوتا تھا۔ اس کی اہم یادگار بے ستون کتبہ ہے۔ یہ کتبہ ایران میں کرمان شاہ کے نزدیک بے ستون نامی پہاڑی پر کندہ ہے، اس پہاڑی کی نسبت سے اسے بے ستون کا کتبہ کہتے ہیں۔

خلیج فارس کے شمالی علاقے کو ایلم کہتے ہیں۔ جس کا دار الحکومت سوسا یا شوشان تھا۔ یہاں پہلے تصویری خط رائج تھا۔ اسے ترک کر کے نیا میخی خط قبول کر لیا انہوں نے بھی اپنی ضرورت کے پیش نظر اس میں تبدیلیاں کیں۔ بالآخر میخی خط اپنے اختتام کو پہنچا اس کا سبب بابل اور آشوریہ حکومتوں کا زوال تھا، اور دوسری بڑی وجہ حروف کی ایجاد بنی اس خط کی ایک تختی میونخ عجائب گھر میں موجود ہے۔

مصری ہیرو غلیفی خط

ڈاکٹر سلیم اختر نے اس کے متعلق بڑی تفصیل سے لکھا ہے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''مصری اساطیر میں انسانی دھڑ پر IBIS۔ کا سر رکھنے والے دیوتا Thoth نے مصریوں کو ہیرو غلافی سکھائی تھی اس دیوتا کا ایک نام Tehuti تھا۔ عقل اور دانش کا یہ عظیم دیوتا محافظ کتب اور ستاروں کا جاننے والا بھی تھا اور یہ دیوتاؤں کا کاتب بھی تھا...... اس کے ساتھ ساتھ فن تحریر کی دیوی کی حیثیت سے Selaet کا نام بھی لیا جاتا ہے''۔

مصری اساطیر کی قدامت تین ہزار قبل مسیح بتائی جاتی ہے اور مصر میں اس وقت یہ خط رائج تھا۔ مندر، اہراموں اور محلوں میں اہل یونان ان نوشتوں کو "Hiero Glyphika Granmata" کہتے تھے۔ جس کا مطلب ہے ''مقدس تحریر'' انگریزی میں Heiro Glaphic لفظ ہے جو اسی سے نکلا ہے۔ ہیروغلافی خط خوبصورت تھا۔ نیا تھا۔ اس میں تصویریں قوس قزح کی سی کیفیت پیدا کر دیتی تھیں۔ یوسف بخاری کے مطابق ہیروغلیفی خط میں تقریباً سات سو (۷۰۰) تصویریں استعمال کی جاتی تھیں۔ پروفیسر محمد سلیم لکھتے ہیں۔

> ''مصریوں نے رسم الخط کے لیے ایک خاص قسم کا کاغذ ایجاد کیا۔ دریائے نیل کے کنارے پانی کے اندر سرکنڈے کی قسم کا پودا اُگتا ہے۔ مصری زبان میں اس کو ''بردای'' اور یونانی زبان میں اس کو ''پے پرس'' Paypyrus کہتے ہیں۔ کاغذ کے لیے انگریزی لفظ ''پیپر'' اسی سے ماخوذ ہے کاغذ بنانے کا طریقہ یہ تھا کہ سرکنڈے کے اندر سے گودا نکال کر اس کے پتلے پتلے ٹکڑے تراش لیتے تھے۔ ان ٹکڑوں کو اوپر تلے رکھتے تھے درمیان میں گوند وغیرہ لگاتے تھے۔ ان کو پھر بھاری پتھر کے نیچے دبا دیتے تھے اور خشک کر لیتے تھے اس طرح ایک تختہ کاغذ کا بن جاتا تھا پھر ہاتھی دانت سے رگڑ کر اس کی سطح کو صاف اور ملائم بنا لیتے تھے۔ اس پر اپنی تحریریں لکھتے تھے۔''

مصریوں نے تحریر کی طرف خاص توجہ دی۔ کوئلہ پیس کر سیاہی تیار کی اور سرکنڈے کو تراش کر قلم بنایا آوازوں کی تحریری صورتیں وضع کیں اور غیر مرئی تصور جس کی تصویر ممکن نہ ہو سکی اسے کسی رمزیہ تصویر سے ظاہر کر دیا جاتا۔ مثلاً ہوا کی تصویر نہ بن سکی تو ''لہراتا ہوا بادبان'' بنا دیا گیا۔ روح کی تصویر کشی ممکن نہ تھی سفید ''بگلا'' اس کا نشان ٹھہرا۔ یا پھر ''چراغ'' زندگی کی علامت بنا۔ اسی طرح شام کے وقت کو ظاہر کرنے کے لیے آسمان کے عکس پر کنول کا پھول دکھایا جاتا (کیونکہ شام کے وقت یہ پھول بند ہو جاتا ہے۔ گویا دن کا سفر تمام ہوا) اس ساری بحث سے دو باتیں سامنے آئیں کہ یہ خط (مصری) سمیری خط سے ملتا جلتا ہے اور یہ بھی زیادہ تر دائیں سے بائیں طرف لکھا جاتا ہے۔''

ہیراطیقی رسم الخط (Hieratic)

اس کا مطلب ہے مقدس خط شروع میں عمارتوں پر لکھا جاتا تھا۔ پھر کاغذ پر تحریر کیا جانے لگا۔ اس کی صورت واضح نہ تھی۔ لہٰذا مسخ صورت میں لکھا گیا یہ خط ہیراطیقی کہلایا۔ یہ خط تین ہزار سال تک جاری رہا۔ تیسری صدی عیسوی میں ختم ہو گیا۔

دیموطیقی خط (Demotic)

اس کو جموری خط بھی کہتے ہیں۔ اس کے نمونے ساتویں صدی قبل مسیح کے ہیں۔

میرو خط

مصر کے مغرب کی طرف نوبیا کا ملک ہے۔ جس کا دارالحکومت میرو تھا۔ آٹھویں صدی قبل مسیح میں یہاں ایک نئے رسم الخط کا رواج ہوا۔ جسے میرو کی روایت سے میرونی Meroitic کا نام دیا گیا۔ یہ خط ہیروغلفی اور دیموطیقی خط سے ملتا جلتا ہے۔

چینی خط

یہ تصویری خط بھی زندہ ہے۔ اس کے بے شمار نشانات ہیں اعجاز راہی کے مطابق ان نشانات کی تعداد اسی ہزار ۸۰،۰۰۰ ہے لیکن دیگر روایات کے مطابق ان کی تعداد پچاس ہزار تھی۔ وقت کے ساتھ اس تعداد میں کمی واقع ہوتی گئی اور ان کی تعداد پانچ ہزار رہ گئی محمد اسحاق کی تحقیق کے مطابق یہ تعداد ۲۵۰۰ تھی پھر بڑھ گئی، دوسری صدی قبل مسیح میں ۳۰۰۰ا اور پہلی صدی قبل مسیح میں ۹۳۵۳ ہو گئی۔ عہد جدید میں چینی خط ۷۰،۰۰۰ نشانات پر مشتمل ہے۔

غیر مرئی تصورات اور بعض مرئی اشیاء کو بیک وقت دو نشانوں کے امتزاج سے ظاہر کیا جاتا ہے مثلاً غریبی کے لئے۔ چاقو یا روپے کی تصویر بنائی جاتی ہے۔ یعنی غریب وہ ہے جس سے روپے کو علیحدہ کر دیا گیا۔ پھر مختلف معانی والے ہم صورت الفاظ کو بھی مرکب صورت میں ظاہر کیا گیا۔

چینی رسم الخط اوپر سے نیچے کی طرف لکھا جاتا ہے چین میں ایک مدت تک کاغذ کی دریافت نہ

ہوئی۔انہوں نے سترھویں اور بارھویں صدی کے دوران جانوروں کے شانے کی ہڈی، یا کچھوے کے خول پر کتابت شروع کردی ظاہر ہے ایسی صورت میں توازن برقرار نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ہڈیوں پر تحریر کردہ لکھائی کو Bone Script کہا جاتا ہے۔اس کے بعد دھات کی پلیٹوں پر تحریری تجربے کئے گئے۔

لہٰذا مصری، فنیقی، آشوری فنیقی، پیونی، آئبیری لیبیائی، آرامی، یونانی، قدیم عبرانی، صفوی لحیائی ثموری، حبشی خط میں کتابت کے نمونے برآمد ہوئے۔ادھر عرب میں خط کا آغاز اسلام سے صدیوں پہلے ہو چکا تھا۔اور یہ اعزاز نبطی خط کو حاصل ہے۔

جاپانی خط

یہ چینی خط سے اخذ کیا گیا۔دوسو پچاس (۲۵۰) قبل مسیح میں تیسری بدھ کانفرنس ہوئی جس میں بدھ عقیدہ کے لئے ایک نیا منصوبہ تیار کیا گیا۔اشوک نے بدھ مت کی تعلیمات کو عالمی سطح پر متعارف کرانے کا تہیہ کیا۔اس سلسلے کے لئے دوسرے ممالک میں تبلیغ کے لئے لوگوں کو بھیجا گیا۔لہذا چینی مبلغ جب جاپان میں تبلیغ کے لئے گئے تو اپنی زبان بھی ساتھ لے گئے۔پروفیسر چوہدری محمد انور نے ''مطالعہ مذاہب عالم'' میں ایک جگہ لکھا ہے۔اگرچہ اہل جاپان نے اپنی ضرورت کے مطابق چینی نشانات بھی لئے مگر وہ ان کو اپنی زبان کی اصوات میں پکارتے ہیں۔ایسے نشانات کو کانجی (KANJI) کہتے ہیں۔آٹھویں صدی عیسوی کے قریب مزید رسم الخط ایجاد ہوئے'' کاتا کانا'' (KATA KANA) اور'' ہیرا گانا'' (HIRA GANA) Modle Script۔یہ چینی خط شکست سے ماخوذ ہے۔ناول، افسانے اور اخبار اسی رسم الخط میں شائع ہوتے ہیں۔

جزیرہ ایسٹر کا رسم الخط

یہ جزیرہ امریکا کے مغربی ساحل سے تقریباً ۲۵۰۰ میل دور بحرالکاہل کے بیچ واقع ہے۔یہاں کے باشندے سترھویں یا چودھویں صدی میں پالی نیشیا کے جزائر سے ہجرت کر کے آئے ان کا طرز تحریر رونگو کہلاتا تھا اور یہ بھی تصویری خط تھا۔

کریٹ کا خط

یورپ میں یونان کے جنوب میں یہ جزیرہ واقع ہے۔یہاں دو رسم الخط مروّج ہیں۔ایک تصویری، دوسرا ایکری۔تصویری خط یعنی۔Picto Graphic Class

قبرصی کریٹی خط

یہ کریٹ خط سے ماخوذ ہے اور تاریخی شواہد کے مطابق اس کا عرصہ پندرہ سو (۱۵۰۰) قبل مسیح سے گیارہ سو (۱۱۰۰) قبل مسیح تک کا ہے، چھٹی صدی قبل مسیح میں سائپرس میں یہ مروّج تھا۔تیسری صدی قبل مسیح میں یہ ختم ہوگیا اور اس کی جگہ یونانی خط رائج ہوگیا۔

حِتّی رسم الخط

کہتے ہیں کہ تین ہزار قبل مسیح میں یہ قوم ترکی میں آباد تھی۔بعد میں یہ لوگ شام پر قابض ہوگئے۔یہاں دو طرح کا خط مروج تھا۔تصویری اور میخی۔یہ پتھر کی سلوں پر ابھرے ہوئے نقوش کی شکل میں ہوتا تھا۔

جدید خط: یہ بھی پتھر پر کھود کر ابھارا جاتا تھا قدرے گھسیٹ کا انداز لیئے ہوئے تھا۔

بائبلس کا رسم الخط

یہ خط ۲۲۰۰ قبل میں بحیرہ روم کے ساحل پر موجود شمالی حصہ بائبلس میں وجود میں آیا۔اس کے کل (۱۱۴) ایک سو چودہ نشانات تھے۔یہ بحیرہ روم کے ساحل پر شمال میں موجود صفید بائبلس کہلاتا تھا۔

ماقبل سینائی خط (PROTO-SINATIC)

یہ ہیروغلفی خط سے ماخوذ تھا اور کچھ ماہرین و محققین کی رائے ہے کہ سامی حروف سینائی خط سے ماخوذ ہیں۔

اب تک جتنے بھی رسم الخط کا ذکر ہوا ہے ان میں سے تقریباً سارے لفظی رکنی یا رکنی خط تھے۔ لہٰذا قدیم رسم الخط کی ترتیب کچھ اس طرح بنتی ہے سومیری (انہوں نے لکھنے کا فن سب سے پہلے ایجاد کیا لیکن حروف تہجی ایجاد نہ ہو سکے) بابلی، چینی، مصری، فنیقی، (فنیقیوں کے ایجاد کیے ہوئے رسم الخط سے بہت سی زبانیں مستفید ہو رہی ہیں) آشوری فنیقی خط، (جو آٹھویں صدی ق م میں کسی بادشاہ کے نام سے

ایجاد ہوا) یونی رسم الخط، اَبیری رسم الخط، لیبیائی، آرامی، یونانی، عبرانی، خط صفوی، لحیانی خط، ثمودی خط، خط حبشی، ادھر عرب میں بھی مختلف فنون خط کا آغاز قبل از اسلام ہو چکا تھا۔ اس سلسلہ میں خط نبطی کو اولیت کا اعزاز حاصل ہے۔

عربی رسم الخط مختلف ادوار میں مختلف ناموں سے پکارا گیا۔ کیونکہ تاریخی روایات کے ساتھ ساتھ مقامی آمیزش سے اس کی مختلف شکلیں بدلتی رہیں خط حیرہ یا حمیرہ (اسلام کی تبلیغ کوفہ میں ہونے کے بعد) خط کوفی کے نام سے پہچانا گیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عربی رسم الخط دوسری صدی عیسوی میں رائج ہو چکا تھا، اور نبطی خط کی طرح یہ بھی غیر منقوط تھا۔ خط کے ارتقاء کی یہ داستان بڑی طویل ہے۔ ہم اعتماد سے کہہ سکتے ہیں، کہ ۲۰ اپریل ۵۷۱ء جس طرح دیگر حوالوں سے عالم نو کے آغاز کا دن ہے۔ یعنی رسالت مآب ﷺ کی ولادتِ مبارک کا دن ہے اس کے بعد جہالت ختم ہوگئی۔ عہد نبوت ہی میں خط کی کہانی نئے موڑ پر آتی ہے جب زید بن حارث نے پہلے کاتبِ وحی ہونے کا شرف حاصل کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کی حیات مبارکہ ہی میں قرآن محفوظ ہو چکا تھا۔ ورقہ بن نوفل کے مطابق شروع میں ریشمی کپڑے پر تحریر کیا جاتا تھا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ چمڑے کے ورق بنا کر۔ اس کے بعد بکرے یا اونٹ کے شانے کی چوڑی ہڈی پر، پھر پتھر کی تختی یا لکڑی کی تختیاں بنا کر ان پر بھی تحریریں محفوظ کی گئیں۔ کھجور کی جڑ کا ریشہ بھی اس مقصد کے لئے استعمال ہوا۔ ہرن کی جھلی پر لکھا گیا۔ اور پھر وہی بات ذہن میں ابھرتی ہے۔ "علم با لقلم" ۶ جون ۶۳۲ء آپ ﷺ کا وصال ہوگیا۔ مگر آج تک آپ کے علم کی روشنی اور قلم کا سفر جاری وساری ہے جو تا قیامت جاری رہے گا۔ اس میں بہت سی اصلاحات ہوئی ہیں حضرت علیؓ نے عربی کو جدید رنگ میں ڈھالا تو اس کو مزید نکھار حجاج بن یوسف نے عطا کیا۔ محققین کی رائے کے مطابق خط کوفی کے ساتھ ساتھ خط نسخ بھی مروج تھا۔ یہیں سے اہل اسلام کے ذوق مصوری کی آبیاری بھی ہوئی۔

خلافت امیہ کے زوال کے بعد عباسیوں کا دور آتا ہے۔ یہاں خط کوفی کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں خلیل بن احمد نحوی نے رسم الخط۔ اعراب اور منقوط حرفوں کو اصوات

کی روشنی میں حرف اور آواز کو ہم آمیز کیا۔ اس عہد میں بے شمار ماہرین قلم کے نام ملتے ہیں خط گلزار، خط حیَ ، خط غبار، خط قوام، خط ناخن، خط طغرا، یہ اگر چہ مصورانہ قلم کے نام ہیں لیکن ان کی نوک سے بننے والی مختلف صورتوں کے حوالے سے یہ نقش رسم الخط کی مثال بن جاتے ہیں اس کے بعد عربی رسم الخط کے مصری دتر کی انداز بھی ملتے ہیں۔ جو بڑے واضح اور خوبصورت انداز میں لکھے گئے ہیں۔ یہ تحریریں قابل فہم ہیں۔ اسی طرح ایران میں بھی دو طرح کا خط مروج تھا جو پہلوی خط ہی کی دو شاخیں تھیں پہلوک اور پارسک ان خطوط کے لئے ۲۲ نشانات تھے جو اس زبان کی تمام آوازوں کی نمائندگی نہیں کرتے تھے۔ دراصل ان تمام خطوط کی ترقی یافتہ شکل ہی حروف تہجی کی ایجاد ہے حلق سے نکلنے والی آوازوں کو ظاہر کرنے کیلئے مقررہ صوتی نقوش کو حروف ابجد (ABEECDARY) حروف الف ۔ با ۔ یا ALPHABET کہتے ہیں اور تصویری خط کی ارتقائی صورت الف بائی خط ہے۔

پروفیسر محمد سلیم کے مطابق سب سے پہلا الف ،بائی آرامی خط ہے۔

> ''بابل اور مصر کے درمیان جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی کنارے پر ایک شہر کنعان جبرون الخلیل ہے۔ یہاں آرامی نسل کی ایک شاخ آباد تھی، یہ فخر اس نسل کو حاصل ہے کہ تین ہزار قبل مسیح میں اس نے حلق سے نکلنے والی آوازوں کیلئے نقوش متعین کر لیے۔ یہ کل ۲۲ نقوش تھے۔ ابجد، ہوز، حطی، کلمن سعفص، قرشت۔ آرامی خط دنیا کا پہلا باقاعدہ تحریری خط ہے، دنیا کے بیشتر خطوط آرامی سے ماخوذ ہیں۔''
>
> (پروفیسر محمد سلیم۔ تاریخ خط و خطاطین۔ مرتبہ سید عزیز الرحمٰن)

اس بات کے بالکل برعکس اعجاز راہی کی رائے ہے۔ ان کے مطابق فینقی خط پہلا الف بائی خط ہے اور گیان چند کے نزدیک سامی خط پہلا الف بائی خط ہے۔ اس خیال کی تائید محمد اسحاق صدیقی نے بھی کی ہے سید یوسف بخاری نے بھی سامی اور آرامی خط کی مماثلت کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس بات پر تقریباً سبھی محققین متفق ہیں کہ الف بائی خط ۲۰۰۰ ق ۔م ۔ میں سینا، شام اور فلسطین میں رائج تھا۔

حروف تہجی ایکروفونی کے اصول کے تحت ایجاد ہوئے۔ لہٰذا آغاز میں یہ تمام حروف بامعنی تھے۔ مثلاً

تحریری شکل	شامی نام	معانی
ا	الف	سینگ
ب	بیت	گھر
ج	جمل	اونٹ
د	دالت	دروازہ
ہ	ہے	کھڑکی
و	واؤ	کھونٹی
ز	زین	ہتھیار
ح	حیط	جنگلا
ط	طیط	روئی
ی	ید	ہاتھ
ک	کاف	ہتھیلی
ل	لام۔لابو	پھندا
م	ملوک	اُلو
ن	نون	پانی
س	سامک	مچھلی
ف	عین	آنکھ
ع	فے	منہ
ص	صاد	نیزہ
ق	قوف	گدی
ر	ریش	سر
ش	شین	دانت
ت	تاؤ	نشان

دراصل ہر وہ خط جو بحرِ روم کے آس پاس مروج تھا اسے الف بائی خط کا ماخذ قرار دیا گیا فرانسیسی عالم Rouge نے ۱۸۵۷ء میں یہ نظریہ پیش کیا کہ الف بائی خط مصر کے ہراطیقی خط سے ماخوذ ہے۔ جبکہ ظروفی نشانات مصر کے علاوہ بحیرہ روم کے دیگر ممالک کریٹ۔ سائپرس، کیریا، لیکیا اور سپین کے علاقوں میں ظروت پر کندہ نقش فینقی حروف سے ملتے جلتے تھے۔ انہی نقوش کو مدنظر رکھ کر یہ اندازہ کر لیا گیا کہ یہی

حروف تہجی ہیں۔اسی طرح مینگی خط کو بھی الف بائی کا ماخذ قرار دے دیا گیا۔قدیم کنعان سے ملنے والے کتبوں پر کندہ نقوش سینائی اور سامی خط کے مشابہ ہیں۔کریٹ خط تو پڑھا ہی نہیں جا سکا لہٰذا اس کو محض چند نقوش کی مماثلت کی بناء پر دوسرے خطوط سے مشابہ قرار دینا عبث ہے۔مورس یونانؔ کے مطابق حروف تہجی بابلس کے نیم تصویری خط سے ماخوذ ہیں اور ایلن گارڈنر نے سینائی خط میں ۲۲ نشانات سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہی سامی حروف کا ماخذ ہو سکتے ہیں۔ایلن گارڈنر کا یہ نظریہ ایک حد تک قابل توجہ ہے کہ رسم الخط کے ارتقاء کی پہلی منزل تصویری رسم الخط ہی ہے۔اگر انہیں علیحدہ لکھا جائے تو پورے حروف تہجی بنتے ہیں۔

ابجد۔	اب ج د	یعنی مل گیا (آدم گنہگار تھا اس سے گناہ ہوا)
ہوز۔	ہ و ز	اپنی خواہش نفسانی کی پیروی کی
حطی۔	ح ط ی	واقف ہوا (اس کے گناہ اس کی توبہ سے دھو دیے گئے)
کلمن۔	ک ل م ن	کلمہ حق۔توبہ قبول ہوئی (یعنی اسی سے سیکھا)
سعفص۔	س ف ع ص	دنیا اس پر تنگ ہوگئی
قرشت۔	ق ر ش ت	اپنے گناہوں کا اقرار کیا
ثخذ۔	ث خ ذ	خدا نے اسے قوت دی
ضظغ۔	ض ظ غ	شیطان کا جھگڑا ختم ہوا

دراصل فن کی قدر ہی فن اور فن کار کی روح ہوتی ہے جوں جوں نئے تہذیبی وثقافتی مراکز قائم ہوتے گئے فن بھی اپنی نکھری ہوئی صورت میں ترقی کرتا گیا۔ایران میں امیر تیمور کا زمانہ رسم الخط کی ترقی کا زمانہ ہے۔تعلیق خط نجی وعوامی خط تھا اور خط نسخ مذہبی کتب کے لئے مخصوص تھا لیکن قبول اسلام کے بعد یہاں بھی عربی رسم الخط کو پذیرائی ملی۔

اردو رسم الخط کا آغاز وارتقاء

اگر چہ اردو رسم الخط عربی رسم الخط سے ماخوذ ہے لیکن اس کو اپنی موجودہ صورت تک پہنچنے کیلئے بے شمار کٹھن راستوں پہ سفر کرنا پڑا۔کچھ ناقدین و محققین نے اس بات سے اختلاف بھی کیا ہے کہ اردو رسم الخط کا ماخذ عربی ہے۔کیونکہ

۱۔ عربی خط سریانی سے ماخوذ ہے (مذرح بلاذری)

۲۔ عربی خط انبار سے حیرہ (کوفہ) اور پھر وہاں سے مکہ پہنچا۔ (پروفیسر سجاد مرزا)

۳۔ عربی خط کا موجد حرب بن اُمیہ ہے (ممتاز حسین جونپوری)

۴۔ خط عربی خط مسند سے ماخوذ ہے

۵۔ عربی خط جدید سینائی خط سے ماخوذ ہے (گیان چند)

۶۔ عربی خط کا ماخذ عرب عاربہ کا ایک گروہ ہے (ہشام کلبی)

۷۔ عربی خط کے موجد قبیلہ بولان کے تین اشخاص ہیں (ابن عباس)

۸۔ عربی خط کا موجد بنو خالد بن نفر بن کنانہ کا ایک شخص ہے (عمر بن شبہ)

۹۔ خط عربی خط نبطی سے ماخوذ ہے (پروفیسر محمد سلیم)

یہ تمام حوالے محققین کی اپنی اپنی جستجو کا نتیجہ ہیں۔ مگر جدید تحقیق کے مطابق اردو خط کو عربی خط حیرہ اور خط کوفہ سے ماخوذ قرار دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اس کے لئے ہم ڈاکٹر وحید قریشی کی رائے پڑھتے ہیں۔

> ''کوفے کی بنا ۱۷ھ/۶۳۸ء میں پڑی، لیکن خط کوفی کے نمونے قدیم ترین ہیں اور ان کی ابتداء کوفے سے مربوط معلوم نہیں ہوتی۔ آغاز میں اس کا نام کچھ اور ہو گا ۱۰۰۰ء میں ابن ندیم پہلا شخص ہے جس نے اسے خط کوفی کے نام سے یاد کیا ہے اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جب بنی امیہ ۴۱۔۱۳۲ھ/۶۶۵۔۷۴۹ء کے زمانے میں کوفہ مرکزی علمی رتبہ حاصل کر گیا اور بصرے اور کوفے کو شہرت ملی تو اس زمانے میں کوفہ خطاطی کا مرکز بن جانے کے سبب اس اعزاز کا حامل ہوا ہوگا۔''

(ڈاکٹر وحید قریشی۔ خط بہار۔ مجلہ تحقیق جلد۔۱۔ شمارہ ۲، پنجاب یونیورسٹی لاہور)

اعجاز راہی کا کہنا ہے!

> ''خط کوفی شہر کوفہ کی نسبت سے ممتاز ہے'' (از تاریخ خطاطی۔ ص ۷۷)

ان نظریات پر غور کریں تو پہلی بات غلط ہو جاتی ہے کہ عربی خط۔ خط مسند سے ماخوذ ہے کیونکہ

ان کے حروف میں کوئی مماثلت نہیں ہے۔ ہشام کلبی کا خیال ہے کہ عربی خط کی بنیاد عاربہ کے لوگوں نے رکھی جو عدنان بن اُد کے ہاں رہائش پذیر تھے۔ ابجد۔ ہوز۔ حطی کلمن۔ سعفص قرشت یہ سب شانِ مدین سے تعلق رکھتے تھے اور شعیبؑ کے زمانے میں یوم انظلہ میں ہلاک ہو گئے۔

ابن عباس کے مطابق سب سے پہلے قبیلہ بولان کے تین اہم دانشور مرامر بن مرہ نے شکل وصورت، اسلم بن سدرہ نے فصل و وصل اور عاصر بن جدرہ نے نقطوں کو واضح کیا۔ جب کہ مکحول کا خیال ہے کہ عربی رسم الخط ایجاد کرنے والے نفیس، نضر، تیما اور دومہ ہیں۔ ان سب کا تعلق حضرت اسماعیلؑ کی اولاد سے تھا۔ تحقیق کے مطابق یہ سب نظریات ٹھوس محسوس نہیں ہوتے۔ کیونکہ ان سب خطوں سے پہلے بھی عربی خط کا علم ہوا ہے۔ جو مختلف صورتوں میں مروج تھا۔ اس بات کو اگر نبطی خط کے حوالے سے دیکھا جائے تو نبطی قوم حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کی توسیع ہے حضرت اسماعیلؑ کے بیٹے نیابت تھے اور نیا بوط نیابت کے بیٹے تھے انہی کی نسبت سے نبطی قوم کی بنیاد ہے یہ قوم موجودہ اردن کے قریب آباد تھی یونانی اس کو "Petra" اور عربی "بطرا" یا "تدمر" کہتے تھے جوں جوں اس قوم کا پھیلاؤ بڑھتا گیا۔ شمال کی طرف کے علاقہ کو "بطرا" اور جنوب کی طرف کے علاقہ کو "حجر اور مدائن کے نام سے پکارا جانے لگا۔ اس دور میں نبطی خط کو بہت شہرت ملی۔ ڈاکٹر صلاح الدین المنجد لکھتے ہیں۔

> "عربی تحریر کا قدیم ترین کتبہ ام الجمال کا کتبہ ہے۔ جس کا زمانہ تحریر ۲۵۰ء ہے اور آخری کتبہ چھٹی صدی عیسوی کا ہے۔ یہ دونوں کتبے نطبیوں کے علاقے سے دستیاب ہوئے ہیں۔"
>
> (ڈاکٹر صلاح الدین المنجد۔ دراسات فی تاریخ الخط العربی)

اس بحث سے بھی یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ آرامی خط کی دیگر خطوط سے مشابہت کے باعث یہ امکان ہے کہ نبطی خط آرامی سے ماخوذ ہے۔ انہیں مشابہتوں کی بدولت یہ کہا جاتا ہے کہ اردو رسم الخط بھی نبطی سے ماخوذ ہے۔ اصل کیا ہے۔ "پہلی گواہی"۔ قرآن ہی کی زبان ہے۔ تمام حروف تہجی میں ترتیبی مشابہت پائی جاتی ہے مثلاً اب ج د۔ ABCD۔ ک۔ ل۔ م۔ ن۔ K.L.M.N. جوں جوں ترقی ہوتی گئی

حرف کی صورت نکھرنے لگی۔ واضح تر ہوگئی۔ لوگوں نے اپنی زبان کی آوازوں کے مطابق حروف بنا لیے۔ سامی قوم ۲۲ حروف استعمال کرتی تھی لیکن کچھ آوازیں ادائیگی سے محروم تھیں۔ آرامیوں نے مزید چھ حروف ایجاد کر کے یہ مسئلہ حل کر دیا۔ یہ حروف۔ تا۔ خا۔ ذال۔ ظا۔ ض اور غ کی آوازیں تھیں اور یہ حروف۔ ت۔ ح۔ د۔ ص اور ع پر ایک نقطہ لگا کر بنائے گئے تھے۔ انہی کو حروف روادف کہتے ہیں۔ مقام کی نسبت سے عربی رسم الخط کی پہلے بعد میں مدنی کہلایا۔ خط کوفہ تقریباً پچاس مختلف انداز میں لکھا جاتا تھا۔

خطِ نسخ:

یہ خط نہایت متوازن نظر آتا ہے۔ اس میں حروف بالکل سیدھے ہوتے ہیں یہ خط ۳۱۰ھ یا نویں صدی عیسوی میں نبطی خط سے ماخوذ کیا گیا۔ ابن مقلہ اس پر ماہرانہ دسترس رکھتا تھا۔ چوتھی صدی کے آخر تک نسخ نے مکمل طور پر خط کوفی کی جگہ سنبھال لی عام طور پر ابن مقلہ کو اس خط کا موجد قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن خط نسخ اس سے بہت پہلے رواج پا چکا تھا۔ البتہ ابن مقلہ کی وجہ شہرت یہ ہے کہ اس نے نہ صرف اس کے ڈایزئن میں تبدیلیاں کیں اسے مزید خوبصورت بنایا اس کے علاوہ اس نے ثلث، توقیع، رقاع ریحان محقق اور غبار جیسے خطوط ایجاد کیے۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں۔

> ''یعقوب مستعصم / متوفی ۶۹۶ھ) نے نسخ میں ایک خاص حسن بھر دیا جس سے خط نسخ نے ایک خاص حیثیت اختیار کر لی۔''

تعلیق

ڈاکٹر طارق عزیز کے مطابق حسن بن حسین علی فارسی نے خط رقع اور خط توقیع کی آمیزش سے خط تعلیق ڈیزائن کیا۔ لیکن حافظ یوسف سدیدی، یاقوت بن عبداللہ الدومی کو خط تعلیق کا موجد قرار دیتا ہے۔ محمد سجاد مرزا کے مطابق چوتھی صدی ہجری میں اس کا آغاز ہوا۔ اور پروفیسر ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ نے ایم۔ ایس ڈیمنڈ کے حوالے سے تیرھویں صدی عیسوی قرار دیا ہے اور نئی تحقیق کے مطابق اس کے آغاز کا زمانہ پانچویں صدی ہجری بتایا گیا ہے۔ یہ خط عام خط و کتابت اور سرکاری طور پر مراسلت کے لیے استعمال کیا جانے لگا تھا اس بنا پر اسے ''خط ترسیل'' بھی کہتے ہیں۔ خواجہ ابوالعالی نے خط تعلیق میں تبدیلیاں کیں،

فارسی کی مخصوص آوازوں۔پ۔چ۔ژ۔پر پہلے نقطے نہیں ہوتے تھے انہوں نے ان حروف کی صحیح صورت کے لیے ان پر نقطے لگائے اور اسی طرح ''گ'' پر پہلے تین نقطے لگائے جاتے تھے جو جمالیاتی ذوق سے ہم آہنگ نہ ہونے کے باعث ترک کر دیے گئے اور اس کی جگہ دو لکیروں کا استعمال شروع ہوا۔لہٰذا اس خط کی معرفت خطاطی کے متنوع پہلو اجاگر ہوئے۔

خط نستعلیق

آٹھویں صدی ہجری (پندرھویں صدی عیسوی) میں خواجہ میر علی تبریزی نے نستعلیق تعلیق اور نسخ کی آمیزش سے نیا خط ایجاد کیا۔لیکن علامہ ابوالفضل انہیں نستعلیق کا موجد تسلیم نہیں کرتے۔ان کے مطابق پانچویں صدی ہجری میں نستعلیق کے نمونے ملتے تھے لیکن ثبوت کے طور پر کوئی نمونہ یا مثال نہیں دی۔جبکہ دیگر محققین نے میر علی تبریزی ہی کو موجد نستعلیق مانا ہے شروع شروع میں اس خط کو ''نسخ تعلیق'' کے نام سے پکارا گیا۔بعد میں نستعلیق کے نام سے مشہور ہے۔ ''نستعلیق ایک نہایت مہذب اور نفیس لوگوں کا صیغہ تحریر ہے۔'' اس کے بعد ''خط شکستہ'' اور ''خط شفیعہ'' کا ذکر ملتا ہے جو قبول عوام تو نہ ہوئے لیکن فن خطاطی میں اہمیت کے حامل تھے۔

آیئے اب ہم برصغیر ہند کی طرف چلتے ہیں' یہاں بھی بے شمار خطوط کا رواج رہا' ہند قدیم کی تہذیب میں موہنجوداڑو کی تہذیب قدیم ترین ہے۔محمد ادریس صدیقی لکھتے ہیں:

> ''وادی سندھ کے فرزندوں کا بھی اپنا رسم الخط تھا۔اپنی زبان تھی' اور اس میں لکھتے پڑھتے تھے۔افسوس یہ زبان آج چند مہروں اور نشانوں کے علاوہ کہیں محفوظ نہیں ہے۔۔۔ یہ دریافت شدہ تحریریں بہت مختصر ہیں۔چنانچہ سب سے بڑی تحریر سترہ حروف پر مشتمل ہے۔یہ تحریریں تصویری نشانات ہیں۔جن کو آج تک پڑھا نہیں جا سکا۔کیونکہ ہم کو نہ تو ان لوگوں کی زبان معلوم ہے اور نہ ہی ان کا رسم الخط۔''
>
> (اعجاز راہی۔تاریخ خطاطی ' ص ۱۳۰)

لیکن مزید تحقیق کے بعد ڈاکٹر ویڈل کا خیال ہے کہ قدیم سندھی رسم الخط سومیری خط کے بہت

قریب تھا' ڈاکٹر ولنگڈن نے سندھ کے خط کو براہمی کہا ہے۔ ڈاکٹر پران ناتھ' ڈاکٹر ولنگڈن کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں۔ ایک ماہر سکالر گیڈ کے مطابق یہ رسم الخط ایک قدیم ہند آریائی زبان سے ملتا جلتا ہے۔ خاور ہراس نے سندھ رسم الخط کو تامل قرار دیا ہے۔ دراصل آریوں کا سلسلہ آمد صدیوں جاری رہا' زبان و خط ضرورت کے تحت تبدیل ہوتے رہے۔ آٹھویں' نویں صدی ق م میں دجلہ وفرات سے تعلقات کی بنا پر کھروشتی رسم الخط ہندوستان میں آ گیا۔ جس کی مشابہت سنسکرت میں نظر آتی ہے۔ کھروشتی نے براہمی کو متاثر کیا۔ ۲۰۰۰ ق م۔ اسلام کے ہند میں آ جانے تک' سنسکرت اور دیوناگری رسم الخط جاری رہا۔ رفتہ رفتہ مسلمانوں نے عربی رسم الخط سے متعارف کرایا۔ چوتھی صدی کے وسط تک یہاں کے لوگوں میں زندگی کے ہر شعبے میں عربی کے اثرات نمایاں نظر آنے لگے۔ سندھی رسم الخط' عربی رسم الخط میں بدل گیا اور حروف پر نقطے لگا کر عربی ابجد کی آوازوں سے ہم آہنگی پیدا کر لی۔ اس کے بعد سلاطین کی ہند میں آمد سے فقہائے خطاطی کو اپنے اپنے جوہر دکھانے کے مواقع میسر آئے۔ سکندر اعظم' سبکتگین' راجا جے پال' سلطان محمود غزنوی جس کے عہد میں داتا گنج بخش علی ہجویری' اسی دور میں فردوسی کا ''شاہنامہ اسلام'' عربی' سندھی' فارسی آمیز رسم الخط نے ترقی کی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسلام کے آغاز سے لے کر مغلوں کے زوال تک مختلف خطاطی کے نمونے ملتے ہیں۔ یہ دور اس فن کے عروج کا تھا۔ عبدالرحیم خانِ خاناں خط نستعلیق کا ماہر تھا۔ ان کے علاوہ تمکین کابلی' مولانا احمد علی دہلوی' ملا احمد علی مہر کن' مرزا محمد حسین ابن مرزا لشکر خدا' شہزادہ خسرو' محمد افضل لاہوری' مہر محمدی' عماد الملک' مرزا محمود بیگ' حافظ سید امیر الدین' دراصل یہ عہد بارہ صدیوں پر پھیلا ہوا ہے اور فن خطاطی کے بے شمار نمونے اور بالخصوص نستعلیق کے ماہرین بھی بہت زیادہ ہیں۔ اگر ہندوستان میں مصوری و خطاطی کی ہم آمیزی کا جائزہ لیا جائے جو دور بابری سے شروع ہو گیا تھا بہت دور تک جانا پڑے گا کیونکہ عہد تیموری اور اس سے بھی پہلے صفوی عہد میں حروف کی نئی ساختیاتی حیثیت اجاگر ہو چکی تھی۔ لہٰذا سولہویں صدی کے اختتام تک ایرانی اور ہندی اختلاط سے پیدا ہونے والے مصوری و خطاطی کے نئے انداز واضح صورت میں سامنے آئے۔ اس کے بعد ہمیں ملا جمیل' مہر علی' جیسے ماہرین نستعلیق کے نام ملتے ہیں۔

لال قلعہ اجڑنے سے اہل فن کا رجحان لکھنؤ کی طرف بڑھا' اور لکھنؤ کا ایک دبستان سامنے آیا۔
نواب جلال الدین حیدر شجاع الدولہ کے عہد میں منشی چندر بھان دہلوی، منشی تیج بھان' میر عطا حسین' مرزا امام دہروی' شیخ احمد چوہڑ کانی' مولوی سید احمد ایمن آبادی' منشی سیتارام' فتح علی ملتانی' منشی غلام محمد' منشی فضل الٰہی مرغوب رقم' مولوی نور الدین نستعلیق کے ماہر استاد تھے۔

ملتان کی بھی اپنی تاریخ ہے' مفسرین محدثین اور نامور خطاط' علماء اولیاء کرام کا خیال آتے ہی ملتان کا نقشہ ذہن میں ابھرتا ہے۔ منشی غلام حسن اور قاضی عبید نے اس فن کو معیار اعتبار تک پہنچایا۔ اس سارے عہد میں نستعلیق کو بڑا عروج ملا۔

اس تاریخی پس منظر میں ہم دیکھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ نستعلیق ہی اردو رسم الخط کے لئے موزوں قرار پایا۔ اخباری صنعت' کتب' رسائل کی کتابت نستعلیق میں ہی ہونے لگی۔ پاکستان میں اس فن کے ماہرین میں منشی تاج الدین زریں رقم' حافظ محمد یوسف سدیدی' حافظ محمد یوسف دہلوی' عبدالمجید دہلوی' سید امتیاز علی' محمد شریف' محمد اقبال' صوفی خورشید عالم کے نام اپنی اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔ لہٰذا اپنی وضاحت' خوبصورتی کی بنا پر خط نستعلیق ہی اردو رسم الخط کی پہچان بن گیا۔ کتابت کے دور سے نکل کر کمپیوٹر پر بھی ان پیج پروگرام سارے نستعلیق ہی خط کو قبول کیے ہوئے ہیں۔ اور ہمارے لیے یہی قابل فہم اور آسان ہے۔ بہر حال مختلف آوازوں کے ملاپ اور صحیح تلفظ کی املا نستعلیق میں ہی بہتر انداز میں ہو سکتی ہے۔ مخلوط آوازوں پر مشتمل رسم الخط اردو رسم الخط کا حسن اپنی جگہ منفرد و بہترین ہے۔

یہ تو بات تھی مصور' خطاط اور قلم کاروں کے قلم و خط کی۔ میرے خیال میں پہلا مصور وہی ہے۔ جس کے "کن" کہنے پر "فیکون" سب ہو گیا۔ کائنات کی تخلیق پہلی تصویر ہے۔ خالق مصور ٹھہرا۔ اس کا نام "مصور" ہے۔ جمیل بھی ہے۔ حسن و جمال اور تخلیق احساس کا مرقع ذات پاک اللہ ہی ہے۔ اللہ کے جہاں اور بے شمار صفاتی نام ہیں سب سے خوبصورت اکمل و حسین "مصور" ہے' پھر وہ خود فرما رہا ہے علم بالقلم "علم سکھایا قلم سے۔ اگر اس طرف توجہ نہ رہے تو پھر "لوح و قلم" کا کیا تصور ہے؟ صحیفے اور قرآن' تخلیق نہیں۔ تخلیق زبان نہیں۔ تخلیق قلم نہیں۔ لیکن یہ سب کائنات کے بتدریج ارتقا کے نام ہیں۔ قلم اور

رسم الخط کی کہانی یہاں ختم نہیں ہو جاتی ایک حد تک اردو رسم الخط تک کا سفر طے کیا ہے۔ میں اپنی بات پروفیسر پریشان خٹک کے اس جملے پر ختم کرتی ہوں کہ
"کائنات میں خدا کے وجود کے بعد دوسرا درجہ قلم کا ہے۔" (املا و رموز اوقاف کے مسائل۔ مرتبہ اعجاز راہی۔ ص ۱۸۶)

استفادہ

۱۔	القرآن	
۲۔	فن خطاطی	خورشید عالم گوہر قلم
۳۔	اسلامی خطاطی ایک فن	اسلم کمال
۴۔	اسلامی فنون کی داستان	کرسٹین پرائسٹ
۵۔	خطاطی پاکستان (ماضی وحال)	بی۔اے قریشی
۶۔	خطاطی کا فن	سجاد حیدر ملک
۷۔	اسلامی خطاطی مختصر تاریخ	ڈاکٹر عبداللہ چغتائی
۸۔	برصغیر میں اسلامی خطاطی	ڈاکٹر انجم رحمانی
۹۔	اسلامی خطاطی	ڈاکٹر سیف الرحمٰن
۱۰۔	پاک و ہند میں اسلامی خطاطی	ڈاکٹر عبداللہ چغتائی
۱۱۔	تاریخ خطاطی	اعجاز راہی
۱۲۔	اردو رسم الخط	ڈاکٹر طارق عزیز
۱۳۔	اردو رسم الخط	شیما مجید
۱۴۔	ماضی کے مزار	سبط حسن
۱۵۔	اردو زبان کیا ہے	ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر غلام شبیر رانا

ادبی اُسلوب: ایک مطالعہ

تخلیق ادب میں اُسلوب کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ تخلیق فن کے لمحوں میں جب ایک تخلیق کار قلم تھام کر تخلیقی عمل کی جانب مائل ہوتا ہے تو وہ اپنے جذبات، احساسات اور خیالات کو ایک موثر اور دل نشیں انداز میں پیرائیہ اظہار عطا کرتا ہے۔ ہر عہد میں تخلیق کار کا مطمح نظر یہ رہا ہے کہ معاشرتی زندگی کے بارے میں اپنے تجربات اور مشاہدات کو الفاظ کے قالب میں ڈھالتے وقت اپنی داخلی کیفیات کو اس میں سمو دے۔ اس طرح یہ بات قابل فہم ہے کہ تخلیق کار کی شخصیت الفاظ کے ذریعے صفحہ قرطاس پر منتقل ہو جاتی ہے۔ جب تخلیق کار پرورش لوح و قلم کرتے وقت خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر حرف صداقت لکھنا شعار بنالیتا ہے تو اس کی یہ طرز فغاں قاری کو مسحور کر کے اسے وجدانی کیفیات سے آشنا کرتی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلوب کے پس پردہ تخلیق کار کے خیالات اور فکر و نظر کی جولانیاں کارفرما ہوتی ہیں۔

ایک تحقیقی فن پارہ تخلیق کار کی شخصیت کا پرتو لے کر منصہ شہود پر آتا ہے۔ اس ادب پارے کے وسیلے سے قاری تخلیق کار کی زندگی کے نشیب و فراز جان سکتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اسلوب اپنی اصلیت کے اعتبار سے تخلیق کار کے ذہن و ذکاوت اور جذبات و احساسات کو ایک خارجی صورت میں پیش کرتا ہے۔ جو کیفیت تخلیق کار کے دل پر گزر رہی ہوتی ہے، اسلوب اسے سامنے لاتا ہے گویا تخلیق کار کی نفسی اور باطنی کیفیات اسلوب میں جلوہ گر ہو کر قاری کو تخلیق کار کے بارے میں کامل شعور و آگہی سے متمتع کرتی ہیں۔ والٹر پیٹر نے کہا تھا:

"Style is a certain absolute and unique means of expressing a thing in all its intensity and colour."(1)

تخلیق کار جس پیرایہ اظہار کو اپنے تخلیقی عمل کے لئے منتخب کرتا ہے وہ اس کا ذاتی معاملہ ہے اسی کی

---

1. بحوالہ عبداللہ ڈاکٹر سید: اشارات تنقید۔ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۹۳ء صفحہ ۲۶۸

بدولت اس کے اسلوب کا تعین ہوتا ہے۔وہ تمام ذرائع جو ایک تخلیق کار تخلیق فن کے مراحل میں بروئے کار لاتا ہے اسلوب کے امتیازی اوصاف قرار پاتے ہیں۔اس طرح اسلوب کے حوالے سے قاری تخلیق کار کے پیغام اور موضوع کے بارے میں آگہی حاصل کرتا ہے۔یہ اسلوب ہی ہے جو ابلاغ کی کیفیات کا تعین بھی کرتا ہے اور ہر طرح کے سراب سے نکالتا ہے۔

اسلوبیات اپنی اصلیت کے اعتبار سے اسلوب کے سائنٹیفک مطالعہ کا نام ہے۔اسلوبیات کے ذریعے قارئین ادب کو تخلیق کے بارے میں مثبت شعور و آگہی نصیب ہوتی ہے۔ادبی زبان کے عمیق مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ لفظ کا علم فصاحت کہلاتا ہے جب کہ کلام کے علم کو بلاغت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔بیسویں صدی کے آغاز میں سب سے پہلے آئی اے رچرڈز نے اُسلوبیات کی اہمیت کو اجاگر کیا۔۱۹۵۰ء کے بعد اسلوبیات کو اطلاقی لسانیات کی ایک اہم شاخ کی کی حیثیت سے ممتاز مقام حاصل ہوا۔اسلوبیات کی جانب توجہ بڑھنے لگی اور ادب پارے کا مطالعہ مختلف حوالوں سے کیا جانے لگا ان میں صوت اور جملوں کی ترتیب کے علاوہ الفاظ و معانی کے تجزیے کو اہم قرار دیا گیا۔

اسلوب فکر و خیال کا ایسا دلکش اور دلنشیں پیرائیہ اظہار ہے، جو تخلیق کار کی صناعی کے اعجاز سے ایک موثر اور منفرد صورت میں جلوہ گر اپنی اثر آفرینی کا لوہا منوالے۔ایک ادیب اپنے افکار کو اپنے تجربات کے ذریعے اظہار کے ایسے سانچے میں ڈھالتا ہے کہ اس کا یہ حسن بیان اس کی شناخت بن جاتا ہے۔اپنے جذبات واحساسات کو وہ تخیل کی جولانی سے الفاظ کے قالب میں اس طرح ڈھالتا ہے کہ صریر خامہ کو نوائے سروش کا روپ مل جاتا ہے۔یہی انفرادی اسلوب کا امتیازی وصف ہے۔ایک اچھا تخلیق کار اپنے عہد کی تہذیبی و ثقافتی اقدار کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہے۔اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ارفع خیالات کو حسین اور دلنشیں انداز میں پیرائیہ اظہار عطا کیا جائے۔تخلیق کار کی محنت، لگن علم وادب سے والہانہ وابستگی اسے صناعی اور مرصع کاری پر آمادہ کرتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ تخلیق فن کے لمحوں میں خون بن کر رگ سنگ میں اتر جائے۔قوت اظہار اور پیرائیہ بیان کی ندرت وانفرادیت تحریر کو صوری و معنوی حسن سے متمتع کرتی ہے۔

بادی النظر میں یہ بات واضح ہے کہ ادب میں اسلوب سے مراد ایسا انداز نگارش ہے۔جو تخلیق کار

کی شخصیت کا آئینہ ہو۔ اسلوب میں تخلیق کار کی شخصیت کے مختلف پہلو اور انداز فکر الفاظ میں سما جاتے ہیں اور الفاظ جو دھنک رنگ منظر نامہ پیش کرتے ہیں انہیں دیکھ کر قاری ان تمام مراحل سے آگہی حاصل کر لیتا ہے، جن سے تخلیق کار کو تخلیقی عمل کے دوران گزرنا پڑا۔ تخلیق کار کے لیے الفاظ کا انتخاب اور ان کی ترتیب بہت اہم ہے۔ الفاظ کو تحریر کے سلسلے میں وسیع تر امکانات کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ ایک زیرک تخلیق کار جب پرورش لوح وقلم میں مصروف ہوتا ہے تو وہ الفاظ پر ہی انحصار کرتا ہے۔ الفاظ کا انتخاب اس کے ذوق کا مظہر ہوتا ہے۔ اس لیے یہ امر ناگزیر ہے کہ ایسے الفاظ اور تراکیب کا انتخاب کیا جائے جو تخلیق کار کے ذوق اور مزاج کے مطابق ہوں تا کہ وہ اپنے جذبات، احساسات اور خیالات کو صحیح طور پر پیش کرنے میں کامیابی حاصل کر سکے۔ ایک اچھا ادیب الفاظ، پر خلاقانہ دسترس کی بدولت لفظ اور خیال میں ایسا ربط پیدا کر دیتا ہے کہ تخلیق کار کے دل سے نکلنے والی بات الفاظ کی صورت میں قاری کے دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ اگرچہ وہ بال و پر نہیں رکھتی مگر وہ طاقت پرواز بہر حال رکھتی ہے۔ اور اسلوب میں ایسی روح پیدا ہو جاتی ہے جو دلوں کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو کر قاری کو وجدانی کیفیت سے آشنا کرتی ہے۔

کسی تخلیق کار کے اسلوب کا مطالعہ اس کی شخصیت اور ادبی منصب کی تفہیم کیلئے ناگزیر ہے۔ اسلوب کے مطالعہ سے اس کی انفرادی سوچ او ادبی ذوق کے بارے میں آگہی حاصل ہوتی ہے اور اس کی استعداد کار معلوم ہو جاتی ہے۔ اسلوب تخلیقی عمل کے پس پردہ کار فرما عوامل، فکر و خیال اور تجربات و مشاہدات میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ ایک سچا تخلیق کار جذبے اور احساس کو اس طرح مربوط کر دیتا ہے کہ فکر و خیال میں نکھار پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ فنی مہارت اور جمالیاتی ذوق کے ذریعے لسانی، تہذیبی اور ثقافتی میراث کو نئی آب و تاب عطا کرتا ہے۔ اسلوب کے سوتے تخلیق کار کی شخصیت سے پھوٹتے ہیں اور اس میں تخلیقی فعالیت، تخیل کی جولانیاں اور ذہن و ذکاوت کی تابانیاں اپنا رنگ اسی طرح دکھاتی ہیں کہ قطرے میں دجلہ اور جزو میں کل دکھا دیتی ہیں۔ مثلاً احمد ندیم قاسمی کے ہجر و فراق کے موضوع پر یہ اشعار۔

آپ کا حکم ملا ترک محبت کر دی   دل مگر اس پہ وہ تڑپا کہ قیامت کر دی
میں تو سمجھا تھا کہ لوٹ آتے ہیں جانے والے   تو نے جا کر تو جدائی مری قسمت کر دی

تجھ سے کس طرح میں اظہارِ تمنا کرتا　　　لفظ سوجھا تو معانی نے بغاوت کر دی

تخلیق ادب میں حالات و واقعات کا نشیب و فراز بہت اہمیت رکھتا ہے۔لیکن یہ خیال کرنا کہ تخلیق ادب کے لیے کٹھن حالات اور تکلیف دہ ماحول ناگزیر ہے ایک غیر حقیقی اندازِ فکر ہے۔اسلوب کا ان امور سے کوئی تعلق نہیں۔تخلیق ادب کا جاہ و منصب سے بھی کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ادیب کی عظمت اس کے اسلوب کی رہینِ منت ہے نہ کہ منصب کی۔آج کے دور کا المیہ یہ ہے کہ بھانڈ، بھڑوے قسم کے لوگ جاہ و منصب کے لیے دیوانہ وار بھاگتے پھرتے ہیں۔پروفیسر حمید احمد خان کا خیال تھا:

"افسری کے پیچھے دوڑنا اعلیٰ انسانوں کا شیوہ نہیں.....صرف بھوکے کتے سر جھکائے ،دم دبائے، ہڈیوں کی تلاش میں گلیوں کا کوڑا کرکٹ سونگھتے پھرتے ہے۔شاہین کی نظر ہمیشہ بلند ہوتی ہے، وہ بھوکا ہو تو مردار پر نہیں جھکتا۔" (۲)

ایک جری تخلیق کار اپنے اسلوب کے ذریعے جبر کے ایوانوں پر لرزہ طاری کر دیتا ہے۔انسانیت کی توہین، تذلیل اور بے توقیری کرنے والے فرعون، نمرود، ہلاکو خان اور چنگیز خان کے قبیح کردار اور گھناؤنے جرائم کا پردہ فاش کرنا اس کا مطمع نظر بن جاتا ہے۔فرد کی بے چہرگی اور عدم شناخت کے مسئلے نے آج گھمبیر صورت اختیار کر لی ہے۔چربہ ساز، سارق، کفن دزدہ اور حفتی استحصالی عناصر نے شرفاء پر عرصہ حیات تنگ کر دیا ہے۔ان اعصاب شکن حالات میں بھی منفرد اسلوب کے حامل تخلیق کار اپنے حصے کی شمع جلا کر مہیب سناٹوں اور سفاک ظلمتوں میں اپنی انفرادیت کا لوہا منوا رہے ہیں۔انداز کوفی و شامی بدلتے رہتے ہیں مگر مقام شبیری تو حقیقت ابدی ہے۔ایک تخلیق کار قومی کردار کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔وہ جانتا ہے کہ جبر کا ہر انداز مسترد کرنا ضروری ہے۔ظلم پہ لعنت بھیجنا اخلاقی تقاضا ہے۔منافقت اور قحط الرجال کے موجودہ زمانے میں صاحب طرز شاعر اور ادیب جرأت اظہار کو مشعل راہ بناتے ہیں۔بقول تنویر سپرا :

اسے تنویر سپرا کاٹ دو خود اپنے ہاتھوں سے　　　جو ہر چوکھٹ پہ جھک جائے وہ سر اچھا نہیں ہوتا

آزادی تحریر کو ایک صحت مند شخصیت کا مالک تخلیق کار ہی اپنی ادبی فعالیت کی اساس بنا سکتا ہے۔

۲؎ بحوالہ صدیق سالک :سیلوٹ۔مکتبہ اردو ڈائجسٹ لاہور ۱۹۸۰ء صفحہ ۳

ادبی تخلیق میں اسلوب ہی حقیقی معیار ہے۔اسے تخلیقی عمل میں اساس کی حیثیت حاصل ہے۔اسی کے اعجاز سے لسانی عمل کو نمو ملتی ہے اور تخلیقی عمل میں اساس کی حیثیت حاصل ہے اور زبان اس صلاحیت سے ثروت مند ہوتی ہے جس کی بدولت وادی خیال کو مستانہ وار طے کرنا ممکن ہے اور تخلیقی عمل اپنے اظہار کیلئے زبان کو مؤثر انداز میں استعمال کرنے پر قادر ہوتا ہے۔زبان اسلوب کی بدولت ادبی اظہار کو یقینی بنا سکتی ہے۔ادبی اظہار ہی اسلوب کی پہچان ہے۔ایک جاندار اور درخشاں اسلوب کا حامل تخلیق کار کبھی مصلحت اندیشی کا شکار نہیں ہو سکتا۔بقول احمد ندیم قاسمی۔

میں وہ شاعر ہوں جو شاہوں کا ثنا خواں نہ ہوا

یہ ہے وہ جرم، جو مجھ سے کسی عنواں نہ ہوا

☆☆☆

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد

غزل میں ہیئت کے تجربات

۱۹۷۰ء کے بعد ایک طرف تو جدید تر طرزِ احساس اور پیرایۂ اظہار نے غزل کو فکری اور فنی حوالے سے توانائی عطا کی اور اس میں عہدِ رواں کا رنگ رس شامل کر کے اسے نئے امکانات کی بشارت دی؛ دوسری طرف اس عہد میں غزل کی ہیئت کو جامد قرار دے کر نئے ہیئتی تجربات کا ڈول ڈالا گیا۔ ان تجربات کے نتیجے میں آزاد غزل، معریٰ اور نثری غزل جیسے ہیئتی ڈھانچے وجود میں آئے۔ ان نئے ڈھانچوں کی مضحکہ خیزی نے غزل کے تشخص کو مجروح کیا اور اس کی توانا روایت سے بغاوت اور انحراف کے رجحانات کو پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کیا۔ غزل کی شناخت اس کی ہیئت میں ہے یہی وجہ ہے کہ غزل نے ہر دور میں اپنی ہیئت کا دفاع کیا ہے۔ موضوعات، اسالیب، لفظیات اور تکنیک کے تجربات کے لیے اس صنف نے ہمیشہ اپنا دروازہ کھلا رکھا ہے اور اپنے مزاج سے ہم آہنگ عناصر کو ہر دور میں قبول کرتی رہی ہے مگر ہیئت کے لحاظ سے ریختہ کی ابتدائی صورتوں کو چھوڑ کر صرف دو اہم تبدیلیوں کا سراغ ملتا ہے۔ اول مستزاد غزل دوم غیر مردّف غزل۔ یہ دونوں تبدیلیاں غزل کی ہیئت اصلی سے کسی طور متصادم نہیں۔ مستزاد غزلیں بہت کم کہی گئیں اور ان کی حیثیت ایک تجربے سے زیادہ کچھ نہیں البتہ غیر مردّف غزل کا سانچا ہر دور میں مروج رہا ہے اور اس میں اکثر و بیش تر غزل گو شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔ قافیہ اور وزن کی طرح ردیف ہیئت کا لازمی ترکیبی عنصر نہیں ہے اس لیے ردیف کے ہونے یا نہ ہونے سے غزل کی ہیئت متاثر نہیں ہوتی۔ ۱۹۷۰ء کے بعد ہونے والے ہیئتی تجربات میں غزل کے مزاج کو نظر انداز کرتے ہوئے محض جدت یا تبدیلی کے شوق میں نئے نئے سانچوں کو متعارف کرایا گیا۔ ہیئت برائے ہیئت کی غرض سے ہونے والے ان تجربات میں کئی شعرا نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو ضائع کیا اور غزل کے روشن منظر نامے کو دھندلانے کی کوشش کی۔ ذیل میں ان ہیئتی تجربات کا اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کے شاعر مظہر امام نے سب سے پہلے آزاد نظم کے تتبع میں ''آزاد غزل'' کا تجربہ کیا۔ اس تجربے کے آغاز اور اس کے جواز کے متعلق وہ رقم طراز ہیں:

”غزل کی ہیئت میں واقعی انقلابی تجربہ آزاد غزل کی صورت میں ہوا، جو اب تک متنازع فیہ بنا ہوا ہے۔ اگر اپنے ذکر کو بدمذاقی پر محمول نہ کیا جائے تو یہ عرض کروں گا کہ اس تجربے کا پہلا گنہ گار میں ہی ہوں ۔۔۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر آزاد نظم ہی کی طرح آزاد غزل کہی جائے اور مصرعوں میں ارکان کی کمی بیشی روا رکھی جائے تو غیر ضروری الفاظ اور فقروں سے نجات پائی جا سکتی ہے اور خیال کو وسعت بھی بخشی جا سکتی ہے۔ میں نے غزل کے دوسرے لوازمات اور صنفی خصوصیات پر حرف نہیں آنے دیا؛ چوں کہ ارکان کی کمی بیشی سے ہی آزاد نظم کی تشکیل ہوتی تھی، اس لیے مجھے اس کے مقابل ”آزاد غزل“ ہی مناسب نام معلوم ہوا۔“ (۱)

اس تجربے کی ضرورت اور افادیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ تجربہ ۱۹۴۵ء میں کیا گیا مگر اس کے منظرِ عام پر آنے کے لیے ۱۹۶۲ء تک انتظار کھینچنا پڑا۔ یوں پہلی بار آزاد غزل سہ ماہی ”رفتارِ نو“ در بھنگا (انڈیا) کے جنوری ۱۹۶۲ء کے شمارے [سال گرہ نمبر] میں شائع ہوئی۔ آزاد غزل کا یہ پہلا نمونہ ملاحظہ ہو:

ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا آپ ہیں
عشق طوفاں ہے، سفینا آپ ہیں
آرزوؤں کی اندھیری رات میں
میرے خوابوں کے اُفق پر جگمگایا جو ستارا، آپ ہیں
کیوں نگاہوں نے کیا ہے آپ ہی کا انتخاب
کیا زمانے بھر میں یکتا آپ ہیں؟
میری منزل بے نشاں ہے، لیکن اس کا کیا علاج
میری ہی منزل کی جانب جادہ پیما آپ ہیں
ہائے وہ ایفائے وعدہ کی تحیر خیزیاں
ان کی آہٹ پر ہی گھر کا کونا کونا چیخ اٹھا تھا کہ ”اچھا آپ ہیں!“

ہیئت کی مضحکہ خیزی کو اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے تو بھی یہ آزاد غزل فنی اعتبار سے تیسرے یا چوتھے درجے کی غزل کا بھی مقابلہ کرنے سے قاصر ہے۔ ارکان کی کمی بیشی نے صرف ہیئت کو ہی مجروح نہیں کیا بلکہ آہنگ کو بھی متاثر کیا ہے۔ اس آزاد غزل کے ذریعے ''خیال کو جو وسعت'' بخشی گئی ہے وہ بھی اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ مظہر امام کے اس ہیئتی تجربے کی ''کامیابی'' کے بعد ہندوستان میں کرشن موہن، علیم صبا نویدی اور کئی دوسرے شاعروں نے بھی آزاد غزلیں تخلیق کیں۔ علیم صبا نویدی کا ۶۲ آزاد غزلوں پر مشتمل مجموعہ ''ردِ کفر'' کے نام سے ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کی اشاعت سے آزاد غزل کی تخلیق میں تیزی کا رجحان ابھرا اور ہندوستان کے ساتھ ساتھ پاکستان میں بھی یہ ہیئتی پیکر تخلیق کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔

پاکستان میں آزاد غزل کی اولیں جھلک ظفر اقبال کے شعری مجموعے ''رطب و یابس'' میں دکھائی دیتی ہے۔ اس میں شامل واحد آزاد غزل کی توصیف میں انیس ناگی لکھتے ہیں:

> ''ظفر اقبال کا روایتی غزل کے خلاف ردِ عمل اتنا شدید ہے کہ وہ وسیع تر اظہار کی تمنا میں ۔۔۔ غزل کا رسمی قالب توڑ کر آزاد غزل لکھنے لگتا ہے جو پیروڈی بھی ہے اور غزل کے نئے تصور کی نشان دہی بھی کرتی ہے۔'' (۲)

غزل کے ''نئے تصور'' کی حامل اور ''وسیع تر اظہار'' کی خواہش سے سرشار اس آزاد غزل کے تین شعر دیکھئے:

اس مکاں کو اُس مکیں سے ہے شرف
یعنی اک افواہ سی اڑنے لگی ہے ہر طرف

معترض کے منہ سے ہے کتا بندھا
اس لیے سننا پڑے گی عف عف

نظرِ ثانی بھی کریں گے اس غزل پر، اے ظفؔر
فی الحال تو لکھی ہے رف

ظفؔر اقبال نے بعد میں اس ہیئتی پیکر کو استعمال نہ کیا ورنہ جس طرح انہوں نے لسانی توڑ پھوڑ ☆

☆ لسانی توڑ پھوڑ ہی نہیں بلکہ 'انہدام معنویت' بھی جیسا کہ ''نظرِ ثانی'' کو بوزن 'نذرِ ثانی' نظم کیا گیا ہے۔ (ادارہ)

سے غزل کو ضعف پہنچایا ہے اسی طرح ہیئتی حوالے سے بھی غزل مفلوج ہو کر رہ جاتی۔ غزل کو ہیئتی حوالے سے مفلوج کرنے کی سعادت ظفر اقبال کی بجائے معروف ترقی پسند غزل گو فارغ بخاری کو عطا ہوئی۔ انہوں نے ۱۹۷۹ء میں ہیئتی تجربات پر مشتمل مجموعہ ''غزلیہ'' کے نام سے شائع کیا۔ غزل کی مروجہ ہیئت سے ان کی بیزاری کا اندازہ ذیل کے اقتباسات سے لگایا جا سکتا ہے:

۱۔ ''صدیوں کے اس عمل میں فارسی غزل اور اُردو غزل اتنی کثیر تعداد میں کہی گئی ہے کہ اس کے منتخب ارفع واعلیٰ سرمایہ کا وزن بھی منوں ٹنوں کے آخری ہندسوں سے تجاوز کر چکا ہے اور دس صدیوں تک جتنی غزل ہو چکی ہے اگر آئندہ دس صدیوں تک نہ کہی جائے تو کوئی کمی محسوس نہ ہوگی کہ اس کے تمام امکانی مراحل طے ہو چکے ہیں اور سوائے اس کے کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ چبائے ہوئے لقموں کی جگالی کی جائے لفظوں کی شعبدہ بازی دکھائی جائے اور زبان ومحاورے کی بازی گری سے داد وتحسین کے ڈونگرے وصول کیے جائیں یا اسلوب، لہجے اور اظہار کے کاری گرانہ پیرایوں سے پٹے ہوئے موضوعات کو دُہرا دُہرا کر فرضی جدت اور ندرت کے ڈھول بجائے جائیں۔ ان حالات میں ضروری تھا کہ غزل کے ہیئتی ڈھانچے میں کچھ ایسی تبدیلیاں عمل میں لائی جائیں جو اس کی روح کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے احیاء کی ضامن ہوں اور مستقبل میں اس کی نشاۃ الثانیہ کا باعث بن سکیں۔'' (۳)

۲۔ ''غزل پر آج تک جتنے اعتراضات ہوئے ہیں ان میں صرف ایک اعتراض نہایت معقول ہے اور وہ یہ کہ غزل میں بھرتی کے اشعار کی بھرمار ہوتی ہے اور شاعری کے آغاز سے متاخرین کے دور تک تو یہ بھرتی اتنی بے انتہا رہی ہے کہ پوری غزل میں دوربین لگا کر ڈھونڈنے سے بھی کام کا ایک آدھ شعر مشکل ہی سے ملتا ہے۔۔۔۔۔ غزل کی مروجہ ہیئت میں شعر دو مصرعوں کے مجموعے کا نام ہے اور ایک مصرع مفہوم کے اعتبار سے خواہ کتنا ہی مکمل کیوں نہ ہو اسے شعر بنانے کے لئے جا و بے جا دوسرے مصرعے کی گرہ لگانا شاعر کی مجبوری ہے کہ اس کے بغیر شعر نہیں ہو سکتا اور ایک اچھے سے اچھا مصرع بھی اگر شعر نہ بن سکے تو بے مصرف ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر شعراء کے ایسے کئی مصرعے کچھ اس طرح ضرب المثال بن گئے ہیں کہ ان کے دوسرے مصرعے کسی کو دیا نہیں۔'' (۴)

۳۔ ''غزل کے شاعر کی دوسری مجبوری قافیہ اور ردیف کی قیود ہیں غزل کا ایک شعر تو بسا اوقات اس کی جولانی طبع کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن جب تک چند شعر اور نہ کہے جائیں غزل نہیں ہوتی اور جب تک غزل نہ ہو اس ایک شعر کا کوئی مصرف نہیں ہوتا؛ اس لیے شاعر کو جبراً قافیہ ردیف کو نبھانے کے لیے ایسے شعر کہنے پڑتے ہیں جو خود اس کے معیار پر بھی پورے نہیں اترتے۔''(۵)

فارغ بخاری کا شمار اگرچہ جدید غزل کے اچھے شاعروں میں ہوتا ہے مگر ان کا یہ کہنا کہ غزل نے تمام امکانی مراحل طے کر لیے ہیں اور اب اس میں بہ جز ہیئتی تجربوں کے کوئی نئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی، ایک گم راہ کن مفروضہ ہے۔ غزل نے ہر دور کے تقاضوں کے مطابق موضوعات، اسالیب، لفظیات اور اظہار کے دیگر قرینوں کو قبول کر کے ایک زندہ اور متحرک صنف ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ غالبؔ کی غزل موضوعات اور اظہار کے حوالے سے میرؔ کی غزل سے مختلف ہے؛ اسی طرح اقبالؔ، فراقؔ، ناصرؔ اور غزل کے دوسرے رجحان ساز شعرا کے ہاں غزل کا انفرادی زاویہ ابھرتا ہے جو غزل کے متنوع اسالیب کی نشان دہی کرتا ہے۔ جدید تر غزل اپنے موضوعات کے اعتبار سے جدید غزل سے ایک قدم آگے بڑھ آئی ہے۔ اسی طرح جدید غزل کے موضوعات روایتی غزل کے موضوعات سے یکسر مختلف ہیں۔ غزل کی یہ ساری صورتیں اس بات کی شاہد ہیں کہ غزل کی روایت کا کاررواں ایک دریائے سبک رفتار کی طرح رواں دواں ہے جس میں مسلسل نئے ندی نالے شامل ہوتے رہتے ہیں اور اس کی توانائی میں ہر لحظہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ غزل میں حشو و زوائد کی موجودگی فارغ بخاری کے نزدیک ہیئت کی پابندی کے باعث ہے۔ کیا باقی اصناف سخن جیسے نظم، قصیدہ، مرثیہ، رباعی وغیرہ اس عیب سے مکمل طور پر پاک ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے تو محض غزل پر نکتہ چینی کرنا انصاف کے تقاضوں کے منافی ہے۔

فارغ بخاری نے ''تنگ نائے غزل'' کی ''گھٹن'' اور ''پیمانہ بے بسی'' کو ختم کرنے کے لئے ہیئت میں جو تجربے کئے ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ **ایک ہی بحر کے مکمل مصرعوں کی مکمل غزل:** ان ''غزلوں'' میں مختلف مصرعے جمع کر دیے گئے ہیں جو ایک دوسرے سے کوئی ربط نہیں رکھتے۔ شعر غزل کی بنیادی اکائی ہے مگر اس تجربے میں فارغ بخاری نے

مصرع کو بنیادی اکائی کی حیثیت میں پیش کیا ہے۔ کئی ''غزلوں'' میں مصرعوں کی تعداد طاق رکھی گئی ہے۔ ایک ہی بحر کے مکمل مصرعوں کی ''غزل'' کا نمونہ دیکھئے:

زرد پتوں کو بھی ہے تازہ ہواؤں کی طلب
ہر مسافر اک نئی منزل کا راہی ہے یہاں
جانے کب سے ہوں معلق زندگی کی لفٹ میں
اب زمیں کی بات کرنے سے بھی شرماتے ہیں لوگ (غزلیہ۔ ص ۴۰)

۲۔ **مختلف وزن کے مختلف قافیہ ردیف کے مکمل مصرعوں کی غزل:** ان ''غزلوں'' میں بھی شعر کی بجائے مصرع کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ ان ''غزلوں'' میں مختلف اوزان کے مصرعے یک جا کر دیئے گئے ہیں جن میں قافیہ ردیف، وزن اور موضوع کے حوالے سے کوئی ربط اور مطابقت نہیں۔ اس ہیئتی تجربے کا نمونہ دیکھئے:

ہواؤں کے لبوں پر بے ثمر شاخوں کا نوحہ ہے
میں تنہائی کا چہرہ ہوں
لہو اُترا ہوا ہے جاگتی راتوں کی آنکھوں میں
شکستیں کامرانی کا ہمیں مژدہ سناتی ہیں (ایضاً۔ ص ۴۳)

۳۔ **ڈیڑھ مصرع کی مربوط غزل:** اس ہیئتی تجربے میں خیال کی پیش کش کیلئے ڈیڑھ مصرعے کا ہیئتی التزام رکھا گیا ہے۔ یہ ڈیڑھ مصرعی ''غزلیں'' بھی ردیف و قافیہ سے عاری ہیں۔ اس ہیئتی تجربے کی مثال دیکھئے:

لغزشِ پا سے بھی بن جاتے ہیں نقشِ پا کبھی
آدمی قطرہ کبھی، دریا کبھی
کیا یہی تعبیر ہے ان خوش نما خوابوں کی، جو
ہم نے دیکھے تھے کبھی (ایضاً۔ ص ۶۲)

۴۔ **مختلف بحور کے مختلف قافیہ ردیف کے اشعار کی غزل:** یہ ''غزلیں'' مختلف اوزان کے حامل اشعار کا مجموعہ ہیں۔ ان اشعار میں بھی کوئی ہیئتی وحدت موجود نہیں۔ ان اشعار کو فردیات، ابیات اور متفرق اشعار کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس طرز کی ''غزل'' کے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

ہر پھول کے وجود میں عکسِ بہار ہے

ہر تو شگفتہ غنچے سے خوشبو کو پیار ہے

سمندروں پہ جھکے بادلوں کی سرگوشی

ترے ملن کے نشیلے سے میں ڈوب گئی (ایضاً۔ص ۷۵)

۵۔ **ہم وزن مگر مختلف قافیہ ردیف کے اشعار کی غزل:** یہ ہیئتی تجربہ بھی چوتھے ہیئتی تجربے کی طرح متفرق اشعار پر مشتمل ہے۔ اس نوع کی ''غزل'' میں چند ہم وزن اشعار جمع کر دیے گئے ہیں۔ یہ اشعار الگ الگ قافیہ ردیف کے حامل ہیں۔ دو شعر ملاحظہ ہوں:

ہم ہیں ان قافلوں میں شامل جو

منزلیں پا کے لوٹ آئے ہیں

ہے وہ عالم کہ صاف سنتا ہوں

زندہ لمحوں میں ٹوٹنے کی صدا (ایضاً۔ص ۸۸)

''غزلیہ'' کے یہ تمام ہیئتی تجربے غزل کی مروجہ ہیئت سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اس لیے ان کو کسی صورت میں بھی غزل کا نام دینا مناسب نہیں۔ غزل کی شناخت کا دارومدار جن عناصر پر ہے ''غزلیہ'' میں ان عناصر سے مکمل طور پر انحراف کیا گیا ہے۔ فارغ بخاری نے غزل کی مروجہ ہیئت کی جن کم زوریوں کو جواز بنا کر یہ تجربے کیے ہیں وہ کم زوریاں خود ان تجربات میں جابجا موجود ہیں۔ اتنی آزادیوں کے باوجود ''غزلیہ'' میں کئی مصرعے تعقید اور غرابت کا شکار ہوئے ہیں۔ حشو و زوائد کی بھرمار جو فارغ بخاری کے نزدیک غزل کی مروجہ ہیئت کی پابندی کا نتیجہ ہے وہ ''غزلیہ'' کے من پسند ہیئتی ڈھانچوں میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ مثال کے طور پر چند مصرعے دیکھیے:

☆ اونگھتے لمحوں سے یارو، دوستی اچھی نہیں

☆ ازل کے دن سے وہی دل کی خستہ حالی ہے

☆ کتنے ہی اور بھی تو ہنر ہیں، فقط

☆ جب بھی سچائی کے پانے کو کوئی نکلا ہے

☆ مختلف ہیں رنگ یارو اپنے اپنے کرب کے

ان مصرعوں میں بالترتیب یارو، کے دن، بھی تو، فقط، کے اور یارو کے الفاظ کیا حشو وزاوید میں شمار نہیں ہوتے؟ ''غزلیہ'' کے ان شعوری ہیئتی تجربات میں تکلف اور تصنع کی فضا ہر جگہ موجود ہے۔ اکثر و بیش تر اشعار اور مصرعے تغزل اور شعریت کی چاشنی سے تہی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ دو شعر دیکھیے:

ہم پہاڑوں کو پھاند آئے ہیں
تم فصیلوں کی بات کرتے ہو (غزلیہ۔ ص ۹۵)

☆

ملا ناراض ہے کہ کیوں مرغا
اس سے پہلے اذان دیتا ہے (ایضاً۔ ص ۹۵)

فارغ بخاری کے ان تجربات کے بعد معروف شاعر قتیل شفائی نے بھی اسی طرح کا ہیئتی تجربہ کیا۔ ان کی اس نوع کی چار ''تجرباتی غزلیں'' پہلی بار ماہ نامہ 'افکار' کراچی کے اگست ۱۹۸۰ء کے شمارے میں شائع ہوئیں۔ بعد میں یہ ''غزلیں'' دو ''غزلوں'' کے اضافے کے ساتھ ان کے مجموعہ کلام ''آموختہ'' [مطبوعہ ۱۹۸۱ء] میں شامل ہوئیں۔ اس تجربے کے جواز میں قتیل شفائی نے لکھا کہ:

''غزلوں کی ہیئت میں تبدیلی بظاہر محال ہے۔ مگر کیوں نہ اس ضمن میں بھی تجربہ کر لیا جائے ۔۔۔ غزل کی ہیئت میں جو عناصر زیادہ اہم ہیں وہ قافیہ ردیف ہیں کہ انہی سے غزل کو صوت و آہنگ کی دل کشی ملتی ہے۔ ردیف کو نظر انداز بھی کر دیں تو قافیہ بہ ہر حال غزل کی جان رہے گا۔ سو میں نے قافیہ ردیف کو نہیں چھیڑا؛ صرف کبھی مصرع ہائے اولیٰ میں اور کبھی مصرع ہائے ثانی میں چند رکن کم کر دیے ہیں۔ اس طرح نہ تو غزل کی نغمگی مجروح ہوتی ہے اور نہ ہی مؤثر طور پر مضامین باندھنے میں دقت پیش آتی ہے بل کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ غزل کی یہ ہیئت بعض صورتوں میں صوت و آہنگ کے تقاضے زیادہ خوش اسلوبی سے پورے کر سکتی ہے۔'' (۶۱)

قتیل شفائی کی ان ''غزلوں'' میں یہ اہتمام ملتا ہے کہ تمام اشعار کے مصرع ہائے اولیٰ کا وزن مصرع ہائے ثانی کے وزن سے مختلف ہے۔ ردیف وقوافی کی موجودگی نے ان ''غزلوں'' میں نغمگی کی تاثیر کو بکھرنے نہیں دیا تاہم مجموعی طور پر یہ ہیئت بھی غزل کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں۔ تخلیقی سرشاری اور وجدانی کیف سے محروم ان ''غزلوں'' میں تکلف کی فضا ملتی ہے۔ ایک ''غزل'' کے چند شعر دیکھئے:

رات کے رنگ رسیلے کب تھے
مجھ کو حاصل ترے وعدوں کے وسیلے کب تھے
مجھ پہ طاری تھا خود اپنا ہی خمار
میری آنکھوں میں ترے خواب نشیلے کب تھے
اب ہوا سانس بھی لیتی ہے جہاں
اس جگہ پچھلے برس ریت کے ٹیلے کب تھے

☆

۱۹۸۱ء میں کہنہ مشق غزل گو شان الحق حقی کا مجموعہ کلام ''حرف دل رس'' شائع ہوا تو اس میں بھی دو غزلیں ایسی تھیں جو غزل کی مروجہ ہیئت سے بغاوت کے نتیجے میں سامنے آئیں۔ حقی نے انہیں ''غزل نما'' کا نام دیا ہے۔ اپنے مجموعہ مضامین ''نقد ونگارش'' میں وہ اپنے اس تجربے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''غزل نما میں غزل کی لازمی شرط موجود ہے، یعنی وحدت ردیف وقافیہ پر مبنی ہے ،لیکن مصرعوں کے ارکان بڑھا کر اسٹینزا کی شکل دے دی گئی ہے اور ہر یونٹ یا فرد کا مضمون الگ ہے۔'' (۷)

ہیئت غزل کی بنیادی شرط ہے اس میں کسی قسم کا تغیر وتبدل اس کے تشخص کو ختم کر دیتا ہے۔ حقی کی ان ''غزلوں'' میں ردیف وقوافی کی موجودگی کے باوجود غزل کا حسن کہیں دکھائی نہیں دیتا؛ ان کی ظاہری صورت بڑی حد تک آزاد نظم سے مماثل دکھائی دیتی ہے۔ ان کی ''غزل نما'' کا ایک سٹینزا دیکھئے:

شامِ وعدہ کی وہ سرمئی سی فضا
رسمی روشنی

بادلوں میں سے چھنتی ہوئی چاندنی

تیری آمد کے لمحے پگھلتے رہے

شمع جلتی رہی

رات آہستہ آہستہ ڈھلتی رہی

☆

آزاد غزل کے اس رجحان کو فروغ دینے میں کئی رسائل و جرائد نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ پاکستانی ادبی رسائل میں صریر کراچی، اوراق لاہور، دریافت کراچی اور جدید ادب خان پور نے آزاد غزل کے تجربات کو پذیرائی بخشی۔ ۱۹۹۵ء میں محمد اقبال نجمی نے ''پاکستانی آزاد غزل'' کے نام سے ایک مجموعہ مرتب اور شائع کیا۔ اس مجموعے میں قتیل شفائی، ماجد الباقری، سجاد مرزا، محمد اقبال نجمی، قاضی اعجاز محور اور سعید اقبال سعدی کی آزاد غزلیں شامل ہیں۔ ان آزاد غزلوں میں ردیف اور قافیہ کا التزام رکھا گیا ہے مگر وزن کے لحاظ سے مصرعے بڑے چھوٹے ہیں۔ ان ''غزلوں'' کا ظاہری پیکر آزاد نظم سے پوری طرح مشابہت رکھتا ہے البتہ ردیف قافیہ کا التزام اور اشعار کا عدم تسلسل غزل سے مستعار ہے۔ مصرعوں کو یکساں طول سے بچانے کی شعوری کوشش کے باعث ان منظومات پر تصنع کا رنگ غالب ہے۔ مجموعی طور پر یہ ''غزلیں''، نغمگی اور موسیقیت کی تاثیر سے محروم ہیں۔ ان آزاد غزلوں سے دو ایک نمونے بہ طور مشتِ نمونہ از خروارے ملاحظہ کیجیے:

دیکھو ہوا بھی ہے پتوں کی باتیں کوئی کہانی سی اب تک کھنڈر میں ہے

پیڑوں کی آنکھیں ہیں یہ بھی تو کہہ دیں گے پتا شجر میں ہے

دریا بپھرتا ہے

اس دم کدھر جائیں کشتی بھنور میں ہے — ماجد الباقری (پاکستانی آزاد غزل۔ ص ۱۹)

☆

گر ان سے ملاقات کے اوقات بدلتے

حالات بدلتے

ہم نے تو کوئی رات بھی اس شہر میں سو کر نہ گزاری

اے کاش! ہمارے بھی یہ دن رات بدلتے　　　　　　سجاد مرزا (ایضاً۔ص ۳۰)

☆

تیرگی کا سفر

ختم ہوگا کبھی اے مرے ہم سفر

پھیل جائے گی یہ خامشی ہر طرف اپنی بدصورتی کو لیے

یوں ہی بڑھتی رہی اجنبیت اگر　　　　　　محمد اقبال نجمی (ایضاً۔ص ۷۹)

☆

۱۹۹۵ء میں ہی فرحت عباس شاہ کا آزاد غزلوں پر مشتمل مجموعہ ''محبت گم شدہ میری'' شائع ہوا۔ ان ''غزلوں'' میں تمام اشعار ہم وزن ہیں مگر ردیف وقوافی سے عاری ہیں۔ آزاد غزل کے سکہ بند شاعروں نے فرحتؔ کی ان ''غزلوں'' کو آزاد غزل ماننے سے انکار کیا ہے اور انہیں ''معریٰ غزل'' کا نام دیا ہے؛ بعض نے انہیں ''فردیات'' کہا ہے۔ فرحتؔ کی ان تجرباتی غزلوں کا ہیئتی ڈھانچا ذیل کے اشعار سے واضح ہو جائے گا:

تجھے ڈھونڈ لائے گا ایک دن

مجھے اعتماد تھا در در پر

تری جستجو تو ہے جستجو

مرے حوصلے کا سوال ہے

یہی اک دعا ہے کہ اے خدا

مجھے اپنے غم میں شریک کر

☆

آزاد غزل کو رواج دینے کیلئے اس ہیئت کی ضرورت اور افادیت پر رسائل وجرائد میں کئی مضامین بھی لکھے گئے ہیں جو بالعموم آزاد غزل ہی کی طرح معقولیت سے خالی نظر آتے ہیں۔ مضمون نگاروں نے اس ہیئتی ڈھانچے کے اوصاف کچھ اس طرح بیان کیے ہیں کہ بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ مثال کے طور پر آزاد غزل کے سرگرم نقیب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا یہ اقتباس دیکھیے:

''آزاد غزل میں حشو وزوائد کے بغیر معنویت کی نئی سطحیں ابھرتی ہیں اور ذات اور معاشرت منظر در منظر پھیلتی نظر آتی ہے۔ آزاد غزل میں الفاظ کا متوازن اور بامقصد استعمال اس کی دل نوازی بڑھاتا ہے اور ندرت اور بانک پن میں اضافے کرتا ہے، ساتھ ہی آزاد غزل میں الفاظ کو وسیع معانی ومفاہیم کے ساتھ پیشِ نظر رکھا جاتا ہے جس کی وجہ سے جذبہ، قوتِ حیاتیہ (Life Force) بن کر زندگی کی توانائی بن جاتا ہے جو شاعر کے اپنے اظہار کے ہزار ہا پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہے۔۔۔ یہ صنف اس قدر Compact ہے کہ اس کا کوئی بھی لفظ اِدھر اُدھر کرنا مشکل ہے۔'' (۸)

رسائل و جرائد اور مجموعوں کی شکل میں شائع ہونے والی آزاد غزلیں عام طور پر پٹے ہوئے موضوعات کی حامل ہیں۔ تعقید لفظی، شتر گربگی، بے ربطی اور دیگر فنی ناہمواریاں ان میں غزل کی نسبت زیادہ پائی جاتی ہیں۔ اگر آزاد غزلیں مکمل طور پر فنی نقائص سے پاک اور ندرتِ خیال کی مظہر بھی ہوں تب بھی ان کے ہیئتی ڈھانچے کو غزل کی مروجہ ہیئت کی توسیعی صورت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اسی طرح معریٰ غزل اور نثری غزل کے بھی جو نمونے سامنے آئے ہیں؛ ان کی حیثیت بھی غزل کے ساتھ مذاق کی سی ہے۔ ان ہیئتی نمونوں نے جس مضحکہ خیزی کو پروان چڑھایا ہے اس سے غزل کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس لیے ان تمام ہیئتی سانچوں میں لکھی جانے والی منظومات کو کوئی بھی نام دیا جائے انہیں کسی طور پر بھی غزل نہیں کہا جاسکتا۔

حواشی:

(۱) اُردو غزل میں ہیئت کے تجربے (مضمون)؛ مشمولہ: معاصر اُردو غزل؛ اُردو اکادمی؛ ۱۹۹۴ء؛ ص ۴۷، ۴۸، ۵۱۔

(۲) رطب دیابس کا شاعر (دیباچہ)؛ رطب ویابس؛ ظفر اقبال؛ لاہور؛ جنگ پبلشرز؛ ۱۹۹۱ء؛ ص ۱۶۔

(۳) ایضاً۔ ص ۱۲۔

(۵) ایضاً۔ ص ۱۳۔

(۶) (نوٹ)؛ ماہ نامہ ''افکار''؛ کراچی؛ اگست ۱۹۸۰ء۔

(۷) نقد ونگارش؛ کراچی؛ مکتبہ اسلوب؛ اول، ۱۹۸۵ء؛ ص ۲۴۰۔

(۸) آزاد غزل کا لسانیاتی عمل (مضمون)؛ ماہنامہ 'اوراق' (خاص نمبر)؛ لاہور؛ جون، جولائی ۱۹۸۹ء؛ ص ۲۵۰۔

محمد شفیع عارف دہلوی

حضرت اُویس قرنیؓ

حضور کریم ﷺ مسجد نبوی میں شریف فرما تھے قریب ہی سیدنا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور دیگر صحابہؓ کرام شمع رسالتؐ کے گرد ایک حلقہ کی شکل میں تسبیح کے دانوں کی طرح ایک دوسرے سے جڑے بیٹھے تھے۔

آپؐ نے اس جماعت قدسی کی طرف اک نگاہ التفات ڈالی اور بارگاہ رب العزت میں سجدۂ شکر ادا کیا۔ اس لئے کہ ایک وقت وہ تھا جب آپ بالکل یک و تنہا تھے۔ انتہائی بے سرو سامانی کا عالم تھا، کوئی مونس و غم خوار، کوئی یار و مددگار نہ تھا، سوائے اس خالق حقیقی کے جس کے حکم پر آپ نے دعوت حق کا پیغام دیا۔ اس کے بعد کونسا ظلم تھا جو کفار قریش نے آپ یا آپ کے ان نیک سیرت افراد پر جنہوں نے دعوت حق کے نتیجہ میں اسلام قبول کیا روا نہیں رکھا۔ مگر آج اس تمام جبر و تشدد اور ظلم و استبداد کے باوجود اعلائے کلمۃ الحق کے یہ دیوانے سکون قلب کے ساتھ دشمنان اسلام کی مزاحمتوں سے بے نیاز ہو کر مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے۔

ایک طرف سرکار دو عالمؐ کے دل میں یہ خیالات موجزن تھے تو دوسری طرف ان پرستاران توحید کا یہ عالم تھا کہ اگر سروں میں سودائے حق جاں گزیں تھا تو دلوں میں نور ایمانی کی شمع فروزاں تھی۔ فضا پر ایک روح پرور کیف اور سکوت طاری تھا۔ کسی کی کیا مجال کہ بے محل اور بے ضرورت ایک لفظ بھی زبان سے ادا کر سکے۔ اس لئے کہ "ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں"۔ نظریں وفور شوق میں حضور انور کے رخ تاباں پر پڑتیں تو شمع رسالت کے ان دیوانوں کے دلوں میں شگفتگی و شادابی کی جنتیں کھل کھلا کر ہنسنے لگتیں۔ ہر دل کی آرزو تھی کہ سرکار دو عالمؐ سے نظریں چار ہوں اور جنت ارضی و سماوی کے ایمان افروز نظارے نہاں خانۂ دل میں اُتر جائیں۔ مگر نظر کو تاب نظارہ نہ تھی۔ نظر خیرہ ہو جاتی۔ پیش قدمی کا یارا نہ رہتا۔ فرط شوق میں واری ہوتی اور دبے پاؤں بصد تکریم و احترام واپس آ جاتی ہے۔ مگر قلب کی ہر حرکت

صرف نیاز اور نگاہ دیدہ ور کی ہر جنبش وقفِ سجود ہو جاتی ہے۔

چشمِ مشتاق اگر ایک طرف شوقِ دیدار کی آرزو مند تھی تو دوسری طرف گوشِ شوق آشنا متوجہ بر آواز تھے کہ کب محسنِ انسانیتؐ کے لبِ گوہر بار سے کوئی کلمۂ جانفزا اور کوئی جملہ دلنواز ادا ہو اور کب یہ پرستارانِ توحید اور عاشقانِ رسول اس لولوئے آبدار کو دامنِ دل میں سمیٹ کر دین و دنیا کی سرخروئی حاصل کریں، سکوت دلنواز کا یہ عالم بالخیر ختم ہوا اور رحمۃ اللعالمینؐ کے لبِ گوہر بار سے ایک سحر آفریں صدا فردوس گوش ہوئی۔ اور آپؐ نے فرمایا "جب میں اپنا چہرہ 'یمن' کی جانب کرتا ہوں تو اس طرف سے مجھے محبت کی بُو آتی ہے"، صحابہ کرام نے دریافت کیا یارسول اللہ! اس کی کیا وجہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا "یمن میں اللہ کا ایک ایسا پیارا اور محبوب بندہ رہتا ہے جو مجھ سے بے حد محبت کرتا ہے۔ اس کے بعد حضورِ انورؐ نے فرمایا "میری امت میں یہ ایسی برگزیدہ ہستی ہے جو قیامت کے دن قبیلہ ربیعہ اور مصر کی لاتعداد بھیڑوں کے بالوں کے برابر لوگوں کی شفاعت کرائے گا۔ صحابۂ کرامؓ نے جب یہ الفاظ سرکارِ دو عالمؐ کی زبان مبارک سے سنے تو ذہنوں میں ایک تجسس پیدا ہوا اور عرض کیا "اے اللہ کے رسولؐ وہ کون شخصیت ہے جو اس عظیم مرتبہ پر فائز ہے۔ آپؐ نے فرمایا "ہے اللہ کا ایک نیک بندہ" جب صحابۂ کرام نے اس عظیم المرتبت ہستی کا نام معلوم کرنے پر اصرار کیا تو آپؐ نے فرمایا "وہ شخص اویس قرنیؓ ہے جس کا تعلق یمن کے ایک مشہور قبیلہ سے ہے۔"

پھر حضور کریم ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن پروردگارِ عالم اویسؓ کی شکل کے ستر ہزار فرشتے پیدا فرمائیں گے تاکہ اویسؓ ان فرشتوں کے ہجوم بیکراں۔۔ میں جنت میں داخل ہوں اور لوگ انہیں پہچان نہ سکیں کیونکہ وہ اپنی زندگی میں دنیا والوں کی نظروں سے چھپ کر عبادت الٰہی کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس محبوب بندہ کو قیامت کے دن جب ساری مخلوق جمع ہوگی تو نظرِ اغیار سے محفوظ رکھے گا۔

صحابہ کرام جو عالمِ تحیر میں غوطہ زن تھے پھر گویا ہوئے یارسول اللہ! کیا یہ بزرگ کبھی یہاں آپ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اس شخص نے چشمِ ظاہر سے مجھے نہیں

دیکھا مگر اس کی چشم باطن مجھ پر ہی مرکوز رہی ہے۔" جب صحابہ کرام نے تعجب کا اظہار کیا تو آپؐ نے فرمایا: "اویسؓ کے یہاں نہ آنے کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو غلبۂ حال اور دوسری اتباع شریعت۔ غلبہ حال سے مراد یہ ہے کہ ان پر اکثر غیر شعوری کیفیات طاری رہتی ہیں اور اتباع شریعت کی صورت یہ ہے کہ ان کی والدہ بہت ضعیف اور بصارت سے محروم ہیں۔ وہ ان کیلئے شتربانی کرتے ہیں۔ اگر وہ صبح کو یمن سے یہاں کیلئے روانہ ہوں تو اپنی والدہ کی خبر گیری کیلئے رات گئے تک بھی واپس گھر نہیں پہنچ سکتے"۔ جب صحابہ کرامؓ نے حضرت اویس قرنی سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو آپ ﷺ نے فرمایا "کہ صرف حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ ان سے ملاقات کر سکیں گے۔ ان کی پہچان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں گلیمی لباس عطا فرمایا ہے یعنی ان کے جسم پر بہت زیادہ بال ہیں اور ہاتھ ہتھیلی اور بائیں پہلو پر درہم کے برابر ایک سفید داغ بھی ہے مگر وہ برص کا داغ نہیں ہے۔ جب تم دونوں ان سے ملو تو میرا اسلام کہنا اور کہنا کہ میری امت کیلئے دعا کریں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے دریافت کیا وہ ہمیں کہاں ملیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا "یمن میں شتربانی کرتے ہوئے۔

تذکرۃ الاولیا میں شیخ فریدالدین عطارؒ نے تحریر کیا ہے کہ جب حضرت عمر فاروقؓ اپنے دور خلافت میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہمراہ کوفہ پہنچے اور اہل یمن سے ان کا پتہ معلوم کیا تو کسی نے کہا "میں ان سے پوری طرح تو واقف نہیں البتہ ایک دیوانہ آبادی سے دور عرفہ کی وادی میں اونٹ چرایا کرتا ہے اور خشک روٹی اس کی غذا ہے۔ لوگوں کو ہنستا ہوا دیکھ کر خود روتا ہے اور روتے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر خود ہنستا ہے۔ مگر وہ بے نام اور بے حیثیت ہے۔ وہ رتبہ نہیں رکھتا کہ امیر المومنین اس کی تلاش میں خود تشریف لائیں اور اس کے متعلق دریافت کریں۔" چنانچہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ حضرت اویسؓ نماز میں مشغول ہیں اور ان کے چاروں طرف اونٹ چر رہے ہیں۔ فراغتِ نماز کے بعد جب ان کا نام دریافت کیا تو جواب دیا "عبداللہ" یعنی اللہ کا بندہ۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "آپ اپنا اصلی نام بتائیے" جواب ملا "اویس" پھر حضرت عمرؓ نے فرمایا "اپنا ہاتھ دکھائیے"۔ انہوں نے جب ہاتھ دکھایا تو حضور اکرم ﷺ کی بیان کردہ علامت کو دیکھ کر حضرت عمرؓ نے دست بوسی کی اور سرکار دو عالم ﷺ کا خرقۂ

مبارک پیش کرتے ہوئے سلام پہنچا کر امت محمدی کے حق میں دعا کرنے کا پیغام بھی دیا۔ یہ سن کر اویس قرنیؓ نے عرض کیا کہ "آپ خوب اچھی طرح دیکھ بھال فرمالیں شاید وہ کوئی دوسرا فرد ہو جس کے متعلق حضور کریم ﷺ نے نشاندہی فرمائی ہو۔" حضرت عمرؓ نے کہا "جن علامات کی آنحضرت ﷺ نے نشاندہی فرمائی تھی وہ سب آپ میں موجود ہیں۔" یہ سن کر اویس قرنیؓ نے فرمایا: "اے عمرؓ تمہاری دعا مجھ سے زیادہ کارگر ثابت ہو سکتی ہے۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "آپ کو رسول اللہ ﷺ کی وصیت پوری کرنی چاہئے۔ چنانچہ حضرت اویسؓ نے آنحضرت ﷺ کی عنایت کردہ خرقہ مبارک کچھ فاصلہ پر لے جا کر اللہ رب العزت سے دعا کی کہ "یارب جب تک تو میری سفارش پر امت محمدیہ کی مغفرت نہیں کرے گا میں تیرے رسول آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کا عطا کردہ لباس ہرگز نہیں پہنوں گا کیونکہ تیرے نبی ﷺ نے اپنی امت کو میرے حوالے کیا ہے۔"

حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ حضرت اویس قرنیؓ کے لباس کے پیچھے ہزاروں عالم پوشیدہ تھے یہ دیکھ کر آپؓ کے قلب میں خلافت سے دستبرداری کی خواہش بیدار ہوئی اور فرمایا کہ "کیا کوئی ایسا شخص ہے جو روٹی کے ایک ٹکڑے کے بالعوض مجھ سے میری خلافت خرید لے۔"

یہ سن کر اویس قرنیؓ نے کہا "کوئی بیوقوف شخص ہی خرید سکتا ہے۔ آپ کو فروخت کرنے کے بجائے اٹھا کر پھینک دینا چاہئے" پھر جس کا جی چاہے آگے بڑھ کر اس کو اٹھالے یہ کہہ کر آپؓ نے حضور اکرم ﷺ کا لباس زیب تن کر لیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کاملہ سے میری درخواست پر بنو ربیعہ اور بنو مصر کی بھیڑوں کے بالوں کے مساوی تعداد میں لوگوں کی مغفرت فرمادی۔۔۔ جب حضرت عمرؓ نے آپؓ سے حضور اکرم ﷺ کی زیارت نہ کرنے کے متعلق سوال کی تو آپ نے ان سے پوچھا "اگر آپؓ دیدار نبی ﷺ سے مشرف ہوئے ہیں تو بتایئے کہ حضور اکرم ﷺ کی بھنویں کشادہ تھیں یا گھنی؟" لیکن دونوں صحابہ جواب دینے سے معذور رہے۔

حضرت اویسؓ نے کہا کہ اگر آپ احباب نبی ﷺ میں سے ہیں تو یہ بتایئے کہ جنگ احد میں حضور کریم ﷺ کا کونسا دندان مبارک شہید ہوا تھا؟ اور آپؓ نے اتباع نبوی ﷺ میں اپنا وہ دانت کیوں

نہیں توڑ ڈالا۔ یہ کہہ کر حضرت اویس قرنیؓ نے اپنے تمام ٹوٹے ہوئے دانت دکھا کر کہا "جب حضور پاک ﷺ کا دانت مبارک شہید ہوا تو میں نے اپنا ایک دانت توڑ ڈالا۔ پھر خیال آیا کہ شاید کوئی دوسرا دانت شہید ہوا ہو۔ اسی طرح ایک ایک کر کے جب تمام دانت توڑ ڈالے اس وقت مجھے سکون نصیب ہوا۔۔۔ یہ دیکھ کر دونوں صحابہ پر رقت طاری ہوگئی۔ واقعی یہ ہے مقام عشق اور پاسِ ادب کا حق۔

جب حضرت عمرؓ نے اپنے لئے دعا کی درخواست کی تو آپؓ نے کہا "اگر تم ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوئے تو تمہیں سرخروئی حاصل ہوگی ورنہ میری دعا بے سود ہو کر رہ جائے گی۔۔۔ حضرت عمرؓ نے جب وصیت کرنے کے لئے فرمایا تو آپؓ نے کہا اے عمر! کیا وصیت کروں۔ میرے آگے تو خود موت کی۔ قبر کی اور پھر حشر کی پرخطر گھاٹی ہے۔ ان گھاٹیوں کو وہی شخص پا سکتا ہے جس کا بوجھ ہلکا ہو۔ احتساب کے خوف نے زندگی کی ہر خوشی مجھ سے چھین لی ہے۔ وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہے۔ صبح ہوتی ہے تو شام کی امید نہیں رکھتا اور شام ہوتی ہے صبح کی توقع نہیں رکھتا۔ حق گوئی نے دوستوں کو جدا کر دیا۔ امر با المعروف اور نہی عن المنکر نے ناپسندیدہ شخصیت بنا دیا ہے۔ شتر بانی سے چار درہم یومیہ مل جاتے ہیں۔ میری گذر بسر دو درہم میں ہو جاتی ہے باقی دو درہم کسی ضرورت مند کو دیدیتا ہوں۔ آنے والی کل کیلئے کچھ نہیں چھوڑتا۔ معلوم نہیں حقوق اللہ اور توکل کا یہ فعل حق تعالیٰ کے معیار پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔ یہ کلام سن کر حضرت عمرؓ نے اپنا درّہ زمین پر مارا اور چلا کر کہا "کاش عمر کی ماں عمر کو نہ جنتی" اس کے بعد دونوں صحابہ کرامؓ رخصت ہوئے اور حضرت اویس قرنیؓ یادِ الٰہی میں مشغول ہو گئے۔

ابن زید فرماتے ہیں کہ حضرت اویسؓ کی عبادت غیر معمولی تھی۔ کبھی کہتے یہ سجدہ کی رات ہے اور تمام شب سجدہ میں گذار دیتے۔۔۔ کبھی کہتے کہ یہ رکوع کی رات ہے اور تمام رات رکوع میں رہتے کیونکہ وہ چھپ کر عبادت کرتے تھے اس لئے لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے اور اہل یمن ان کے روحانی مراتب سے ناواقف تھے لیکن جب خلیفہ وقت حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ جیسی عظیم شخصیات ان کی تلاش میں مکہ مکرمہ سے چل کر یمن تشریف لائیں اور ان سے ملاقات کی تو حضرت اویس قرنیؓ لوگوں کی نظروں میں آگئے اور جگہ جگہ ان کی بزرگی اور عظمت کے چرچے ہونے لگے۔ یہ بات

ان کے مسلک کے خلاف تھی لہٰذا انہوں نے اس ماحول سے گھبرا کر خاموشی سے نقل مکانی کی اور کوفہ میں سکونت اختیار کر لی۔

ابن سعد بن جابر کا بیان ہے کہ حضرت اویس قرنیؒ کے پاس شام کو جو کچھ بچتا سب خیرات کر دیتے۔ یہاں تک کہ سوال کرنے والے کو اپنا لباس تک دیدیتے۔ ستر پوشی کے اہتمام کے ساتھ گلیمی لباس پر اکتفا فرماتے اور پھر کہتے اے رب العزت! اگر اب بھی کوئی بھوکا اور برہنہ رہ جائے تو میرا مواخذہ نہ فرمائیو۔ اس گلیمی لباس میں اگر نادان اور شریر بچے ان کا تمسخر کرتے اور پتھر برساتے تو کہتے! چھوٹے چھوٹے پتھر مارو تا کہ خون نہ بہے اور میرا وضو ساقط نہ ہو۔

ہرم بن حیان بیان کرتے ہیں کہ مجھے حضرت اویس قرنیؒ سے ملاقات کا بڑا اشتیاق تھا۔ یہ اشتیاق اور شوق فراواں کھینچ کر مجھے کوفہ تک لے گیا۔ جب تلاش کرتے کرتے میں دریائے فرات کے کنارے پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ کپڑے دھو رہے ہیں۔ میں نے ظاہری علامات سے پہچان لیا۔ چہرہ کا رنگ گندمی، جسم پر گھنے بال اور بارعب صورت۔ میں نے سلام کیا اور وفور شوق میں مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھایا۔ انہوں نے ہاتھ نہیں ملایا۔ ان کا حال زار دیکھ کر مجھے رونا آ گیا اور کہا اے اویسؓ! تمہارا کیا حال ہے؟ کہا اے ہرم! تمہیں میرا نام کس نے بتایا۔ میں نے کہا ''اللہ تعالیٰ نے اور آپؓ نے مجھے کیسے پہچان لیا کیونکہ یہ میری پہلی ملاقات ہے۔'' حضرت اویسؒ نے فرمایا ''میری روح نے تمہاری روح کو پہچان لیا اور میری جان تمہاری جان سے ہمکلام ہوئی۔ عالم ارواح میں مومنین کی روحیں ایک دوسرے سے مل چکی ہوتی ہیں چنانچہ مادی دنیا میں بھی مومنین روح کے ذریعے ایک دوسرے سے واقف ہوتے ہیں۔'' پھر میں نے عرض کیا کہ ''نبی کریم ﷺ کی کوئی حدیث روایت کیجئے تا کہ میں اس کو یاد رکھوں اور بہرہ ور ہوتا رہوں۔ حضرت اویس قرنیؒ نے فرمایا ''میں محدث نہیں۔ مجھے میرے روحانی مشاغل کافی ہیں۔''

ہرم بن حیان کہتے ہیں پھر میں نے عرض کیا ''تو پھر کتاب اللہ کی کوئی آیت ہی سنایئے اور کچھ نصیحت کیجئے'' حضرت اویس قرنیؒ نے فرط جوش میں میرا ہاتھ پکڑ لیا اور فرات کے قریب لے گئے۔ پھر فرمایا کہ ''میرے رب کا قول ہے اور اس کا قول حق ہے۔ میرے رب کی حدیث ہے اور اس کی حدیث سچ

ہے۔ میرے رب کا کلام ہے اور اس کا کلام افضل ہے۔ "ان یوم الفصل میقاتیم اجمعین" یعنی یقیناً فیصلے کا دن مقرر ہے سب کے لئے اور یہ کہہ کر اس قدر روئے کہ مجھ کو گمان ہوا کہ شاید اب ان کی جان تن سے نکل جائے گی۔ پھر انہوں نے اس سے آگے کی آیت پڑھی اور میری طرف دیکھا اور کہا "اے ہرم! ترا باپ مرگیا اور تو بھی عنقریب مرجائے گا۔ حضرت آدم علیہ السلام بھی انتقال کر گئے۔ حوا بھی انتقال کر گئیں، ابراہیم خلیل اللہ بھی، موسیٰ کلیم اللہ اور حضرت محمد ﷺ بھی۔ سب پر اللہ تعالیٰ کی سلامتی ہو۔ خلیفۃ المسلمین حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی انتقال کر گئے اور میرے دوست عمرؓ بھی! ہائے عمرؓ! ہائے عمرؓ!"

ہرم کہتے ہیں میں نے عرض کیا کہ "حضرت عمر فاروقؓ کا دور خلافت ابھی جاری ہے اور وہ ابھی بقید حیات ہیں۔ حضرت اویس قرنیؓ نے فرمایا" نہیں۔۔۔ وہ بھی انتقال کر گئے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے انتقال کی خبر مجھے مل گئی ہے اور پھر انہوں نے دعا فرمائی۔

یہ تھے حضرت اویس قرنیؓ جن کا عشق آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس سے فقید المثال اور محبت لازوال تھی مگر اس کے باوجود آپؓ نے اتباع شعریت یا فرمان خداوندی جو "والدہ کی خدمت" سے متعلق تھا اس کو اولیت دی اور اپنی دلی تمنا اور آرزو جو نبی کریم ﷺ کی قربت اقدس میں حاضر ہو کر شرف نیاز حاصل کرنا اور قدم بوسی کرنا تھا اس کو قربان کر دیا۔ مگر جب یہ سنا کہ "جنگ احد" میں سرکار دو عالم ﷺ کا دندان مبارک شہید ہو گیا تو آپؓ نے اپنے تمام صحیح و سالم دانت ایک ایک کر کے توڑ ڈالے اور یوں ایک ایسی داستان محبت رقم کی جو قیامت تک صفحۂ ہستی پر تابندہ و درخشندہ رہے گی۔

تذکرہ اولیاء کے مطابق حضرت اویس قرنیؓ جنگ صفین کے موقع پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کی طرف سے اس معرکہ میں شرکت کر کے جام شہادت نوش کیا اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ آپؓ کے جسم پر چالیس سے زیادہ زخم تھے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

مجیب الرحمان

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا تصور انقلاب

اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے ساتھ ہی برصغیر میں زوال اور غلامی کا ایسا دور شروع ہوا جو اب تک جاری ہے گزشتہ تین سو سالہ دور میں کئی جماعتوں اور گروہوں نے ملک کی بہتری و آزادی کیلئے انتھک محنتیں اور کوششیں کی ہیں۔ لیکن جو کام امام شاہ ولی اللہ کی جماعت نے ملکی آزادی و دین کی فلاح کے لیے کیا۔ اس کی مثال کوئی دوسری جماعت پیش نہیں کر سکتی۔ اس جماعت کی کوششیں نہ صرف برصغیر پاک و ہند بلکہ پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ شاہ صاحب کی جماعت کے عظیم سپوت۔ آزادی کے مجاہد فلسفہ ولی اللہی کے مبلغ اور عظیم سیاسی راہنما مولانا عبید اللہ سندھیؒ اس تمام نظری، فکری اور عملی نظام میں ایک ناقابل فراموش کردار کے مالک نظر آتے ہیں۔

آپ ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء بمطابق ۱۲ محرم الحرام ۱۲۸۹ھ ضلع سیالکوٹ کے گاؤں چیانوالی میں پیدا ہوئے (اب یہ گاؤں گوجرانوالہ میں شامل ہے اور شہر سے چند میل کے فاصلے پر ہے)۔ آپ کے والد سکھ مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کا نام بوٹا سنگھ والد کا نام رام سنگھ اور دادا کا نام جیت رائے تھا۔ آپ کی پیدائش سے چار ماہ پیشتر ہی آپ کے والد وفات پا چکے تھے۔ اسکے دو سال بعد دادا بھی فوت ہو گئے۔ مولانا کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ صرف بہنیں تھیں۔ مولانا کی والدہ ساری زندگی سکھ دھرم پر قائم رہیں۔ مولانا کی پرورش بڑی ناز و نعم سے ہوئی۔ اپنے نام کے بارے میں اپنی ذاتی ڈائری میں لکھتے ہیں کہ:

> ”میں سلمان فارسیؓ کے اتباع میں اپنا نام عبید اللہ بن اسلام لکھا کرتا ہوں۔ مگر بعض عرب دوستوں کے اصرار پر والد کی طرف منسوب کر کے لکھنا پڑا۔ تو عبید اللہ بن ابی عائشہ لکھا۔ میری بڑی بہن کا نام جیونی تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اگر کسی نے اس سے زیادہ تصریح کیلئے کہا تو عبید اللہ بن راما بن رائے لکھوں گا۔ میرے دادا کا پورا نام رام سنگھ ولد جیت رائے ولد گلاب رائے ہے۔“

ضلع ڈیرہ غازی خاں میں اس دور میں اکثر آبادی مسلمانوں کی تھی۔ اس علاقہ میں پیروں، فقیروں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اور عوام وخواص کو تصوف سے بہت لگاؤ تھا۔ صدیوں سے اس زمین میں بڑے بڑے صوفیائے کرام پیدا ہوتے چلے آرہے تھے۔ یہ ماحول تھا جس میں آپ نے ماموں کے ہاں ابتدائی تعلیم سکول سے حاصل کی اور اپنی زندگی کے دس بارہ سال گزارے جبکہ دوسری طرف گھر کے چھوٹے بڑے سکھ تھے۔ جام پور میں حصولِ تعلیم کے دوران آپ کا مسلمانوں سے میل جول بڑھتا گیا۔ اور مسلمانوں کی زندگی کا بہت قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ اور وہ اسلامی تعلیمات اور معاشرت سے بہت متاثر ہوئے۔ ۱۸۸۴ء میں ایک لڑکے (جو کہ ہندو تھا) نے مولانا عبیداللہ سندھی کو "تحفۃ الہند" کتاب پڑھنے کیلئے دی۔ اس کتاب نے آپ کو بہت متاثر کیا۔ اس کے بعد آپ نے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی کتاب "تقویت الایمان" اور مولوی محمد لکھنوی کی کتاب "احوال الاخرت" کا مطالعہ کیا۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے متاثر ہو کر مولانا عبیداللہ سندھی نے ۱۸۸۷ء میں جب کہ آپ کی عمر صرف پندرہ برس تھی۔ اسلام قبول کیا۔ اور اپنا نام "تحفۃ الہند" کے مصنف عبیداللہ کے نام پر عبیداللہ رکھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد آپ نے فیصلہ کیا کہ وہ ماموں (جام پور) کے گھر سے نکل جائیں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد دین اسلام کی مزید تعلیم حاصل کرنے کیلئے اپنے عزیز واقارب کو چھوڑ کر سندھ کے طرف چلے گئے۔

سندھ پہنچ کر آپ سید العارفین حضرت حافظ محمد صدیق بھر چونڈی شریف کے پاس حاضر ہوئے۔ حافظ صاحب نے آپ کی تربیت بہت اچھے انداز سے کی اور ایک دن بھرے مجمع میں فرمایا کہ عبیداللہ نے اللہ کے لئے اپنے ماں باپ کو چھوڑا۔ آج کے بعد ہم اس کے ماں باپ ہیں۔ مولانا نے سندھ کو اپنا مستقل وطن قرار دیا۔ مولانا تعلیم حاصل کرنے کیلئے مولانا ابوالسراج غلام محمد کی خدمت میں دین پور (ریاست بہاولپور) میں حاضر ہوئے اور ان سے "ہدایۃ النحو" پڑھی۔ کوٹلہ رحیم شاہ میں مولوی خدا بخش سے کافیہ پڑھی۔ اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔ وہاں سے فارغ التحصیل ہوئے۔ مولانا سندھی نسلاً سندھی نہ تھے۔ لیکن سرزمین سندھ سے نسبت کو انہوں نے دل کی گہرائیوں سے قبول کیا تھا۔ اس لئے انہوں نے سندھی کے لفظ کو اپنے نام کا جزو بنالیا۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے بحث و مباحث کے بعد ترمیم کر کے ۱۹۲۴ء میں استنبول (ترکی) میں ہندوستان کی آزادی اور ہندوستان کی حکومت کے لئے جو پروگرام مرتب کیا تھا۔ وہ درج ذیل مقاصد حاصل کرنے کے لئے تیار کیا گیا تھا:

۱۔ ہندوستان کیلئے کامل آزادی حاصل کرنا اور ہندوستان میں ایک وفاقی نظام حکومت قائم کرنا۔

۲۔ ہندوستان میں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں اور اسلام کو محفوظ کرنا۔

۳۔ ہندوستان میں محنت کش طبقہ کی یعنی کسان، مزدور اور دماغی کام کرنے والوں کی اکثریت رکھنے والی حکومت قائم کرنا۔ زمینداری اور سرمایہ داری کو ملک سے ختم کر دینا تاکہ کمیونزم کے سبز باغ دیکھ کر عوام دھوکہ نہ کھائیں۔

۴۔ امپیریلزم کا توڑ کرنے کے لئے ایشیاٹک فیڈریشن بنانا۔

قرآن حکیم کی دعوت عالم گیر انقلاب کی دعوت ہے۔ جس کا تعلق ساری نوع انسانی کے ساتھ ہے۔ اگر کسی معاشرے کو ایک شخص مان لیا جائے تو سیاست اس کے اجزاء کو آپس میں مربوط کر کے اس کے ڈھانچے کو قائم رکھتی ہے۔ اقتصادیات اسے نشو و نما پہنچاتی ہے اور فلسفہ اس کی معنوی زندگی کی تنظیم کرتا ہے۔ اگر کوئی مخالف طاقت اس معاشرہ پر حملہ کر کے اس کی سیاسی طاقت چھین لے لیکن اس کا اقتصادی ڈھانچہ اور اس کا نظام فکر محفوظ رہے تو وہ اپنی سیاسی شکست کا مداوا کر کے اپنی ہستی از سر نو قائم کر سکتا ہے۔ تاریخ اس کی بہت سی مثالیں پیش کرتی ہے۔ افغانستان کی جنگیں اس کی اچھی مثالیں ہیں۔ انگریزوں نے اسے تین مرتبہ (۱۸۵۲، ۱۸۷۹، ۱۹۱۹) سیاسی اور فوجی شکست دی۔ لیکن اس کی اقتصادی اور فکری طاقت محفوظ رہی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ افغانوں نے اپنے آپ کو پھر مضبوط کر لیا۔ لیکن اس معاشرے کی فوجی اور سیاسی شکست کے بعد اس میں اگر اقتصادی بدحالی بھی پیدا کر دی جائے اور فکری نظام قائم رہے تو بھی وہ پہلے سے زیادہ محنت کر کے اپنی اقتصادی حالت کی اصلاح اور اپنی سیاسی کمزوری کا مداوا کر سکتا ہے اور اگر سیاسی طاقت اور اقتصادی نظام کے ساتھ ہی اس معاشرہ کا فکری نظام بھی ٹوٹ جائے۔ تو پھر معاشرہ کا زندہ رہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اسلام جن ملکوں میں اپنی تاریخ کی ابتدائی صدیوں میں داخل ہوا۔ ان ملکوں

میں ایران، افغانستان، ترکستان، مصر، شام وغیرہ میں اصل مذہب کا کوئی نام لیوا باقی نہیں رہا۔ اب ان ملکوں کی سیاسی اور اقتصادی طاقت اسلام ہی کی خدمت میں استعمال ہو رہی ہے۔

براعظم پاکستان و ہند میں خود ہماری تاریخ اس تاریخی عمل کی ایک مثال ہے۔ سترہویں صدی عیسوی میں برعظیم ہند پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا۔ اس زمانے میں مختلف قومیں اس براعظم کی طرف بڑھیں۔ انہوں نے یہاں کی حکمران طاقت کو شکست دینے کے لئے پہلے سیاسی اور اقتصادی غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کی اور پھر فکری حملہ کیا۔ سیاسی میدان میں فرانس اور برطانیہ کی آویزش دکن میں شروع ہوئی۔ رفتہ رفتہ انگریزوں نے فرانسیسیوں کو نکال باہر کیا۔ ۱۸۵۸ء تک سارے ملک پر خود قابض ہو گئے اور مغل حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ یہ ہماری سیاسی اور فوجی شکست تھی۔ اقتصادی میدان میں یورپ، خصوصاً انگریزوں نے ہماری صنعت و حرفت اور تجارت کو برباد کر دیا۔ ہمارے ملک کی پیداوار کوڑیوں کے مول خرید کر لئے گئے اور اپنی مصنوعات سونے کے بھاؤ ہمارے ملک میں فروخت کیں۔ رفتہ رفتہ اس برعظیم کی ساری آبادی کو اقتصادی بدحالی میں مبتلا کر دیا۔ یہ ہماری اقتصادی شکست تھی۔

اس پر اکتفانہ کر کے انگریزوں نے ہم پر فکری حملہ بھی کیا۔ چنانچہ انہوں نے ہمارے مذہبی افکار میں جو ہماری زندگی کی بنیاد تھے، وسوسے پیدا کرنے شروع کیے۔ یہ ان کا منفی فکری حملہ تھا۔ اس کے ذریعے انہوں نے ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں اسلامی مذہبی حقائق کے خلاف شکوک پیدا کر کے ان کے یقین کی جڑیں ہلا دیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے افکار ایسے انداز میں پیش کئے کہ ہمارے نوجوان ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے، چنانچہ یورپی مادہ پرستانہ سائنس اور فلسفے نے ہمارے نوجوانوں کے افکار کو مزید متزلزل کر دیا۔ یہ یورپ والوں کا مثبت فکری حملہ تھا۔ اس دوگانہ حملے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارا نوجوان طبقہ مغربی افکار سے مرعوب ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ یورپی طرز پر سوچنے لگا۔ اور اپنی شخصیت کھو بیٹھا۔ لیکن ہم میں سے ایک اہم اقلیت نے اس فکری حملے کو برداشت کر لیا۔ وہ اس کے مقابلے کے لیے ڈٹ گئی۔ اور اس نے رفتہ رفتہ محنت کر کے ۱۹۴۷ء میں انگریزوں کو ملک سے نکال باہر کیا۔ یہ اقلیت امام ولی اللہ دہلوی کے فکر پر کام کرنے والوں کی ہے اس جماعت کے کارکنوں نے پہلے ۱۸۶۲ء میں پشاور کو

مرکز بنا کر کام کرنا شروع کیا اور کوشش کی کہ سکھوں سے پنجاب چھین کر دہلی پر قبضہ کریں اور امام ولی اللہ دہلوی کے فکر پر جمہوریت قائم کریں۔ لیکن یہ جماعت ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے حادثے میں شکست کھا گئی اس کے بعد اس کے کارکنوں نے انگریزوں کو ملک سے باہر نکالنے کے لیے ۱۹۱۵ء میں افغانستان اور ترکی کے فوجی اتحاد کی کوشش کی، لیکن ان کا پروگرام بھی پورے طور پر کامیاب نہ ہوسکا البتہ وہ انگریزوں کو جزوی شکست دینے میں کامیاب ہوگئی۔ اس کے بعد ہی مولانا عبیداللہ سندھی نے استنبول (ترکی) سے تقسیم ہند کا پروگرام شائع کیا۔ جسے یورپ میں خوب اشاعت دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ شمال مغربی ہند میں مسلمانوں کی آزاد ریاست قائم کرنے کا تخیل مسلمانوں میں پیدا ہوگیا اور ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی ریاست وجود میں آگئی۔

یہ ہماری سیاسی فتح ہے۔ اب ضرورت ہے کہ ہم تاریخ کے عمل کو الٹ دیں اور فکری نظام پر قائم کی ہوئی مملکت پاکستان کو اقتصادی لحاظ سے مضبوط کریں پھر اسے بین الاقوامی میدان میں غالب کریں۔ اس وقت ہم کہہ سکیں گے ہم نے اسلام (مکمل طور پر) قائم کرلیا۔ اسلام میں کسی قوم کا نظام فکر، اس کے فلسفہ حیات پر مشتمل ہوتا ہے، وہ اس کے افکار میں سے تعارض دور کر کے وحدت فکری پیدا کر دیتا ہے۔ جس سے معاشرے میں وحدت عمل ظاہر ہوتی ہے۔ یہ فکر و عمل کی وحدت ہی اس معاشرے کی نشو ونما اور قوت کا موجد بنتی ہے۔ اس کے برخلاف جس معاشرے میں وحدتِ فکری نہ ہو، اس میں انتشار عمل پیدا ہو جاتا ہے اور اندرونی اختلافات اس کی بربادی کا باعث بنتے ہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی کے تصورِ انقلاب کا ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ کیا جائے کیونکہ ہندو مسلم اختلافات کو ختم کرنے کے لئے بار بار کوششیں کی گئیں۔ مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ وجہ یہ کہ مسئلہ کی اہمیت و اصلیت پر غور نہیں کیا جاتا۔ مولانا سندھی اپنے مقالہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ ان کے اندر (ہندو اور مسلمانوں) میں باہمی اختلافات ہیں۔ ان قومی اختلافات کو مذہبی یگانگت بھی نہیں مٹا سکتی۔ مسلمانوں میں پنجابی، سندھی، پٹھان، کشمیری اور بلوچی کا سوال موجود ہے۔ جب کہ ہندوؤں میں بنگالی، مدراسی، مرہٹی، گجراتی و دراوڑی کا مسئلہ پایا جاتا ہے۔ اس طرح برصغیر میں طبقاتی پیچیدگی بھی

موجود ہے۔ مالدار و محنت کش، زمیندار و کسان، سرمایہ دار و مزدور کی باہمی کشمکش۔ ہر ایک ہندوستانی قوم کو دو متقابل اور متعارض صنعتوں میں بہ آسانی تقسیم کر سکتی ہے۔ اس لیے صرف مذہبی بنا پر تمام ہندوستانی مسائل اور خصوصاً ہندو مسلم اختلافات کو حل کرنا کوئی راہِ نجات پیدا نہیں کر سکتا۔ مروجہ نظام سرمایہ داری کو ختم کرنے کی ضرورت پر زور دیا لیکن اس کی بجائے کوئی ایسا نظام بھی قبول نہیں کرتے جس میں مذہب کے لئے بالکل کوئی گنجائش نہ ہو اور وہ چھوٹی چھوٹی انفرادی ملکیت کی اجازت نہ دیتا ہو۔ سرمایہ دارانہ نظام سے چھٹکارے کے لئے مولانا سندھی نے ایک نیا اقتصادی وسیاسی نظام تجویز کیا۔ اپنی پارٹی کے ممبروں کے لئے یہ شرط لگادی کہ وہ اپنی ذاتی ضروریات اور مصارف کو اپنے ملک کی متوسط زراعت پیشہ آبادی سے زیادہ نہ بڑھائیں۔ تاکہ گورنمنٹ میں سرمایہ داری کو کسی طرح دوبارہ پیدا ہونے کی گنجائش باقی نہ رہے۔ موجودہ تقسیم دولت اور قانون ملکیت اور اس کے عوض ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں انفرادی ملکیت کے بدلے اجتماعی ملکیت کا قانون جاری ہو اور زمین کی پیداوار اور صنعتی مال کو بیچنے کے لئے نہیں بلکہ حسب ضرورت استعمال کے لئے پیدا کیا جائے۔

مولانا سندھی کو یہی فکر لاحق رہتی کہ عوام کیسے منظم ہوں، مولانا نے اپنے خطبات اور مقالات میں بار بار اسی مسئلہ پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم نے ۱۵ سے ۱۶ برس کی عمر میں اپنا آبائی وطن چھوڑا۔ انہوں نے تمام عمر لوگوں کی فکری تربیت کی اور انہوں نے لوگوں کا ذہن بنایا۔ مولانا سندھی مرحوم نے اپنے پہلے سیاسی پروگرام کے مطابق جو انہی کے الفاظ میں ''اسلامی بھی تھا اور انقلابی بھی'' کام شروع کیا اور جماعت بنائی تو اس کا پہلا میدانِ عمل سندھ تھا۔ حضرت شیخ الہند نے ان کے اس کام کو بہت پسند کیا اور انہیں چند ہدایات دیں۔ بعض اصلاحات کے بعد اس کا تعلق تحریک اتحاد اسلامی سے جوڑ دیا۔ سندھ کے صاحب استعداد نوجوانوں کی فلسفہ ولی الٰہی کے مطابق تعلیم و تربیت کا بیڑہ اٹھایا اور سندھ کو افکار ولی اللہی سے منور کرنے اور اسے خطہ علوم و معارف بنا دینے کی کوشش کی۔

سب سے پہلی کتاب مولانا سندھی کے بارے میں سرور صاحب نے لکھی اس کا نام ''مولانا عبیداللہ سندھی'' ہے۔ یہ کتاب سندھ ساگر اکادمی لاہور نے شائع کی لیکن ۱۹۵۵ء میں اس کی تلخیص ہوئی

اور کتاب کا نام ''تعلیمات مولانا عبید اللہ سندھی'' رکھا گیا۔ اس کتاب کے آغاز کے چند الفاظ جو سرور صاحب نے مولانا سندھی کی طرف منسوب کیے ہیں۔ نہایت دردناک ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ الفاظ پڑھتے ہوئے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ الفاظ درج ذیل ہیں:

''ایک دن مولانا بڑے مغموم تھے۔ فرمانے لگے کہ میں مسلمانوں کو کام کی اور ضرورت کی باتیں کہتا ہوں۔ لیکن وہ نہیں سنتے۔ بلکہ مجھے مطعون کرتے ہیں۔ مجھے دیکھو میں سولہ برس کا تھا کہ گھربار چھوڑ کر نکل آیا تھا۔ مانا کہ میرا خاندان بہت بڑا نہ تھا۔ اور نہ ہمارے ہاں دولت کی فراوانی تھی۔ لیکن آخر میری ماں تھی، میری بہنیں تھیں اور ان کی محبت میرے دل میں جاگزین تھی۔ لیکن اسلام سے مجھے اتنی محبت تھی کہ میں کسی محبت کو بھی خاطر میں نہ لایا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ماں کو چھوڑنے سے کس قدر مجھے ذہنی کوفت ہوئی (یہ کہتے ہوئے مولانا آبدیدہ ہو گئے) آپ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا: اسلام میں میری شیفتگی کا نتیجہ تھا کہ جو مجھے اسلام کی بات سمجھاتا اور وہ بات میرے دل میں بیٹھ جاتی تو میں اس کا دل و جان سے گرویدہ ہو جاتا۔''

مولانا اس فکر کے حامی تھے کہ قرآن مجید پوری انسانیت کی بنیادی فکر کا ترجمان ہے۔ اور یہ فکر اپنی فطرت میں آفاقی ہے۔ تمام مذہبی اصولوں اور قابل قدر انسانی افکار کا خلاصہ ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی کے خیال میں قرآن حکیم اسی بنیادی اور خالص فکر انسانی یا ضمیر انسانی کی نمائندگی کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کی روشنی میں مولانا سندھی پر یہ بات واضح ہوئی کہ قرآن کریم کا اصل مدعا دراصل خالص، پاک اور بلند انسانیت کا قیام ہے۔ اس مقصد کے لئے جدوجہد کرنا انسانی زندگی کا ایک اعلیٰ ترین مقصد ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنی تمام زندگی اسلام اور انسانیت کے کاز (Cause) کیلئے وقف کر دی۔ مولانا نے انسانی وحدت پر زور دیا۔ جب کہ ہم مغربی طرزِ زندگی کو دیکھتے ہیں۔ اس کی بنیاد ترک مذہب اور بے مہار طلب آزادی پر ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مغربی طرزِ زندگی اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ کر زوال

پذیر ہو چکی ہے۔ علامہ اقبال کی فکر اس مسئلہ میں شاید سب سے بلند ہے اور واضح بھی۔ ۱۹۳۸ء میں نوروز کے موقع پر لاہور ریڈیو سے ایک تقریر میں فرمایا انسان کی بقاء کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔ جب تک دنیا کی تعلیمی طاقتیں اپنی توجہ کو احترام انسانیت کے درس پر مرتکز نہ کر دیں۔ یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی بنی رہے گی۔ وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے۔ اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے۔ جو نسل، زبان اور مقام سے بالاتر ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے تاریخ کے ایک اہم عمل کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی کہ یہ عمل بنی نوع انسان کیلئے زہر قاتل ہے کیونکہ یہ انسانی وحدت کو پارہ پارہ کر دیتا ہے۔ مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ ایک قوم، ایک مذہب اختیار کرتی ہے۔ ابتداء میں یہ خالص حالت میں ہوتا ہے۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ثقافت، زبان اور دیگر طور طریقے اور رسوم ورواج اس کی شکل تبدیل کر دیتے ہیں۔ پھر اس قوم کا اصرار ہوتا ہے کہ اس کا یہ قومی مذہب ہی دراصل پوری انسانیت کیلئے نمونہ ہے۔ باقی مذاہب درست نہیں۔ لیکن یہ داستان یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ یہ قومی مذاہب آگے جا کر گروہی اور فرقہ ورانہ مذہب کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور اس طرح وحدت انسانیت پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم نے اس صورتِ حال سے لوگوں کا آگاہ کر دیا۔ توحید کو سب سے زیادہ اہمیت دے کر انسانوں کو وحدت اور شیرازہ بندی کی طرف بلایا۔

حوالہ جات

۱۔ سرور میواتی، لاہور۔

۲۔ عبیداللہ سندھی، ذاتی ڈائری، لاہور ۱۹۴۶ء، ص ۹۔

۳۔ ڈاکٹر ابوسلیمان سندھی، مقامات مولانا عبیداللہ سندھی (سیمینار کراچی) مولانا عبیداللہ سندھی اکیڈمی کراچی ۱۹۹۴ء، ص ۱۲۳

۴۔ محمد سرور، خطبات ومقالات، سندھ ساگر اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۱ء۔

۵۔ قرآنی فکر انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی، مکتبہ حنیفہ، اردو بازار گوجرانوالہ ص ۵۔

۶۔ محمد سرور، خطبات ومقالات مولانا عبیداللہ سندھی، سندھ ساگر اکیڈمی لاہور ۱۹۸۷ء، ص ۲۵۶۔

۷۔ مرتب عبدالخالق آزاد، خطبات ومقالات مولانا عبیداللہ سندھی، دار التحقیق والاشاعت، شارع فاطمہ جناح لاہور، ص ۱۵۲۔

شارق بلیاوی

ادب تخلیق یا تعبیر

بعض مبصر وسیع مطالعہ اور غائر تامل کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ "فن کاری کا اصل محرک موجود سے نا آسودگی اور ممکن الوجود کی تمنا ہے"۔ مجنوں گورکھپوری نے اپنی تنقیدی کتاب میں اسے کوٹ کیا ہے۔ ادب کا تعلق بھی فنکاری سے ہے خواہ شعری ہو یا نثری۔ یعنی ادب بھی موجود سے نا آسودگی کا ایک سبب ہوا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی موجود سے نا آسودگی ایک فنکار کو کسی شئے کی تخلیق پر آمادہ کرتی ہے اور اسے تخلیق کار بنا دیتی ہے؟

میرا خیال یہ ہے کہ فنکار کسی وجود کی ساخت، اس کے خارجی یا داخلی امکانات اس کی متاثر کن ہیئت، دل پذیری، جمالیاتی کشش سے اثر پذیر ہو کر ہی اپنی دلی کیفیات، احساسات کو تخیل کی قوت سے عکس ریز کرتا ہے یا پھر تحریر کرتا ہے۔ کیا انسان میں تخلیقی قوت یا صلاحیت ہے جو کسی وجود کی نا آسودگی سے متاثر ہو کر اس سے بہتر وجود پیش کر سکے؟ آسودگی کے معنی تو یہی ہوئے کہ وہ شئے تخلیق کی جائے جو اس سے بہتر ہو۔ تو کیا یہ قوتِ تخلیق کسی فنکار میں موجود ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے جس پر سنجیدگی سے غور ہونا چاہئے۔ انسان کی اپنی حقیقت کیا ہے اس کی دسترس میں کون سا تخلیقی جوہر ہے جو اپنے عین منشاء کے مطابق کوئی چیز تخلیق کرے۔ آیئے اس بحث کو کسی اور طریقے سے آگے بڑھاتے ہیں۔ معروف مغربی سائنس داں Huxley ایک مضمون نیچر اینڈ سائنس میں لکھتا ہے

"Man can not create any thing, he can only reshape the thing."

اس کے مضمون کا لب ولباب یہ ہے کہ انسان کسی بھی چیز کو تخلیق نہیں کر سکتا وہ تو صرف دستیاب فطری تخلیق کی ہیئت بدل سکتا ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ایک کارپینٹر ایک کرسی عمدہ بناتا ہے مگر کرسی بنانے کے لئے تختے استعمال کرتا ہے۔ تو تختہ حاصل کہاں سے کیا: درخت سے اور درخت قدرت

کی تخلیق ہے یعنی درخت کی ہیئت ترکیبی صلاحیت سے تبدیل کر دیتا ہے اسی طرح دنیا کی ساری چیزیں قدرت کی مہیا کئے ہوئے وسائل ہی سے بنتی ہیں اور بنیں گی ۔۔ جس طرح درخت کی ساخت تبدیل کر کے کرسی یا کوئی اور شئے بنائی جاتی ہے ۔ یعنی تمام سائنسی یا غیر سائنسی اشیاء قدرت کے پیدا کردہ مادی وسائل کی تبدیل شدہ اشکال ہیں ۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے انسان یا فنکار کسی وجود سے اپنی ضروریات یا خواہشات کے مطابق اپنے دماغی جوہر یا اختراعی قوت کے زور پر استفادہ کرتا ہے ۔

شعروادب میں بھی یہی اصول کارفرما ہے ۔ مادہ کے بغیر تخیل بھی نہیں ۔ انسان کی تمام تر فکری یا تخیلاتی رسائیاں کسی نہ کسی مادی وجود کی مرہون منت ہیں ۔ الطاف حسین حالی اور دوسرے مغربی مفکرین کا بھی یہی خیال ہے کہ تخیل بغیر مادہ کے نہیں ۔ کچھ لوگ سوال کرتے ہیں خیال کا مادے سے کیا تعلق ؟ شاید انہیں پتا نہیں کہ وہ مادہ ہی ہے جو محرک خیال وخواب ہے ۔ اگر ہم عشقیہ معاملات پر خیال آرائی کرتے ہیں تو ضرور کسی پُر جمال ہستی سے متاثر ہیں ۔ محرّک کوئی حسینہ ہوئی ۔ رنج وغم یا زندگی کے جتنے بھی اہم یا غیر اہم مسائل ہیں جن پر ہم قابو پاتے یا ان کی نوعیت کی تعبیر کرتے ہیں ان کے محرکات سماجی یا معاشی یا سیاسی ہوتے ہیں اور ان سب کا بالواسطہ یا بلاواسطہ مادی دنیا ہی سے تعلق ہے ۔ سماج یا معاشرہ انسان کے وجود سے ہے اور انسان بھی مادی ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہیں انسان ہو جاتا ہے کہیں حیوان کے خصائل اختیار کر لیتا ہے ۔ یعنی زندگی کی ہر قسم کی کارفرمائیاں ہمارے اپنے وجود کی غلط یا صحیح مقتضیات ہی کے تحت ہیں ۔ اور یہی وجودی مسائل ہمیں خیالات کی دنیا میں لئے پھرتے ہیں ۔ جو کچھ ہمارے مشاہدے یا تجربے میں آتا ہے ہم اسی کے زیر اثر سوچتے ہیں ۔ کبھی ان پر سوچتے کبھی ان کی ذیلیات پر سوچتے ہیں کچھ یقینیت کے ساتھ تو کچھ ظنّیات کے دائرہ میں بھٹک کر! پھر ان سے پیدا ہونے والے امکانی حالات پر غور کرتے ہیں ۔ زندگی کی یہی وجودی اشکال مختلف طریقوں سے انسانی ذہن کو متحرک رکھتی ہیں ۔ اور ہمارے احساساتی عوامل ہمیں خیال وفکر کی وسعتوں میں مختلف کیفیات سے دوچار

کرتے ہیں۔انسان کوخصوصاً فنکار کو سوچنے کی زبردست قوت عطا کی گئی ہے اور وہ ارضی یا آفاقی معروضات کو اپنے مطالعہ فکر میں لا کر اپنے خیالات کی نئی نئی تعبیریں مختلف اقسام میں پیش کرتا ہے ۔اور یہ جو کچھ بھی ہیں محض تعبیریں ہی تو ہیں تخلیق تو نہیں! بادی النظر میں تو یہی لگتا ہے کہ یہ سب کچھ شعروشاعری، نثریات مجسمہ سازی تصویر کشی یا پھر دنیا کی تمام مصنوعات سائنسی یا غیر سائنسی ایجادات سب تخلیقات ہیں اس لئے کہ یہ ساری چیزیں ہمارے سامنے نئی تبدیل شدہ شکلوں میں ہیں جنہیں ہم نہیں جانتے تھے یا نہیں دیکھتے تھے۔ مگر غور کیا جائے تو حقیقت واضح ہے کہ ہر شئے کسی نہ کسی مادی وجود کا تعبیری حصہ ہے اس کا اپنا وجود کسی دوسرے وجود کا نقش فریاد ہے۔

ادب اپنی معروضی حالت میں ادب ہے۔ شعروشاعری بھی اپنی تشکیلی صورت میں شاعری ہی ہے تاہم یہ ادیب وشاعر کے مادی وجودی اثر سے متاثرہ تخیلی موشگافیوں کے ثمرات ہیں۔انسان ہمیشہ سے اپنے خیال وخواب کی تعبیریں کسی نہ کسی شکل میں ڈھالتا رہا ہے۔اور اس کے لئے اسے ہمیشہ ہی قدرت کی بے انت تخلیقات کا ہی سہارا ملا ہے اور اگر یہ سب نہ ہوں تو یہ دنیا یہ عالم کچھ نہ ہو صرف خلا ہی خلا ہو۔ پھر انسانی ذہن کو سوچنے کے لئے کچھ نہ ملے گا اور وہ بھی خلا کی مثال پیش کرے گا۔انسان اس عالم ہست وبود میں بذات خود ایک تعبیر کی حیثیت رکھتا ہے جو تخلیق کی معنویت اور رموز سے ناواقف اپنے دست وپا کی کارکردگی اور ذہن وفہم کی محدود رسائی پر نازاں ہے۔اگر یہ ذہنی قوت سلب کر لی جائے یا ہو جائے۔یا بینائی اور سماعت چھن جائے پھر کیا بنے گا؟ لہٰذا یہ سوال نمایاں ہو کر ابھرتا ہے کہ کیا کوئی چیز تخلیق کی جاسکتی ہے؟ کیا شعروادب کو تخلیق کہا جاسکتا ہے؟ اور اگر کہا جاسکتا ہے تو کن شعریات کے تحت یا کن اصولی شواہد کے تحت؟۔ادب کا تعلق چونکہ خالصاً قوت متخیلہ سے ہے لہٰذا یہ بھی مادی تعبیر ہوا۔اگر ہم ذہنی یا وجدانی کیفیات کی بات کرتے ہیں تو ان کا بھی تعلق خیالی محرکات سے ہے۔سب کچھ خیال کی ماورائی پرواز ہے۔ خیال بنیاد ہے ذہن وفکر کی اڑان کی اور خیال کچھ بھی نہیں بغیر کسی محرکِ خیال کے اور یہ محرکِ خیال مادے کا وجود ہے۔لہٰذا وجود سے نا آسودگی کسی دوسرے بہتر وجود کی تخلیق کا سبب نہیں بن سکتی۔

انسان میں یہ صلاحیت نہیں کہ قدرت کی نفی کو اثبات میں ڈھال دے۔یا کچھ نہیں کو کچھ کر دکھائے۔یا صفر کو ایک میں ڈھال سکے۔تخلیقی صلاحیت صرف اور صرف قدرت کو حاصل ہے۔جو قادر ہے وہی تخلیق کر سکتا ہے۔ہم خدا کی بنائی ہوئی چیزوں کی نقالی کر سکتے ہیں۔وہ بھی کچھ خامیوں کے ساتھ۔میرا خیال یہی ہے کہ ادب تخلیق نہیں خیال کی تعبیر ہے جس کے ذریعہ ہم خیال کے پس منظر میں جھانک کر اس کے طبعی محرکات نیز فطری معاملات کا مطالعہ کر سکتے ہیں اور حقیقت حال سے باخبر ہو سکتے ہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ تخلیق کا اصل معنی ومفہوم یہی ہے کہ بغیر کسی مادی وسیلہ کے کچھ نہیں کی جگہ کچھ بنا دیا جائے۔دوسری صورت میں ہم اس عمل کو بنانا یا ڈھالنا یا ہیئت تبدیل کرنے کا عمل کہہ سکتے ہیں۔''ورنہ خدا بھی خالق اور بندہ بھی خالق'' یہ صفاتی تصادم کی کوشش نہیں تو اور کیا ہے؟ہم قدرت سے کسی طور پر مقابلہ نہیں کر سکتے تو پھر اس کے سب سے بڑے اہم صفاتی نام ''خالق'' کا اپنے نام کے ساتھ تطابق کس طرح واجب ہے۔

شاکرکنڈان

سقراط: صاحبِ سیف و نطق

''آپ کو یاد ہوگا ایتھنز والو! کہ میں وہ ہوں، جس کو جب جرنیلوں نے، جن کو آپ نے میری کمان کے لئے منتخب کیا تھا، پوٹیڈیا، ایمفی پولس اور ڈلیم کے محاذ پر مقرر کیا تھا۔ میں ان محاذوں پر اس طرح ثابت قدم رہا تھا جس طرح کسی بہادر اور جری انسان کو رہنا چاہیئے تھا اور میں موت کے منہ میں کھڑا رہا تھا۔ اپنی جگہ سے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹا تھا اور آج جب کہ میں جانتا ہوں اور مجھے اس بات کا پوری طرح علم ہے کہ مجھے خدا نے اس کام کا حکم دیا ہے کہ میں فلاسفروں کے مشن کی تکمیل کروں اور عقل و دانش کو خود میں اور دوسرے انسانوں میں تلاش کروں تو کیا آج میں موت کے خوف سے اپنا محاذ چھوڑ کر بھاگ جاؤں گا؟ کیا کچھ عجیب سا نہیں ہوگا کہ میں نے انسانوں کے حکم کی تعمیل تو جان پر کھیل کر کی اور خدا کے حکم کو کسی خاطر میں نہ لاؤں اور زندگی کو ترجیح دوں تو بڑے شرم کی بات ہوگی''۔

یہ الفاظ سقراط نے اپنے مقدمے کی سماعت کے دوران خود پر لگائے گئے الزامات کے جواب دیتے ہوئے عدلیہ اور حاضرینِ شہر کو مخاطب کر کے کہے تھے۔ اس سے جہاں اُس کی جرأت و دلیری سے آگاہی ہوتی ہے وہیں ہمیں اس کی عسکری زندگی کا اشارہ بھی ملتا ہے۔ لیکن مندرجہ بالا تین محاذوں کے علاوہ بھی وہ کئی جنگوں میں بحیثیت سپاہی حصہ لے کر دادِ شجاعت دے چکا تھا۔ حتیٰ کہ جب وہ عمر رسیدہ تھا تو پڑوس کی ریاست نے ایتھنز کو بزور غلام بنانے کا ارادہ کیا۔ اُن کے اعلان سے پورے شہر میں سے کوئی بھی جنگ کیلئے تیار نہیں تھا۔ لیکن سقراط نے تن تنہا جنگ کا اعلان کیا اور پھر پورے شہر کو دشمن کے خلاف لڑنے پر آمادہ کر لیا۔

ایلسی بائی آڈیز جس نے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے اور بالآخر حکمرانوں کی سازش کا

شکار ہو کر مارا گیا۔ سقراط ہی کی طرح بہادر تھا۔ اہلِ ایتھنز دونوں کا نام ایک ساتھ لیا کرتے تھے۔ ایک جنگ میں یہ دونوں شامل تھے۔ ایک ہی خیمے میں اُن کا قیام تھا جبکہ جنگ میں بھی ہر مرحلے میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ رہے۔۔ ایک جھڑپ میں ایلسی بائی آدیز شدید زخمی ہوگیا۔ سقراط نے اس موقع پر بھی بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا اور اسے بحفاظت بچا کر لے آیا۔ جب ایلسی کی دلیری پر اسے انعام کا مستحق قرار دینے کی تجویز پیش ہوئی تو سقراط نے اس کی بھرپور حمایت کی۔ ایلسی بائی آدیز چونکہ سقراط کا شاگرد بھی تھا۔ ویلی آم کی لڑائی میں جب دشمن نے ایتھنز کی فوج کی تباہی مچادی تھی اور بچے کھچے لوگ جان بچا کر بھاگ گئے تھے تو سقراط بھاگنے کو توہین سمجھتے ہوئے چند سپاہیوں کے ہمراہ وہاں موجود رہا۔ لیکن ایلسی بائی آدیز کو اس میں سراسر موت نظر آرہی تھی لہٰذا وہ بمنت سقراط کو اپنے گھوڑے پر بیٹھا کر صحیح سلامت محفوظ مقام پر لے آیا۔

جب ایتھنز والوں کی اہلِ سپارٹا سے جنگ چھڑی ہوئی تھی اُس وقت بھی سقراط فوج میں سپاہی کی حیثیت سے شامل تھا۔ اور پھر لوگوں نے دیکھا کہ وہ تمام افسروں اور سپاہیوں سے نہایت ہی جفاکش ثابت ہوا۔ سخت سردی میں جبکہ تمام سپاہی اندر گرم مکانات میں کمبلوں اور لحافوں میں گھس جاتے تھے اسس وقت سقراط معمولی کپڑوں میں ننگے پاؤں برف پر دوڑتا پھرتا۔ وہ سخت ترین دھوپ کے وقت بھی ریگستان میں بھاگتا دکھائی دیتا اور بیس بیس گھنٹے کام کرنے سے ذرا بھی نہ گھبراتا تھا۔ لہٰذا سردی، گرمی، سختی، نرمی، بھوک، پیاس، عزت و ذلت، آرام اور تھکاوٹ ان سب کو مکمل طور پر اس نے جیت لیا تھا۔ ایک جنگ میں سقراط نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اپنے کمانڈر زینوفن کی جان بچائی تھی جو جنگ میں سخت زخمی ہو کر میدان میں بے سدھ پڑا تھا۔ ایتھنز کا کوئی بھی جرنیل یا سپاہی جنگ کی شدت کی وجہ سے اپنے کمانڈر کو اٹھا کر اپنے مورچے میں لانے کی جرأت نہ کرسکا۔ سقراط کو جب پتہ چلا تو وہ مورچے سے نکل کر ننگے پاؤں میدانِ جنگ میں گیا اور دشمنوں کے سامنے سے زینوفن کو اٹھا کر اپنے مورچے لے آیا۔

فوجی خدمات کے زمانے میں صرف یہی نہیں کہ سقراط نے بہادری کے جوہر دکھائے بلکہ وہ موسم کی خرابی اور تکان کی بھی بالکل پروانہ کرتا تھا اُس نے ایک سپاہی کی حیثیت سے بہت بڑا نام کمایا۔

اُسے اوائل عمری میں ہی باقتضائے آئین ملکی فوج میں بھرتی ہونا پڑا۔۔۔لڑائی سے فراغت کے بعد اس نے اپنی وضع قطع تبدیل کر لی۔کھانے پہننے اور طبیعت میں سادگی آگئی اس قدر کہ بعد میں جنگ کے میدان میں بھی وہ کندھے پر گودڑی اٹھائے ننگے پاؤں رہتا۔۔۔وہ فلسفیانہ باتیں کرنے لگا تھا۔ہم وطنوں کو پابندی مذہب کی تاکید کرتا۔رفتہ رفتہ حکیموں کی ایک کثیر جماعت اس کے خیالات سے فائدہ اٹھانے لگی۔پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ جاری ہوا۔مختلف باغات میں اور دریا کے کنارے وہ اپنے شاگردوں کو حکمت و فلسفہ کے نازک مسئلے سمجھایا کرتا۔وہ طبیعت کا بہت آزاد اور انتہا درجہ کا خوش تقریر تھا۔ اس کا طریقہ تعلیم، تحریر و تصنیف نہیں تھا بحث و تکرار تھا۔وہ سوالات کرنے اور سوالات کا جواب دینے میں بہت ذہین تھا۔جو کچھ مبدائے فیاض نے اس کو ودیعت کیا تھا وہ اس کو اپنے بحث اور مباحثے کے انداز میں خیرات کے طور پر انسانوں میں تقسیم کرتا تھا وہ اپنے علم و کمال کی کسی سے کوئی قیمت وصول نہیں کرتا تھا۔ اس کا طریقہ تعلیم کچھ ایسا سہل اور دلچسپ تھا کہ اس کے اسباق کو ایک بار سن کر کوئی شخص بھی بھول نہیں سکتا تھا۔وہ گھر سے نکل کر سڑک پر کھڑا ہو جاتا لوگ اس کے گرد ہجوم کر لیتے وہ مذہب اور فلسفہ و اخلاقیات کی تعلیم دیتا اور جب لوگ گھر جاتے تو وہ سب کچھ ان کے ذہن میں محفوظ ہوتا۔اس نے نئی سوچ بھی دی اور نئی راہیں بھی دکھائیں۔سقراط نے ہی پہلی بار لوگوں کو بتایا کہ یہ چاند اور سورج ہماری زمین کا حصہ ہیں۔ اس نے خدا کا تصور بھی وہاں کے سرکاری مذہب کے خداؤں سے الگ کر دیا۔وہ ایک خدا کا قائل تھا اس کے نظریات اپنے عہد کے فلاسفروں سے الگ تھے وہ اپنے نظریات کے بارے میں تفصیل سے بحث کیا کرتا تھا۔

سقراط کو علم استدلال کا بانی کہا جاتا ہے اور کائنات میں ویلکلزم کے فلسفہ کا موجد بھی اسے ہی خیال کیا جاتا ہے۔سقراط ۴۶۹ قبل مسیح میں ایتھنز کے محلّہ ایلوپیک میں ایک سنگتراش سوفرونکس (Sophroniscus) نامی شخص کے گھر پیدا ہوا۔لیکن ایک دوسرے حوالے کے مطابق وہ ملک یونان کے صوبہ ایٹکا کے قریب واقع ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔سقراط کی والدہ کا نام فناریٹی (Phaenarete) تھا جو ایک دائی تھی۔والدین نے اپنے بیٹے کو علم ہندسہ، فلکیات، موسیقی اور پہلوانی کی

تعلیم دلوائی نیز آبائی پیشہ سنگتراشی میں بھی مشق بہم پہنچائی۔فلسفہ کی تعلیم سقراط نے اپنے شوق کے باعث حاصل کی۔ان دنوں یونان میں اور خاص کر دارالحکومت ایتھنز میں ہر گلی کالج اور ہر محلہ یونیورسٹی کا درجہ رکھتے تھے۔کچھ لوگوں کا علم تو خداداد ہوتا تھا۔مگر کچھ فیشن کے طور پر بھی دانشور اور فلاسفر بن جایا کرتے تھے یوں بہت سے سوفسطائی فلسفی اس وقت موجود تھے۔سقراط نے نوجوانی سے ہی اُن سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا وہ برابر اُن سے سوالات پوچھا کرتا اور اپنے علم میں اضافہ کرتا رہتا۔اس نے اپنے معاشرے کے تمام قابلِ ذکر اور نامور لوگوں سے تبادلہ خیال کیا جو ایتھنز میں کسی نہ کسی بنا پر شہرت رکھتے تھے۔اُن میں سیاست دان، شاعر، فلسفی، ماہرین تعمیرات، فنِ حرفت کے ماہر، قانون دان، مذہبی عالم، فوجی ماہرین، جرنیل اور حکمرانوں کے سرکاری درباری دانشور وغیرہ بھی شامل تھے۔بلاشبہ سقراط کا عہد دانشوروں، فلاسفروں، سائنس دانوں، ریاضی دانوں اور کائنات کے دیگر علوم کے جاننے والوں کا سب سے بڑا عہد تھا۔

سقراط ابھی تیس سال کی عمر کے لگ بھگ تھا جب اس نے ایک دانشگاہ قائم کی۔جس میں وہ لوگوں سے ملاقاتیں کرتا اور خود کو مصروف رکھتا۔اس مصروفیت کی وجہ سے وہ بہت کم باہر نکلتا۔لوگ خود چل کر اس کے پاس آتے۔سوالات پوچھتے، جوابات پاتے اور یوں تبادلہ خیالات سے علم میں اضافہ کرتے۔

جوانی کا عالم ایسا ہوتا ہے کہ انسان کچھ کرنے اور کچھ پانے کے جذبے کے علاوہ زندگی کی رعنائیوں میں بھی دلچسپی لیتا ہے۔سقراط بھی شاید ان رعنائیوں سے آشنا ہو گیا تھا اور اس کے دل کے کسی کونے میں محبت کا جذبہ وافر مقدار میں جمع ہو گیا تھا اور اسے بھی شاید اس نے ایک فن یا علم کے طور پر حاصل کر لیا تھا۔کیونکہ ایک دفعہ اس نے اس محبت کا ذکر کچھ ایسے الفاظ میں کیا تھا۔۔۔”دایوطیما نامی خاتون نے مجھے پیار کرنا سکھایا۔اس فن میں وہ میری استاد تھی“ ۔دایوطیما نے اس نامور دانشور کو پیار کرنا کس طرح سکھایا یہ اس نے کبھی ظاہر نہیں کیا البتہ اس کی پہلی شادی جوانی میں ہی میرٹو (Myrto) نامی خاتون کے ساتھ ہوئی تھی مگر جلد ہی وہ طاعون کے مرض کا شکار ہو کر اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔اس کی موت کے بعد سقراط نے ایک لمبے عرصے تک شادی نہیں کی اور جب عمر عزیز پچاس سال ہوئی تو دوسری شادی ایتھنز کی

ایک مشہور خاتون زینی تھپی (Xamnthipe) سے ہوئی۔اس شادی کی روداد بڑی دلچسپ ہے۔سقراط سے اس کے شاگردوں اوردوستوں نے ایک بار شادی کے بارے جب پوچھا تو اس نے کہا:

"ہر ایک انسان کا فرض ہے کہ وہ ضرور شادی کرے اور اولاد بھی پیدا کرے۔
کیونکہ قانون قدرت کی پابندی اسی میں ہے مگر میں ایسی عورت سے شادی کر
نے کا خواہاں ہوں جو نہایت سخت، بدمزاج، ضدی اور شریر ہو، تا کہ دنیا میں ایک
نمونہ پیش کروں کہ اچھے، متحمل انسان ہر قسم کی سخت طبیعت عورت کو بھی رام کر
لیتے ہیں۔"

چنانچہ اسی دن سے اس کے رفیق اور طلباء ایسی عورت کی تلاش کرنے لگے۔خود سقراط نے ایسی ہی عورت کے لئے تمام ملک یونان میں ایک اشتہار دیا چنانچہ کچھ عرصے بعد ایک چھوٹے سے قصبہ کا ایک دولت مند زمیندار سقراط کے پاس آیا اور اس سے کہنے لگا کہ

"میری ایک ہی لڑکی ہے۔میں نے اس کو نہایت ہی ناز و نعم اور لاڈ سے پالا ہے
مگر وہ بچپن ہی سے ایسی سرکش، تند مزاج اور لڑاکا ہو گئی ہے کہ ہر بات میں الٹا ہی
چلتی ہے اور بہت ہی بدزبان ہے۔"

سقراط نے اس شرط پر شادی کیلئے آمادگی کا اظہار کیا کہ آپ ہمیں ایک پیسہ تک نہ دیں گے۔ لڑکی کی عمر بھی ۳۵ سال ہو چکی تھی اور یونان میں کوئی شخص اس سے شادی کیلئے تیار نہیں تھا، لیکن ان کی تمام باتوں کے باوجود وہ باہمت خاتون تھی۔سقراط اپنی بیوی کی سخت مزاجی کے بارے میں کہتا ہے کہ:

"اس کی ہر قسم کی واہی تباہی سے میرے اندر ضبط کی قوت پیدا ہوتی ہے۔اس کی
لعنت ملامت سے میں اپنے ظرف کا امتحان لیتا ہوں۔میں دیکھتا ہوں کہ کہیں
اسکی کڑوی بات سے مجھے غصہ تو نہیں آتا۔اسکے لڑنے اور جھگڑنے سے میں اپنے
حوصلہ کو دیکھتا ہوں۔وہ چنگاری سے شعلہ بن جاتی ہے اور میں برف کا ڈلا بنا
رہتا ہوں۔بالآخر وہ خون کے دباؤ کے بڑھ جانے سے بے ہوش ہو جاتی ہے۔

میں اس کو پانی پلا کر ہوش میں لاتا ہوں تو وہ میری بے حد ممنون ہوتی ہے اور مجھ
سے معذرت کرنے لگتی ہے۔ زینی میرا علاج ہے۔ وہ میرے لئے ایک رحمت
ہے۔ وہ مجھ میں علم کا غرور پیدا نہیں ہونے دیتی۔ وہ مجھے زمین پر رکھتی ہے۔ وہ
مجھے احساس دلا دیتی ہے کہ سقراط ایک عام انسان ہے وہ مجھے میری اوقات میں
رکھتی ہے۔"

زینی تھپی کے بطن سے سقراط کے تین بیٹے ہوئے۔ سقراط کی وفات کے وقت بڑا بیٹا جوان تھا اور چھوٹا،
بہت چھوٹا تھا۔ سقراط کو ہم کس مقام پر رکھتے ہیں؟ اُسے کن لوگوں میں شمار کرتے ہیں؟ اس کا درجہ کیا تھا؟
اس بارے بہت سی رائیں موجود ہیں۔ سقراط پر لکھنے والوں نے اس کے متعلق اپنی اپنی رائے دی ہے۔
بہر حال اسلم گورداسپوری نے مختصر الفاظ میں سقراط کے بارے میں جو رائے دی ہے وہ قابل توجہ ہے:

"سقراط ایک پیدائشی مفکر تھا۔ وہ ماں کے شکم کا درویش اور ولی تھا۔ سقراط کے
زمانے میں ہمیں لفظ پیغمبر کا استعمال کہیں نہیں ملتا۔ لہٰذا اُس دور میں پیغمبروں کو
لوگ فلاسفر ہی کہا کرتے تھے۔ ہمارے اسلامی عقیدے کے مطابق ایک لاکھ
چوبیس ہزار پیغمبر اس دنیا میں آئے ہیں۔ ہم اتنی بڑی تعداد میں سے محض سو دو سو
پیغمبروں کے نام بھی مشکل سے جانتے ہیں۔ میرا دعویٰ تو نہیں مگر یقین ضرور ہے
کہ ان ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں سقراط کا نام ضرور شامل ہوگا۔ اس لئے
کہ سقراط کی زندگی کا تمام سلسلہ وسلوک پیغمبروں سے ہی ملتا جلتا ہے۔"

سقراط کی زندگی کا مقصد علم پھیلانا تھا۔ اس کا اعتقاد تھا کہ علم ہی سے اخلاقی کردار پیدا ہوتا
ہے۔ وہ نیکی کو علم اور بدی کو جہالت کہتا تھا۔ قبل ازیں میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ اس کا طریقہ تعلیم اپنا تھا۔
وہ گفتگو کو ترجیح دیتا تھا۔ سوالات، جوابات اور بحث مباحثہ سے تمام مسائل حل کرتا تھا۔ اُس کے سوالات
وجوابات کی پہلی تحریر جو ہم تک پہنچی ہے وہ اس کے ایک دوست سائمن کی ہے۔ سائمن پیشے کے لحاظ سے
موچی تھا۔ سقراط اس کی دکان پر بیٹھا کرتا تھا لوگ وہاں آتے اور سقراط سے سوال کرتے، وہ جواب دیتا۔

سائمن چونکہ پڑھا لکھا تھا وہ اس ساری گفتگو کو لفظ لفظ لکھ لیا کرتا تھا۔ شاید سائمن کی دکان پر بیٹھنے کی وجہ سے ہی کئی محققین نے سقراط کو موچی لکھا ہے۔ جو صحیح نہیں۔ البیرونی نے سقراط کی ایک کتاب ''فاذن'' کا ذکر کیا ہے اور اسے عملِ تناسخ کا قائل بتایا ہے۔ فاذن کے حوالے سے ہی وہ لکھتا ہے:

''اگلوں کے اقوال میں ہم کو بتایا جاتا ہے کہ نفوس یہاں سے منتقل ہو کر ایڈس میں جاتے ہیں۔ پھر وہاں سے بھی منتقل ہو کر یہاں کی چیزوں میں آجاتے ہیں۔ زندوں کا وجود مردوں سے ہوتا ہے اور چیزیں اضداد سے بنتی ہیں۔ پس جو لوگ مر گئے وہ زندوں میں ہو جاتے ہیں اس لئے کہ ہمارے نفوس ایڈس میں قائم ہیں اور ہر انسان کا نفس ایک شے کے واسطے خوش اور مغموم ہوتا ہے اور اس کو اپنا سمجھتا ہے۔ یہی تاثر اُن کو بدن کے ساتھ وابستہ رکھتا ہے اور بدن میں رہ کر جسد نما بنا دیتا ہے۔ جو نفس خالص نہیں ہوتا اس کا ایڈس میں جانا ممکن نہیں ہے وہ بدن سے اس حال سے باہر آتا ہے کہ بدن اس میں بھرا رہتا ہے اور فوراً دوسرے بدن میں داخل ہو جاتا ہے۔ گویا وہ اس میں رکھ کر مضبوط و مستحکم کر دیا جاتا ہے اس لئے وجود میں جوہرِ الٰہی واحد اور خالص کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ نہیں''۔

اس تحریر سے سقراط کو تناسخ کا قائل ظاہر کیا گیا ہے لیکن ممکن ہے اُس نے اپنے عہد سے پہلے والوں کی بات کی ہو۔ یہ بحث پیشروؤں کے نظریہ پر بھی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے یہ کتاب بھی سقراط کے کسی شاگرد نے لکھی ہو۔ کیونکہ سقراط کی اپنی کوئی تحریر کسی ذریعے سے بھی ثابت نہیں ہوئی۔ ایم مہدی حسن بھی لکھتے ہیں کہ سقراط نے تحریریں اپنے پیچھے چھوڑی ہیں۔ اگر یہ حقیقت ہے تو مجھے سقراط کو ''رابدِ سیف و قلم'' ہی لکھنا چاہیے جو حقیقتاً میرا موضوع ہے۔ یوں میرا ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہو جاتا ہے اور کسی کو اعتراض کا موقع بھی نہیں ملتا۔ ایم مہدی حسن ''افاداتِ مہدی'' میں رقمطراز ہیں۔ ایک مقام پر اُس نے بہت ہی چبھتی ہوئی بات لکھی ہے کہتا ہے کہ:

''میں نہیں سمجھتا کیونکر لوگ عقل کی مخالفت کو جائز رکھتے ہیں۔ کسی بات کی صحت پر

اُن کو یقین کامل ہوتا ہے تاہم وہ اس پر کاربند نہیں ہوتے۔ شاید کوئی خارجی اثر وجہ مزاحمت ہو۔ مگر میں تو سمجھتا ہوں اُن کے ارادہ ہی کا یہ نقص ہے۔ مجھے آج تک کوئی بات ایسی نہ مل سکی جس کی سچائی کا یقین ہو اور نہ کر گزرا ہوں۔ لوگ کچھ ہی سمجھا کریں مجھے اُن کی مخالفت کی قطعی پروا نہیں اس لئے کہ میں ان کو داخلِ جمادات سمجھتا ہوں"۔

میرے مطالعے میں سقراط کے بارے میں لکھی گئی کتب یا مضامین سے کہیں بھی ظاہر نہیں کہ سقراط کے اپنے ہاتھوں کی لکھی ہوئی کوئی تحریر موجود ہو۔ البتہ اتنا ضرور تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے کہ اس کی گفتگو اور بحث کو لکھ لیا جاتا تھا۔ جیسے سائمن نے لکھ لیا تھا۔ پھر دو بڑے سوانح نگار سقراط کے شاگرد تھے۔ ایک زینوفن، جو سقراط کا دوست بھی تھا۔ وہ جنگ میں اس کا جرنیل اور امن میں اس کا معتقد تھا۔ اس کی تحاریر سے ہی ہمیں سقراط کی گھریلو زندگی، اس کے مکالمات، اس کی عسکری خدمات اور نظریات کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔ دوسرا شاگرد جو استاد کی وفات کے بعد دل برداشتہ ہو کر ایتھنز سے میگارا چلا گیا تھا اور کئی سال کے بعد واپس لوٹا۔ وہ استاد کے فلسفۂ اصلاحِ انسان کی تڑپ کو اپنے سینے میں رکھتا تھا مگر اس کے انجام کے بعد طریقۂ اصلاح و ہدایت پر کاربند نہ رہ سکا۔ وہ کہا کرتا تھا:

"بچے اس قابل نہیں ہوتے کہ اُن سے عقل و خرد کی پہیلیاں بیان کی جائیں اور نہ ہی عام شہری اس قابل ہوتے ہیں کہ اُن کے ساتھ فلسفۂ قدرت، قانون اور خیر و شر کی بحث کی جائے"

یہ شخص افلاطون تھا جس نے استاد کے مکالمات کو تحریری شکل میں محفوظ کیا بلکہ سیموئیل نسنسن اور ولیم اے ڈی وٹ کے مطابق:

"افلاطون نے جو مکالمات لکھے اُن میں سے بہت سا حصہ سقراط کے اقوال کا ہے۔ سقراط نے خودکشی سے پہلے دوستوں سے جو گفتگو کی اس میں افلاطون موجود تھا۔"

کرائٹو اور فیڈو کے طویل مکالمات بھی تاریخ فلسفہ کا حصہ ہیں۔ کرائٹو سقراط کا شاگرد اور بچپن

کا دوست تھا۔ وہ دولت مند تھا سو اس نے داروغہ سے مل کر سقراط کو بھگا لے جانا چاہا لیکن اس کے لئے سقراط بالکل تیار نہ ہوا۔ اُس نے کرائٹو سے کہا کہ اگر تم مجھے قائل کر لو کہ میرا جیل سے بھاگ جانا صحیح قدم ہے تو میں یہ بھی کرنے کو تیار ہوں"۔ لیکن کرائٹو اسے قائل نہ کر سکا اور سقراط نے کرائٹو اور اس کے بیٹے سٹر وبولس (Citorobulu) کے سامنے زہر کا پیالہ نہایت جرأت مندی سے پیا۔ کرائٹو اور سقراط کی یہ پوری گفتگو ہمیں تاریخ کے اوراق میں ملتی ہے۔

فیڈو بھی سقراط کا شاگرد تھا۔ جسے کرائٹو نے خریدا تھا۔ وہ بھی اپنے مالک کی طرح سقراط کو اذیت کی زندگی اور اذیت کی موت سے چھٹکارا دلانا چاہتا تھا۔ ان دونوں استاد اور شاگرد کی گفتگو بھی ہمیں تحریری حالت میں ملتی ہے۔ سقراط آزادی فکر اور آزادی رائے کا بے حد علمبردار تھا مگر وہ جمہوری طرزِ حکومت کے چند ایک اصولوں سے سخت اختلاف رکھتا تھا۔ جس کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ جمہوری حکومت کے کچھ لیڈروں نے مذہبی پیشواؤں کے ساتھ مل کر سقراط کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کرایا تھا زیادہ افسوسناک امر یہ تھا کہ ایتھنز کے دوسرے فلاسفرز مثلاً ارسٹو فیز اور ایلسی بائی اویز کا استاد فارقلیس، کرائٹو، ایسکینز، ایپی جینس، انٹی فان تھیوس، ڈوٹائی ڈیز، تھیاسیز، اینٹوڈروس، ایڈی مانٹی، آپالو ڈورس اور ان جیسے بے شمار فلاسفر حالات کے ہاتھوں خوفزدہ ہو کر خاموشی سے بیٹھ گئے تھے۔ اس وقت اکیلا سقراط دکھائی دیتا ہے جو اختلاف رائے کی وجہ سے غیض وغضب کا شکار ہوا۔

۳۹۹ ق۔م میں ایتھنز کے حکام نے سقراط کے خلاف یہ الزام لگائے کہ وہ پرانے دیوتاؤں کی پروا نہیں کرتا۔ نئے دیوتاؤں کا تعارف کرا رہا ہے۔ نوجوانوں کے اخلاق کو خراب کر رہا ہے۔ نوجوانوں کو حکومت کے خلاف بغاوت پر اُکسا رہا ہے۔ مذہب میں اختراعات پیدا کر رہا ہے، وغیرہ وغیرہ

لیکن جب عدالت لگائی گئی تو سقراط نے اپنا مقدمہ خود لڑا اور تمام مخالفین کی زبانیں بند کر دیں۔ سقراط نے اپنی صفائی میں بہت کچھ کہا۔۔۔ دلائل پیش کیے لیکن معذرت کی نہ زندگی کی بھیک مانگی۔ عدالت میں اُس کی بات چیت ہماری تاریخ کا حصہ ہے۔ یہ گفتگو بڑی پُرمغز، فلسفیانہ اور اخلاقیات کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس سے ہم اس کی انصاف پسندی، جرأت، انا، سچائی اور ثابت قدمی

کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ آخر میں وہ عدالت کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

''میں نہ تو التجا کروں گا اور نہ ہی گڑگڑاؤں گا جو کہ روایتی انداز میں منصفوں اور ججوں کی حس انصاف کو بیدار کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کل کوئی یہ نہ کہے کہ سقراط تو عورت سے بھی چھوٹا ثابت ہوا۔ مجھ جیسے نامور اور شہرت رکھنے والے انسانوں کے ساتھ اکثر یہ المیہ رہتا ہے کہ ہمیں اپنی تکلیف کا اظہار ہی زیب نہیں دیتا۔ میں عدالت کے انصاف کو رحم یا بھیک خیال نہیں کرتا۔ انصاف اصولوں کا پابند ہوتا ہے۔ عہد یا حلف توڑنے کو کبھی پارسائی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ میں کبھی ان کاموں میں نہیں پڑتا جن میں مجھے اچھائی کی توقع نہ ہو۔ ''میرا مقام اور مرتبہ تمہارے معبدوں کے برابر ہے''۔ اس لئے کہ وہ تمہاری اصلاح کرتے ہیں اور میں بھی تمہاری اصلاح کرتا ہوں۔ میں اس بات پر مکمل ایمان رکھتا ہوں کہ میں حق پر ہوں۔ اب اگر میں موت کے خوف سے سچائی کے محاذ سے بھاگ جاؤں تو کیا عزت دار کہلاؤں گا؟ ایک اعلیٰ انسان کے لئے عزتِ نفس سب سے مقدم ہے۔ اگر موقف درست ہے تو زندگی کا خوف کیا معنی رکھتا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت ایک ثابت قدم انسان کو اس کی جگہ سے نہیں ہلا سکتی۔''

سقراط کو علم ہو گیا تھا کہ شاید حکومت کے ایماء پر عدالت یہ فیصلہ دے دے کہ ''اس مجرم کو ملک بدر کر دیا جائے۔'' لہٰذا اس نے فیصلہ سے قبل ہی اپنا فیصلہ سُنا دیا اور وہاں موجود افراد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں اگر موت کے خوف سے جلا وطنی قبول کر لوں تو ثابت ہو گا کہ میں زندہ رہنے کی خواہش میں اندھا ہو چکا ہوں۔ ہرگز نہیں۔۔۔۔ میں ایتھنز چھوڑ کر ہرگز نہیں جاؤں گا۔ میں صداقت کی موت مر کر ایتھنز میں دفن ہونا زیادہ پسند کروں گا۔''

سقراط نے جب اپنا فیصلہ سُنا دیا تو اُسے فوری طور پر جیل میں ڈال دینے کا حکم صادر کر دیا گیا اور ساتھ ہی اُس کی موت کا فیصلہ بھی۔ اس تجویز کے ساتھ کہ اسے زہر کا پیالہ پلایا جائے۔

سقراط نے اپنی زندگی کا آخری دن دوستوں سے باتیں کرنے میں گزارا۔ اسے جیل سے بھگا لے جانے کا منصوبہ بھی بنایا گیا جو اختصار سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ آخر کار شام کے وقت سقراط جیل کے دراوغہ کو آواز دیتا ہے کہ "لاؤ زہر کا پیالہ، ہم اپنا وصال چاہتے ہیں۔"

داروغہ جیل زہر کا پیالہ لاتا ہے۔ سقراط ہاتھ میں لے کر اُسے زمین پر رکھتے ہوئے داروغہ سے پوچھتا ہے:

"کیا اس مشروبِ اجل کے چند قطروں کو زمین پر گرا کر خدا کی نذر کیا جا سکتا ہے؟"

داروغہ جیل جواب دیتا ہے:

"ہم اس پیالے میں اتنا ہی زہر لاتے ہیں جتنا ایک انسان کو ختم کرنے کیلئے درکار ہوتا ہے۔"

سقراط دعا مانگنے کے بعد پیالہ اٹھا کر منہ سے لگا لیتا ہے اور خالی کر کے زمین پر رکھ دیتا ہے۔ پھر موت کی کوٹھڑی میں ٹہلنے لگتا ہے تا کہ زہر کا اثر جسم میں پھیل جائے۔ سقراط کا ایک شاگرد اپالوڈورس چیخ اٹھتا ہے۔ اُسے اور سقراط کی بیوی زینی تھپی کو باہر نکال دیا جاتا ہے۔ کرائٹو سے سقراط کہتا ہے:

"میں نے اسکلوپس کا ایک مرغ ادھار دینا ہے اس کو دے دینا۔"

اور پھر ابدی نیند سو جاتا ہے۔

سقراط کے خونِ ناحق سے اہلِ ایتھنز کو بعد میں سخت پشیمانی ہوئی اور اس کے دشمنوں کو نہایت ذلت کے ساتھ اپنی بے وقوفی اور عداوت کے خمیازے بھگتنے پڑے۔ سقراط کی سوانح عمری ذینوفن اور فلاطون (شاگردوں) نے لکھی اور دونوں نے اس کے اقوال کو علیحدہ علیحدہ ترتیب دیا۔ میں چاہوں گا کہ سقراط کے چند اقوال درج کر دوں تا کہ دانش کے اس خزانے سے چند موتی ہمارے حصے میں بھی آ جائیں۔

- عالی ظرف کی پہچان یہ ہے کہ دشمن کے ساتھ بھی معزز برتاؤ ہو۔ زیادہ سے زیادہ کوشش ہونی چاہیے کہ دشمن تکلیف سے محفوظ رہے۔
- اگر تم سمجھتے ہو کہ دشمن کو قتل کرنے سے تم انہیں اس بات سے باز رکھ سکو گے کہ وہ تمہیں تمہاری برائی پر ملامت نہ کریں تو یہ تمہاری بھول ہے۔ فرار کا یہ راستہ عزت کا راستہ نہیں ہے نہ ایسا کرنا ممکن ہے۔ سب سے آسان اور سہل طریقہ یہ ہے کہ دوسروں پر جبر و تشدد کرنے کی بجائے تم لوگ خود

اپنے آپ کی اصلاح کرو۔

o کسی قوم کا جب تک ایک بھی سورما باقی ہو اس کو شکست تسلیم نہیں کرنی چاہئے اور نہ ہی کسی جنگجو سورمے کو اپنی ممکنہ موت کے خطرے کے باعث اپنے فرائض سے فرار حاصل کرکے ذلت کی زندگی کو ترجیح دینی چاہئے۔

o حسد اور خوف دنیا میں فساد پیدا کرتا ہے۔

o اس شخص کو غنیمت جانو (خواہ اس کے ساتھ تمہارا کوئی بھی رشتہ ہو) جو تمہارے ہر قدم پر تنقید کرتا ہے۔۔۔ جو تمہیں ٹوکتا ہے۔۔۔ روکتا ہے۔۔۔ جو تمہارے روزمرہ کے کاروبار کی چھان بین کرتا ہے۔لہٰذا اس قسم کا روکنے ٹوکنے والا انسان تمہارے کام کی اصلاح کردے گا۔

o اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات کی ہر شے کو عقل کے معیار پر رکھو اور دلائل کی سطح پر جانچو۔مذہب اور زندگی کے بارے میں منطقی نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرو اور اس کائنات کی فکری صداقت تک پہنچنے کی سعی کرو۔

o فرض کرو تمہیں ایک شخص کا ایک مانگا ہوا ہتھیار (تلوار) واپس کرنا ہے اس اثنا میں وہ تمہارا دوست اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے۔تو اس صورت میں کیا یہ راست بازی ہوگی کہ تم اس کے پاگل پن کی حالت میں اس کا ہتھیار اس کو واپس کردو۔وہ تو اپنے پاگل پن کی حالت میں پورے شہر کی گردنیں تراش سکتا ہے۔

o خوف سے حاصل کیا گیا علم، علم نہیں کہلا سکتا۔اس لئے کہ علم خوف کی ضد ہے اور خوف علم کا دشمن ہے۔علم حاصل کرنے کیلئے ایک آزاد ماحول کا ہونا ضروری ہے۔

o میرے نزدیک دلاوری عقل کی کمان پر چڑھے ہوئے ایسے تیر کا نام ہے جس کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔لہٰذا میں دلاوری اور بہادری کو عقل کے بغیر ایک جنون، ایک وحشت اور ایک فتور خیال کرتا ہوں۔ہوسکتا ہے یہ فتور کبھی کامیاب بھی ہو جائے۔لہٰذا ان تمام باتوں سے ہم ایک ہی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دلاوری اور بہادری عقل کے بغیر ایک بیوقوفی اور حماقت ہے اس کے سوا اسے اور کوئی

نام نہیں دیا جا سکتا۔

- ایک موچی اس وقت تک موچی کہلانے کا حق نہیں رکھتا جب تک کہ وہ جوتا بنانے کا علم نہ رکھتا ہو۔ ایک لوہار اُس وقت تک لوہار نہیں کہلا سکتا جب تک کہ وہ فوجوں کے ہتھیار بنانے کا علم نہ رکھتا ہو یا شہریوں کی لوہے کی ضرورت کی چیزیں بنانے کے قابل نہ ہو۔ ایک ترکھان اس وقت تک ترکھان کہلانے کا حق نہیں رکھتا جب تک وہ ہل، مکان کے دروازے اور کشتی کے پشتے بنانے کے قابل نہ ہو جائے۔ پھر ہم کسی ایک ایسے شخص کو حکمران کس طرح بنا سکتے ہیں جب تک کہ وہ حکمرانی کے تمام علوم سے واقف نہ ہو۔

- حکمران کرپٹ نہ ہوں، موقع پرست نہ ہوں، چالاک نہ ہوں، عیار نہ ہوں، سفاک نہ ہوں، قاتل نہ ہوں، بدمزاج نہ ہوں، مغرور نہ ہوں، جھوٹی شہرت کے متوالے نہ ہوں، جعل ساز نہ ہوں۔ سیاست کیلئے بس ایک ہی شرط ہے کہ عوام کا شعور اس درجہ بلند ہو کہ اُن کا انتخاب کوئی دھوکا یا غلطی کا شکار نہ ہو سکے۔ اور اُن کی بنائی ہوئی حکومتیں اعلیٰ پایہ کے لوگوں پر مشتمل ہوں حقیقت کا علم رکھتی ہوں۔ لکیر کی فقیر نہ ہوں۔

استفادہ

۱۔ افاداتِ مہدی۔ ایم مہدی حسن (مرحوم) مرتبہ: مہدی بیگم۔ شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور۔ چہارم ۱۹۴۹ء

۲۔ سقراط۔ محمد اسلم گورداسپوری۔ ماہنامہ سپوتنک لاہور۔ جون ۱۹۹۸ء

۳۔ قتل کے چند تاریخی مقدمے۔ رحمان مذنب۔ جنگ پبلیشرز لاہور۔ ۱۹۹۷ء

۴۔ ہندو دھرم ہزار سال پہلے۔ ابو ریحان البیرونی (اردو ترجمہ) نگارشات میاں چیمبرز۔ ۳ ٹمپل روڈ لاہور۔ ۲۰۰۰ء

۵۔ رسالہ رہنما۔ لاہور۔ ۲۰ جون ۱۹۱۴ء

۶۔ Illustrated Minute Biographies. Samuel Nisenson & William A Dee witt. Grossery & Dunlop inc. New York 1949.

طارق بن عمر

منٹو کا اندازِ تحریر اور فطرت پسندی

''وہ سوچنے لگی کہ وہ کیوں چاہتی ہے کہ کوئی اس کی تعریف کرے۔اس سے پہلے اسے اس بات کی اتنی شدت سے ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔آج کیوں بے جان چیزوں کو بھی ایسی نظروں سے دیکھتی ہے جیسے ان پر اپنے اچھے ہونے کا احساس طاری کرنا چاہتی ہے۔اس کے جسم کا ذرہ ذرہ کیوں ماں بن رہا تھا۔۔۔وہ ماں بن کر دھرتی کی ہر شے کو اپنی گود میں لینے کیلئے کیوں تیار ہو رہی تھی؟۔۔۔اس کا جی کیوں چاہتا تھا کہ سامنے والے گیس کے آہنی کھمبے کے ساتھ چمٹ جائے اور اس کے سرد لوہے پر اپنے گال رکھ دے۔۔۔اپنے گرم گرم گال اور اس کی ساری سردی چوس لے۔'' (ہتک)

سعادت حسن منٹو نے اردو افسانہ نگاروں میں نہ صرف ایک منفرد مقام حاصل کیا بلکہ زندگی کا ایک ایسا رخ ہمارے سامنے پیش کیا۔جس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔زندگی کی سچائیوں کو انسان کم قبول کرتا ہے، اور اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ ان سچائیوں میں تلخی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے، جبکہ یہی رخ سعادت حسن منٹو کے نزدیک زندگی کی اصل سچائی ہے۔

''ڈاکٹر نے اسٹریچر پر پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھا اور اس کی نبض ٹٹولی اور سراج الدین سے کہا، کھڑکی کھول دو۔سکینہ کے مردہ جسم میں جنبش ہوئی، بے جان ہاتھوں سے اس نے ازار بند کھولا اور شلوار نیچے سرکا دی۔بوڑھا سراج الدین خاموشی سے چلایا، زندہ ہے۔۔میری بیٹی زندہ ہے ڈاکٹر سر سے پیر تک پسینے میں غرق ہو گیا۔''
(کھول دو)

سعادت حسن منٹو نے زندگی کے معمولی وغیر معمولی گوشوں کو ایک جداگانہ اندازِ نظر دیا۔انسان

کی کبھی بھی مخالفت نہیں کی، بلکہ انسان کے اندر اس کے مختلف روپ ہمیں دکھائے۔ منٹو نے انفرادی آزادی پر زور دیا۔ انسان کے ظاہری پہلو سے زیادہ اس میں چھپے ہوئے باطن سے منٹو کو دلچسپی تھی، کیونکہ انسان کا عمل اس میں پوشیدہ ہوتا ہے۔

"اب وہ بالکل تنہا تھی۔ جتنے نوکر تھے اس نے علیحدہ کردیئے۔ ڈرائیور سمیت۔ اس کے بچے کے لئے اس نے آیا رکھ دی۔۔۔ کوئی بوجھ سوائے اس کے خیالوں کے باقی نہ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ آہستہ سے ان سے بھی چھٹکارا مل جائے۔ کبھی کبھار اگر کوئی اس سے ملنے آتا تو وہ اندر سے چلا اٹھتی، چلے جاؤ۔۔۔ جو کوئی بھی تم ہو چلے جاؤ۔۔۔ جو کوئی بھی تم ہو چلے جاؤ۔۔۔ میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی۔"

(پھندنے)

اگر ہم سعادت حسن منٹو کے افسانوں کو مطالعہ کریں تو ہمیں ان افسانوں میں دو چیزیں نمایاں نظر آئیں گی۔ ایک اختتام بڑا منفرد اور چونکا دینے والا ہوگا، دوسرا سماجی گرفت مکمل طور سے حاوی ہوگی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کا اختتام بھی منفرد اور چونکا دینے والا ہوتا ہے، اور انسان ساری زندگی سماجی کشمکش میں گرفتار رہتا ہے۔ منٹو نے کبھی اس بات کی طرف توجہ نہیں دی کہ ان کا افسانہ کسی کی تسکین کا باعث بنے، زندگی کے جبر کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔ اسی وجہ سے منٹو اکثر بغاوت پر آمادہ نظر آتے تھے وہ چاہتے تھے کہ زندگی کے ہر معاملہ میں حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے۔ زندگی میں ترتیب ہو۔ منٹو پر ایک عام الزام یہ لگایا گیا کہ ان کے بعض افسانوں میں عریانی و فحاشی کا عنصر نمایاں اور حاوی ہوتا ہے۔ لیکن منٹو کہتے ہیں کہ کیا ہم زندگی اور معاشرے سے ان کرداروں کو جدا کر سکتے ہیں۔ یہ کردار تو ہمارے معاشرے اور زندگی کا حصہ ہیں۔ یہ بھی احساسات اور فکر رکھتے ہیں۔ منٹو کے یہاں ایسے کرداروں میں احترامیت پائی جاتی ہے۔ کیا ہم فطری خواہش سے انکار کر سکتے ہیں، یقیناً نہیں۔ تو پھر ہمیں اسے کھلے دل سے قبول کرنا چاہئے۔

"سوگندھی تجھے پسند نہیں کیا! اسے۔۔۔ اسے۔۔۔ صرف میری شکل ہی پسند نہیں

آئی ۔۔۔نہیں آئی تو کیا ہوا؟۔۔۔ مجھے بھی تو کئی آدمیوں کی شکل پسند نہیں آتی ۔۔۔وہ جو اماوس کی رات کو آیا تھا کتنی بری صورت تھی اس کی ۔۔۔ کیا میں نے ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی؟ جب وہ میرے ساتھ سونے لگا تھا، مجھے گھن نہیں آئی تھی؟۔۔۔کیا مجھے ابکائی آتے آتے نہیں رک گئی تھی؟ ۔۔۔ ٹھیک ہے ۔پر سوگندھی ۔۔۔ تو نے اسے دھتکارا نہیں تھا۔تو نے اسے ٹھکرایا نہیں تھا ۔۔۔اس موٹر والے سیٹھ نے تو تیرے منہ پر تھوکا ہے۔۔ادنہہ۔۔اس ادنہہ کا اور مطلب ہی کیا ہے؟ ۔۔۔ یہی کہ اس چھچھوندر کے سر میں چنبلی کا تیل ۔۔ اور ۔۔۔یہ منہ اور مسور کی دال ۔۔۔ارے رام لال تو یہ چھپکلی کہاں سے پکڑ کر کے آیا ہے ۔۔۔اس لونڈیا کی اتنی تعریف کر رہا ہے تو ۔۔۔دس روپے اور یہ عورت ۔۔۔خچر کیا بری ہے ۔۔۔سوگندھی سوچ رہی تھی اور اس کے پیر کے انگوٹھے سے لے کر چوٹی تک گرم لہریں دوڑ رہی تھیں۔'' (ہتک)

سعادت حسن منٹو نے جنس کو صرف ظاہری پہلو سے نہیں دیکھا بلکہ اس کے باطن میں جھانکا ۔جنس کو بدن سے نہ لو بلکہ اس میں چھپا ہوا وہ کرب محسوس کرو جس کا تعلق ہماری اپنی ذات سے ہے۔اس سماجی نظر پر ،نظر رکھو جو زندگی کی جدو جہد کا اظہار کرتی ہے۔منٹو نے ہمیشہ زندگی میں بناوٹ کی مخالفت کی ۔ایسی بناوٹ جو انسان کو پستیوں میں لے جاتی ہے اور انسان اس بناوٹ سے سمجھتا ہے کہ وہ بلندیوں پر پرواز کر رہا ہے۔دنیا میں اونچی اونچی عالیشان کوٹھیوں میں رہنے والوں کی نسبت منٹو نے اک طوائف کے کوٹھے کو پسند کیا ہے، کیونکہ اس کے خیال میں فرد کو جہاں سے سچائی ملے اسی جگہ کو پسند کرنا چاہئے۔ایسے ایسے گوشے ڈھونڈے جن تک عام نظروں کی رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ان ہی گوشوں سے ایسے کردار بھی سامنے لائے جن کے بارے میں عام حالات میں کبھی خیال تک نہ جاتا ہو۔پھر ان کرداروں کو بڑے ہی اہتمام سے ہمارے سامنے پیش کیا۔ان کی برائیوں میں اچھائیاں نکالیں۔ان کی نفسیاتی کیفیات کو اجاگر کیا۔انہیں معاشرہ اور زندگی کا حصہ قرار دیا۔انہیں اس صورت میں پیش کیا کہ وہ جبر کی کیفیت سے نکل

جائیں اور آزادیٔ اظہار کو سمجھیں۔

''میں نے پوچھا، آپ کو بچے پسند نہیں؟

وہ مسکرائی پسند ہیں۔ لیکن کون پالتا پھرے۔

میں نے کہا۔ آپ کو معلوم ہے اس طرح بچے ضائع کرنا جرم ہے۔

وہ ایک دم سنجیدہ ہوگئی۔ پھر اس نے مسرت بھرے لہجے میں کہا، مجھ سے عزیز صاحب نے بھی یہی کہا تھا لیکن سعادت صاحب میں پوچھتی ہوں اس میں جرم کی کون سی بات ہے؟ اپنی ہی تو چیز ہے اور قانون بنانے والوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ بچہ ضائع کراتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے۔'' (جانکی)

''صاحب ہماری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آتا، اور اگر وہ اس سے ضرورت سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کرتے تو وہ ان کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیتی تھی۔ وہ حیرت میں اس کے منہ کی طرف دیکھتے۔ تو وہ ان سے کہتی، صاحب تم ایک دم الو کا پٹھا ہے۔ حرام زادہ ہے۔ سمجھا، یہ کہتے وقت وہ اپنے لہجے میں سختی پیدا نہ کرتی، بلکہ بڑے پیار کے ساتھ ان سے باتیں کرتی۔ یہ گورے ہنس دیتے اور ہنستے وقت وہ سلطانہ کو بالکل الو کے پٹھے دکھائی دیتے''۔ (کالی شلوار)

سعادت حسن منٹو کو ہم سے کہیں زیادہ زندگی سے پیار تھا۔ وہ زندگی کو سمجھانا چاہتا تھا اور سمجھنا چاہتا تھا۔ اس کے افسانے پڑھنے کے بعد ہمارے سامنے حقیقت یعنی زندگی کی حقیقت کچھ بدل سی جاتی ہے۔ منٹو کا کوئی سا بھی افسانہ لیں اس پورے افسانے میں کہیں نہ کہیں کوئی ایسی بات ضرور ہوگی، جو یقیناً پڑھنے والے کو متاثر کر دے گی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ منٹو نے اس آوارگی میں بھی صداقت کو دکھایا ہے۔ اس نے ساری زندگی اس بات کی کوشش کی کہ فرد کو ہر جذبہ ہر احساس چاہئے۔ چاہے وہ کتنا ہی چھوٹا واقعہ ہو دراصل یہی زندگی کا پیمانہ ہے۔ منٹو کے نزدیک ہر احساس اپنے اندر دلچسپی لئے ہوئے ہوتا ہے۔ بات صرف اتنی ہوتی ہے کہ اسے صرف ترتیب دیا جائے۔ پروفیسر سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

"منٹو نے اپنے افسانوں میں سیدھے سادے روزمرہ کی بول چال کے جملوں سے ایسی مثالوں اور تشبیہوں سے جو دوسروں کی نظر میں بالکل حقیر اور بے حیثیت ہیں اور ایسے چلتے ہوئے فقروں سے جن میں سنجیدگی و متانت کا شائبہ تک نہیں ہوتا، گہری سے گہری، سنجیدہ سے سنجیدہ اور موثر سے موثر بات کہنے کا کام لیا ہے اور ہر جگہ اس سادگی اور عمومیت کو تصور آفریں، فکر انگیز اور خیال افروز بنایا ہے۔ منٹو نے جو کچھ کہا ہے اس میں آورد نام کو نہیں، ایک ایسی آمد ہے جو شخصیت کے زور اور اس کے بے لوث خلوص کی مظہر ہے۔ ایسے تیروں کی منٹو کے ترکش میں کوئی کمی نہیں۔ بیشمار تشبیہوں میں سے چند پر نظر ڈال کر اندازہ لگایئے کہ منٹو کا ہمہ رنگ اور ہمہ صفت فن ان تشبیہوں سے کب کب اور کس کس طرح کام لیتا ہے۔"

ان کے لال جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو۔" (نیا قانون)

سعادت حسن منٹو کا ہر افسانہ ایک نفسیاتی اور جذباتی حیثیت رکھتا ہے، اسی نفسیات اور جذبات کے ساتھ منٹو کے افسانے منفرد نظر آتے ہیں۔ منٹو کو فطرت سے پیار رہا ہے۔ کیونکہ فطرت میں ہی زندگی چھپی ہوئی ہوتی ہے، اسی فطرت سے منٹو نے انفرادیت اور عظمت پیدا کی۔ ہم نے منٹو کے افسانے میں تین بنیادی اجزاء کی بات کی، نفسیات، جذبات اور فطرت:

"وہ دن گذر گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ اب نیا قانون ہے میاں، نیا قانون اور بے چارہ گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بے وقوفوں کی مانند کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔"

استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ نیا قانون، نیا قانون، چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔ نیا قانون، نیا قانون، کیا بک رہے ہو۔۔۔۔ قانون وہی ہے پرانا!

اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔" (نیا قانون)

"اِدھر اُدھر سے کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا۔ اوندھے منہ لیٹا تھا۔ اِدھر خار دار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا۔۔۔ اُدھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان۔ درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔"

"وہ حنا کی خوشبو میں اس بو کو تلاش کر رہا تھا جو انہیں دنوں میں جب کہ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے بارش میں نہا رہے تھے، اس گھاٹن لڑکی کے میلے بدن سے آئی تھی"۔ (بو)

زندگی کی تصویر کشی منٹو نے بہت بے باکی سے کی ہے۔ سعادت حسن منٹو نے بری سے بری چیز میں بھی خوبی کو تلاش کیا۔ اس نے کبھی بھی سنسنی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ کوشش کی کبھی ایک عام چیز کو ایک منفرد انداز میں پیش کیا جائے۔ ہمیں سعادت حسن منٹو کی اندازِ تحریر اور سوچ میں بہت کچھ ملتا ہے۔

"ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا"

سہ ماہی "الاقرباء" کے زیرِ نظر شمارے کی اشاعت میں اس بار بوجوہ غیر معمولی تاخیر ہو گئی ہے جس کے باعث ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے محترم قارئین کو زحمتِ انتظار سے دوچار ہونا پڑا۔ ہمیں امید ہے کہ اس کوتاہی پر ہماری معذرت قبول کر لی جائے گی۔ شکریہ (ادارہ)

نوید ظفر

روہتاس، ٹیلہ جوگیاں، جہلم

راولپنڈی سے جہلم جاتے ہوئے تقریباً ساٹھ کلومیٹر پر سوہاوہ کا چھوٹا سا شہر آتا ہے۔سوہاوہ کی اہمیت قدیم دور میں دھمیک کے حوالے سے تھی، جو یہاں سے اب دس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔قدیم دور میں دھمیک اُس شاہراہ کا حصہ تھا، جسے شیر شاہ سوری نے جرنیلی سڑک میں منتقل کیا۔تاہم انگریز دور میں دھمیک اصل شاہراہ سے کٹ جانے کی وجہ سے اپنی تاریخی اہمیت کھو بیٹھا۔

دھمیک کی اصل وجہ شہرت شہاب الدین محمد غوری کی جائے شہادت کے حوالے سے ہے، ۱۵ مارچ ۱۲۱۰ء کو شہاب الدین محمد غوری ملتان سے واپسی پر غزنی جاتے ہوئے دھمیک کے مقام پر شہید ہوا اور کچھ عرصہ کے لیے امانتاً دفن کیا گیا۔بعد میں محمد غوری کے جسدِ خاکی کو غزنی کے نواح میں غور کے مقام پر لے جا کر دفن کیا گیا۔تاریخ وفات اس قطع سے نکالی گئی:

شہادتِ ملکِ بحروبر معزالدین	کز ابتدائے جہاں مثل او نیاید یک،
سوم زغرۂ شعبان، بسالِ شش صد و دوم	فتادہ در رہِ غزنیں بہ منزل دھمیک۔

دھمیک کے مقام پر وہ قبر جہاں شہاب الدین غوری کچھ دنوں تک امانتاً دفن رہا، کچھ برس پہلے تک اپنی ابتدائی شکل میں محفوظ رہی، نامور سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے اس قبر پر ایک عالیشان مقبرہ تعمیر کروایا ہے، ڈاکٹر قدیر خان کا بیان ہے کہ ان کے ایک بزرگ شہاب الدین محمد غوری کی فوج میں شریک تھے، اس حوالے سے محمد غوری کے مقبرے کی تعمیر کر کے انہوں نے اپنے بزرگوں کا قرض اتارا ہے۔

شہاب الدین کی قبر پر لوحِ مزار جنرل شیر علی خان کا تحریر کردہ ہے، جس پر تاریخ نومبر ۱۹۸۴ کندہ ہے، لوحِ مزار کے مطابق شہاب الدین کی شہادت کا ذمہ دار ایک اسمٰعیلی فدائی کو قرار دیا گیا ہے۔

لوحِ مزار پر چھ اشعار درج ہیں۔

ہندوستاں میں سطوتِ اسلام کا نقیب — وہ پیکرِ شجاعت وسلطان ذی وقار
تھی جس کے ساتھ خواجہء اجمیر کی دعا — جس تیغ زن کا حامی وناصر تھا کردگار
جس نے ملایا خاک میں کفار کا گھمنڈ — آخر ہوا جو جنگِ ترائیں میں کامگار
دے کر شکست رائے پتھورا چوہان کو — جیتا تھا اس غیور نے میدانِ کارزار
بجتا تھا جس کے نام کا ڈنکا جہان میں — اس نامور کی باقی ہے بس اب یہ یادگار
اپنے بھی جس کو بھول گئے تھوڑی دیر میں — وہ غازی دفن ہے اسی مٹی کے ڈھیر میں

شہاب الدین محمد غوری کی ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں بہت واضح اہمیت ہے، اس نے ترائین کی دوسری جنگ میں ہندوؤں کو فیصلہ کن شکست دے کر دہلی میں اپنے غلام قطب الدین ایبک کو مقامی حکمران نامزد کیا تھا۔ قطب الدین ایبک پہلا مسلمان حکمران تھا جو دہلی کے تخت پر بیٹھا اور جس کی بدولت دہلی ہندوستان کا دارالحکومت قرار پایا۔ شہاب الدین محمد غوری کا دارالحکومت کا انتخاب گذشتہ آٹھ سو برس سے قائم ہے اور دہلی آج بھی ہندوستان کا دارالحکومت ہے۔

سوہاوہ سے بیس کلومیٹر کے فاصلے پر دینہ کا شہر آباد ہے، جرنیلی سڑک پر دینہ کا شہر، مغل عہد کے ایک پٹواری آدینہ بیگ نے آباد کروایا تھا۔ آدینہ بیگ پٹواری کے عہدے سے ترقی کر کے گورنر کے عہدے تک پہنچے تھے، اور دو شہر آباد کیے، ایک آدینہ، اور ایک آدینہ نگر جو اب ہندوستان میں ہے، آدینہ کا شہر اب مقامی آبادی میں کثرتِ استعمال کے سبب دینہ کے نام سے مشہور ہے۔

دینہ کی اہمیت دو حوالوں سے ہے، اس کے مشرق میں سات کلومیٹر کے فاصلے پر روہتاس کا تاریخی قلعہ ہے۔ جب کہ اس کے مغرب میں میر پور کا شہر آباد ہے، جہاں دریائے جہلم پر بند باندھ کر منگلا ڈیم تعمیر کیا گیا ہے۔ میر پور شہر اب آزاد کشمیر کا حصہ ہے۔

روہتاس کا تاریخی قلعہ شیر شاہ سوری نے ۱۵۴۲ء میں تعمیر کروایا تھا، تاکہ وہ علاقے میں گکھڑوں کی طاقت کا مقابلہ کر سکے۔ ۱۵۴۰ء میں جب شیر شاہ سوری نے دہلی کا تخت سنبھالا تو گکھڑوں نے مغل فرمانروا ہمایوں کا ساتھ دینے کا اعلان کیا تھا، اور روات کے قلعہ میں گکھڑ بادشاہ سلطان سارنگ کو

فیصلہ کن شکست کے باوجود، گکھڑوں نے ہمایوں کی حمایت جاری رکھی اور شیر شاہ سوری کے خلاف بغاوت میں مصروف رہے، چنانچہ روہتاس کا قلعہ تعمیر کر کے، شیر شاہ سوری نے گکھڑوں کے قلب میں اپنا ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا اور کہا کہ میں نے مغلوں کے قلب میں اپنا خنجر اتار دیا ہے۔

۔روہتاس کا قلعہ چار کلومیٹر مربع علاقہ میں پھیلا ہوا ہے، اس کی دیواریں تیس فٹ تک چوڑی ہیں اور ستر فٹ تک بلند ہیں، قلعہ کی تعمیر کا انتظام مالیات کے وزیر ٹوڈرمل کھتری کے سپرد تھا، جس نے بعد میں مغل حکمران اکبر کے عہد میں نورتن ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ گکھڑوں نے اس قلعہ کی تعمیر رکوانے کے لیے سرتوڑ کوشش کی اور جو تعمیر دن بھر میں ہوتی، اسے رات کو آ کر خراب کر جاتے۔ تاہم بعد میں کام کی رفتار تیز کرنے کے لیے ٹوڈرمل نے ایک اینٹ لگانے کی اجرت ایک اشرفی مقرر کی، تو گکھڑ اشرفیوں کے لالچ میں خود مزدوری کے لیے تیار ہو گئے اور قلعہ کی تعمیر تیزی سے تکمیل کی طرف پہنچی۔

قلعہ کے بارہ دروازے ہیں، جن کے نام سہیل گیٹ، شاہ چاندولی گیٹ، کابلی گیٹ، شیشی گیٹ، لنگر خانی گیٹ، طلاقی گیٹ، موری گیٹ، خواص خانی گیٹ، ٹلہ موری گیٹ، گٹالی گیٹ، پیپل والا گیٹ اور سر گیٹ ہیں۔ ان میں سے ہر گیٹ کے بارے میں مختلف کہانیاں مشہور ہیں جو بوجوہ یہاں بیان نہیں کی جا سکتیں۔ قلعہ کے اندر دو باؤلیاں کابلی گیٹ اور ٹلہ موری گیٹ کے نزدیک اچھی حالت میں موجود ہیں۔ باؤلی اس کنوئیں کو کہتے ہیں، جس کی ایک دیوار توڑ کر سیڑھیاں بنادی جائیں، تاکہ پانی پینے کے لیے لوگ سیڑھیوں سے اتر کر پانی کی سطح تک پہنچ سکیں۔ پانی کی سطح تک پہنچتے پہنچتے درجہ حرارت بہت کم رہ جاتا ہے اور گرمیوں میں بھی خنکی محسوس ہوتی ہے۔ باؤلی شیر شاہ سوری کا خصوصی فنِ تعمیر تھا۔ جرنیلی سڑک کی تعمیر کے دوران اس نے ہر گیارہ میل کے فاصلے پر ایک سرائے ایک مسجد اور ایک باؤلی تعمیر کروائی۔ ان میں سے اکثر باؤلیاں آج بھی موجود ہیں۔ قلعہ کی دیگر عمارات میں شاہی مسجد، ایک ہندو مندر اور شاہ چاندولی گیٹ کے قریب مان سنگھ کی حویلی کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ قلعہ کے اندر علاقہ کی قدیم آبادی کو رہائش کے لیے جگہ دی گئی تھی۔ چنانچہ آج بھی پانچ ہزار کے قریب افراد قلعہ میں آباد ہیں۔ ہمایوں بادشاہ نے ہندوستان پر دوبارہ قبضہ کرنے کے بعد رہتاس کا دورہ کیا اور روہتاس کے قلعہ پر توپ

کے دو گولے داغے، جو اس کی طرف سے شیر شاہ کی تعمیر تباہ کرنے کے مترادف تھا۔ تاہم قلعہ کی مضبوطی کے پیشِ نظر اس نے قلعہ کو مکمل تباہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ہمایوں کی توپوں کا شکار ہونے والی روہتاس کی دیوار کے آثار آج بھی موجود ہیں۔

جرنیلی سڑک سے روہتاس قلعہ کا رابطہ کہان ندی کے سبب انگریزی دور میں منقطع ہو گیا تھا۔ لیکن اب حکومتِ پاکستان نے کہان ندی پر پل تعمیر کر دیا ہے، جس سے روہتاس کا علاقہ ایک دفعہ پھر ماضی کی گم نامی سے نکل کر منظرِ عام پر آ گیا ہے۔ روہتاس قلعہ کے باہر ۲۰ کلو میٹر کے فاصلے پر ۳۲۴۲ فٹ اونچے ٹیلے پر ٹلہ جوگیاں کا قدیم اور تاریخی مقام ہے، الیگزنڈر کننگھم کی تحقیق کے مطابق یہ ٹیلہ سورج دیوتا کی پوجا کے لیے قدیم دور سے وقف تھا۔ اور اس کی بلندی کے سبب اسے ٹیلہ بالا ناتھ، یعنی ہندوؤں کا اونچا ٹیلہ کہا جاتا تھا، جو وقت گزرنے کے ساتھ صرف ٹیلہ یا ٹلہ رہ گیا۔ ایک زمانے میں یہاں تمام ہندوستان کے جوگی اکٹھے ہوتے تھے، جس کے سبب سے اس مقام کو ٹیلہ جوگیاں بھی کہا جانے لگا۔

ٹیلہ جوگیاں میں ہندوؤں کے بہت سے قدیم مندروں اور تالابوں کے آثار پائے جاتے ہیں، مغل حکمران اکبر نے ۱۵۸۱ء میں اس مقام کا دورہ کیا۔ ابوالفضل نے اکبر کے دورے کا ذکر کرتے ہوئے اپنے روزنامچے میں درج کیا ہے کہ یہ مقام اتنا قدیم ہے کہ اس کی اصل تاریخ کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ بعد میں مغل بادشاہ جہانگیر نے اپریل ۱۶۰۷ء میں ٹیلہ جوگیاں کا دورہ کیا۔

ٹیلہ جوگیاں کا ایک تعلق رومانوی داستان کے مشہور کردار رانجھا کے ساتھ بھی ہے، جو ہیر کے عشق میں، دیوانگی کے عالم میں جوگی بن گیا تھا اور اپنی زندگی ٹیلہ جوگیاں پر گزارنے کے لیے تیار ہو گیا تھا تاہم بعد میں حالات بدلے اور وہ واپس ہیر کی تلاش میں جھنگ چلا گیا تھا۔

ٹیلہ جوگیاں کی خوشگوار آب و ہوا کے پیشِ نظر ۱۸۸۰ میں جہلم کے ڈپٹی کمشنر نے گرمیوں میں اپنا دفتر ٹیلہ جوگیاں لے جانے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۴۷ میں پاکستان قائم ہو جانے کے بعد جوگیوں نے ٹیلہ جوگیاں سے رُخصت اختیار کی اور اب یہ ٹیلہ اپنے قدیم آثار کے ساتھ سیاحوں کا منتظر رہتا ہے۔

دریائے جہلم کے کنارے جرنیلی سڑک پر سب سے اہم شہر کا نام بھی جہلم ہے، جہلم کی تاریخ

بھی بہت قدیم ہے، اس کا حوالہ ہندوؤں کی مقدس کتاب مہابھارت میں بھی موجود ہے۔ سکندر نے اسی شہر کے قریب اپنا بحری بیڑہ تیار کر کے دریا عبور کیا تھا۔ سکھوں نے اپنے عہد حکومت میں یہاں ایک قلعہ تعمیر کیا تھا جس کا نام اندرکوٹ رکھا گیا، تاہم اب اس قلعہ کے آثار نہیں ملتے۔

ایک زمانے میں نمک کی تجارت کے حوالے سے جہلم شہر نے خصوصی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ ۱۸۹۴ میں ریل کے لیے دریائے جہلم پر جہلم کے مقام پر ایک میل طویل پل تعمیر ہوا تھا، جو اس دور میں دنیا کے بڑے پلوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ دریا کے کنارے ایک مسجد اور ایک گرجا گھر جہلم شہر کی شناخت تصور کیے جاتے ہیں۔ جہلم شہر میں تعلیمی ادارے، بنک، ہسپتال ہوٹل اور صنعتی مراکز وسیع تعداد میں ہیں۔ اور اردگرد دیہات کے لوگ یہاں روزگار کی تلاش میں یک جا ہوتے ہیں۔ مشہور مزاح نگار شاعر سید ضمیر جعفری کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا۔

خاکہ

سید محمد مہدی (جامعہ ملیہ دہلی)

تال میں تال بھوپال تال.....

بات اُس بھوپال کی ہے جو شاید اب نہیں ہے یا اگر ہے تو وہ نہ ہوگا جو کبھی تھا۔ شاید کا لفظ اس لئے کہ جب سے بھوپال سے ''ترک وطن'' کیا تب سے اُدھر جانے کی ہمت ہوئی' نہ موقع ملا اور اس واقعہ کی مدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب بھوپال سے رخصت ہوا تھا اس وقت وہ ریاست بھوپال کی راجدھانی تھا نہ کہ اس مدھیہ پردیش کی جو ابھی وجود میں بھی نہ آیا تھا۔ ممکن ہے بھوپال اب بھی خوبصورت ہو بلکہ شاید پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو پہلے سے بہتر ہو۔ لیکن میں تو اچھے برے کی بات نہیں کر رہا۔ میں تو صرف اس بھوپال کا ذکر کر رہا ہوں جو کبھی وطن ثانی تھا۔ ہمارے مزاج کی یہ عجیب افتاد ہے کہ جب تک اپنے وطن میں رہتے ہیں دوسرے مقام بڑے دلفریب معلوم ہوتے ہیں اور جب وطن چھوڑ کے دور دراز جا بستے ہیں تو وطن بے طرح یاد آتا ہے۔ حافظہ ہزار چیریں اور صورتیں اور واقعات یاد دلاتا ہے' سینکڑوں چیزیں اور چہرے ایجاد کر کے یادوں کو دل گداز بنا دیتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ شک وشبہ کی ایک آواز بار بار کانوں میں آتی رہتی ہے کہ دیکھو اگر اُدھر پھر رُخ کروگے تو بہت ممکن ہے درد کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے۔ کسی دریا میں کوئی دوبارہ نہیں اُتر سکتا۔ ممکن ہے نیا پرانے سے بہتر ہو لیکن تم تو پرانے کی تلاش میں جا رہے ہو اس لئے دکھ ہی دکھ اٹھاؤ گے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں پھر بھوپال نہ جا سکا۔

میرا ایک بھانجا ہے سعید نقوی۔ مشہور جرنلسٹ ہے' ایک بار بھوپال گیا اور واپسی پر مجھے ایک قصہ سنایا۔ کہنے لگا بھوپال میں ہندی کا ایک بڑا اخبار ہے۔ میں اس کے دفتر میں بیٹھا کچھ لوگوں سے باتیں کر رہا تھا۔ ان لوگوں میں ایک صاحب تھے جو بھوپال ہی کے رہنے والے تھے۔ باتوں باتوں میں میں نے کہا کہ میرے نانا بھی بھوپال میں رہتے تھے۔ پوچھا کہاں' کس محلے میں؟ میں نے کہا بدھوارے میں۔ کیا نام تھا آپ کے نانا کا؟ سید محمد عسکری' بھوپال صاحب ہنس پڑے۔ کہنے لگے جس عمارت میں

آپ بیٹھے ہوئے ہیں یہ عسکری صاحب ہی کا مکان تھا۔ جب وہ یہ قصہ سنا چکا تو میں نے کہا میاں تم نے کہا نہیں کہ اس عمارت پر میرا ابھی حق ہے۔ تم وہیں پیدا ہوئے تھے اور اسی گھر میں تمہاری نال گڑی ہے۔

ہمارا مکان دو منزلہ تھا۔ اخبار کی عمارت کئی منزل کی ہے اور شاید زیادہ نظر فریب ہو۔ یقین ہے کہ اُس میں تمام ماڈرن سہولتیں بھی موجود ہوں گی۔ لیکن وہ میرا گھر تو نہ ہوگا جس کے کشادہ صحن کے ایک کونے میں میری ماں نے انار کا ایک درخت لگایا تھا' جہاں جوش' فراق' ساغر' احسان دانش' حفیظ' شوکت تھانوی اور دوسروں کے شعر سنے تھے اور جہاں میری سیاسی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ مجھے احساس ہے کہ ہر مکان کو شرف اس کے مکینوں سے حاصل ہوتا ہے۔ جب وہ مکین نہ رہے تو اس مکان کو لے کر کیا کرو گے۔ لیکن منطق سے دل مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ تو وہی گھر ڈھونڈھتا ہے جس کے در و دیوار نے کبھی تحفظ اور اپنائیت کا احساس دلاتا تھا۔ ہاں وہ بھوپال یاد بہت آتا ہے اور میں سوچتا ہوں کہ یادوں کا یہ شیش محل اگر برقرار رہے اور میرے جذبات کی دنیا کے کسی ایک گوشے میں جگمگاتا رہے تو نقصان کیا ہے۔

قدرت نے بہت دل لگا کر اس بستی کو سنوارا تھا۔ پہاڑ' جنگل' چھوٹے بڑے تالاب' آبشار' سبزہ زار۔ موسم میں اعتدال۔ نہ زیادہ گرمی نہ زیادہ سردی۔ موسم گرما میں دن گرم بھی ہوئے تو مالوے کی راتیں ارے توبہ! برسات میں ہوائیں ایسی ٹھنڈی کہ کمبل اوڑھ کر سوئیے۔ اور بڑے تالاب کی کیا بات ہے۔ حد نظر تک پانی ہی پانی۔ ایک بار بیگم بھوپال کے ماموں سند امیاں بمبئی گئے۔ وہاں سمندر دیکھا تو حیرت سے بولے "قسم قرآن کی میاں یہ تو اپنے بڑے تالاب سے بھی بڑا معلوم ہو رہا ہے۔" دوسری طرف شملہ کوٹھی کی طرف چلئے تو چڑھائی ہے کہ ختم ہونے کو نہیں آتی' کوئی کہاں تک سائیکل چلا سکتا ہے۔ منوا بھانڈا کی ٹیکری کی طرف نکلے تو سائیکل نے ڈھلوان پر وہ فراٹے بھرے کہ لگتا تھا کہ اب گرے کہ اب گرے۔ واپسی میں مقابلہ ہو رہا ہے کہ اس چڑھائی کو سائیکل پر کون سر کر سکتا ہے۔ بہت کم تھے جو کارنامہ انجام دے سکتے تھے۔

شہر بہ کر شہر پناہ کے باہر پھیل چکا تھا۔ لیکن فصیلیں اور دروازے باقی تھے اور شہر کو اس کا کردار اور اس کی شخصیت بخشتے تھے۔ سنا ہے فصیلیں توڑ دی گئیں۔ دروازے بھی گئے۔ دنیا کے تمام شہر پھیل رہے ہیں

اور پھیلتے رہتے ہیں لیکن کوشش یہ ہوتی ہے کہ پرانی یادگاروں اور ان چیزوں کو برقرار رکھا جائے جن سے شہر پہچانا جاتا ہے۔ معلوم نہیں اب بھوپال کی پہچان کیا ہے۔

شائد جمعہ اور سنیچر کو ہفتے کے تمام دنوں کے نام سے محلے آباد تھے۔ اتوارہ، پیر دروازہ، منگل وارہ، بدھ وار، جمعراتی۔ ہم بدھوارے میں رہتے تھے۔ والد وکالت کرتے تھے۔ رہنے والے تھے یوپی کے ضلع رائے بریلی کے ایک قصبے مصطفےٰ آباد کے لیکن بھوپال میں آباد ہو گئے تھے۔ سربرآوردہ لوگوں میں تھے، سب ہی لوگ جانتے اور مانتے تھے۔ آزاد خیال تھے۔ سرسید کے ماننے والوں میں تھے اسی لئے نیچری مشہور ہو گئے تھے۔ داڑھی کبھی رکھی نہیں۔ انگریزی لباس کے شوقین تھے، میز کرسی پر چھری کانٹے سے کھانا کھاتے تھے۔ جہاں شادی مت کرو۔ ہماری نانی بارہ بنکی کے ایک بڑے تعلقدار کی اکلوتی اولاد تھیں۔ باپ نے عربی فارسی اردو، حکمت حساب کتاب سب ہی کچھ پڑھایا کہ آگے چل کر تعلقہ سنبھالیں گی۔ چار بیٹیوں کی ماں تھیں لیکن چوتھی کے پیدا ہوتے ہوتے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ خود پڑھی لکھی خاتون تھیں تو اپنی بیٹیوں کو بھی پڑھایا۔ جب لوگوں نے انہیں جا جا کے سمجھانے کی کوشش کی کہ آپ کے ہونے والے داماد انگریزی تعلیم ہی کے نہیں عورتوں کی تعلیم کے بھی حمایتی ہیں اس لئے اپنی بیٹی کی شادی وہاں کیجئے تو یہ بات ان کی سمجھ میں آئی نہیں۔ چنانچہ شادی ہوئی۔ اکبرالہ آبادی سے والد کے دوستانہ تعلقات تھے۔ انہیں ساری خبریں مل رہی تھیں۔ جب شادی ہو گئی تو ایک قطعہ لکھ کر والد کو بھیجا:

بیوی کہتی ہے بھلا پاس میں آنے دوں گی ۔۔۔ بے نماز تو کیا ہاتھ لگانے دوں گی

ساس کہتی ہے میں پڑھواؤں گی سمجھا کے نماز ۔۔۔ ایسے مسٹر کو بھلا ہاتھ سے جانے دوں گی

ذکر اکبرالہ آبادی کا آ گیا تو دو ایک باتیں اور یاد آ گئیں۔ والد نے کبھی اردو کے لئے کوئی انجمن بنائی ہو گی یا کوئی تجویز اکبر کو لکھ کر بھیجی ہو گی۔ جواب آیا:

جس کو کہو یعنی جیسا کہو، تس کری یعنی ہم ویسا ہی کریں۔

گھر میں فارسی اردو انگریزی کتابیں خاصی تعداد میں تھیں مگر ہماری توجہ کا مرکز اندنوں اودھ پنچ بنا ہوا تھا۔ والد اس کے خریدار تھے اور غالباً کسی قلمی نام سے کبھی کبھی اس میں لکھتے بھی تھے۔ اودھ پنچ

کے گرد لکھنے والوں کا جو حلقہ تھا اس کے بیشتر اہل قلم سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے ظریف لکھنوی کا مجموعہ کلام جوان کے انتقال کے بعد ان کے بڑے بھائی مولانا صفی لکھنوی نے دیوانجی کے نام سے شائع کیا۔ اس میں کئی جگہ والد کا ذکر ہے۔

ہم نے والد سے کبھی یہ پوچھنے کی ہمت نہ کی کہ کیا آپ بھی اس رسالے کے لئے لکھتے ہیں۔ اب جو سوچتا ہوں تو اس کی وجہ کچھ کچھ سمجھ میں آتی ہے۔ اودھ پنچ میں شوخ مضامین اور نظموں کے علاوہ کچھ کوک شاستر قسم کی کتابوں اور امساک کی دواؤں کے اشتہار بھی چھپا کرتے تھے۔ اور بات ذرا واضح طور پر سمجھائی جاتی تھی۔ کبھی کبھی اس قسم کے کچھ شوخ مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ چنانچہ ہمارے ذہن میں یہ بات جم گئی کہ دراصل یہ رسالہ ایسا نہیں ہے کہ ہم کھلم کھلا اسے پڑھا کریں۔ گھر میں اودھ پنچ کی فائلیں بہت تھیں۔ والد صاحب جب کچہری چلے جاتے تو ان کے خالی دفتر میں ہم ہوتے اور یہ فائلیں۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ اس رسالے نے میرے دل میں انگریزی راج کی خلاف بغاوت کا جذبہ بھی بیدار کیا۔ اس کی دو جلدیں کرم خوردہ حالت میں آج بھی میرے پاس ہیں اور کبھی کبھی انہیں الٹ پلٹ کر دیکھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانے میں ایسے اچھے کارٹون بنانے والے اس نے کس طرح جمع کر لئے تھے۔ انگریزی حکومت پر ایسی گہری چوٹیں بعد میں کسی کارٹونسٹ کے یہاں نظر نہیں آئیں۔

بھوپال میں ایک پرائمری سکول تھا اور کچھ دنوں وہاں ہم نے پڑھا۔ وہاں کی دو باتیں آج تک یاد ہیں۔ حساب یعنی ریاضی میں ہم اتنے کمزور تھے کہ اسی اسکول کے ایک ماسٹر گھر پر حساب پڑھانے کیلئے رکھ لئے گئے۔ بڑی محنت کی بیچارے نے یہاں تک کہ امتحان سے قبل حساب کے وہ تمام سوال حل کروا دیئے۔ جو دوسرے دن امتحان میں آنے والے تھے۔ اُدھر اُن کو یہ اطمینان کہ اب تو یہ پورا پرچہ حل ہی کر لے گا اور یہاں یہ حال کہ گنتی دیکھ کر ہی سر چکراتا تھا۔ خدا معلوم ریاضی کو مجھ سے کس دن کا بیر تھا کہ کبھی ہاتھ نہ آئی۔ وہ دن اور آج کا دن دو اور دو چار کے آگے نہ پڑھ سکا۔ اور اب جبکہ کچھ ریاضی دانوں نے یہ انکشاف کیا ہے کہ دو اور دو چار ہونا ضروری نہیں تو دل کو ایک گونہ اطمینان ہوا کہ ہم نے کچھ

زیادہ ریاضی سیکھ لی ہوتی اور آج وہ سب مشتبہ یا غلط ثابت ہوتی تو اس علم رائیگاں کا احسان کون چکاتا!

ریاضی کے یہی استاد اسکاوٹ ماسٹر بھی تھے اور ہمیں اسکول کی اگر چیز سب سے اچھی لگتی تھی تو وہ تھی اسکاؤٹنگ۔ خاکی نیکر خاکی قمیصیں گھٹنوں تک موزے، سر پر صافہ (پگڑی) کاندھوں پر دونوں طرف بنی ہوئی ڈوریاں، ہاتھ میں لاٹھی، جیب میں سیٹی۔ کبھی فرسٹ ایڈ کی تربیت ہورہی ہے۔ اگر کسی کا ہاتھ ٹوٹ جائے تو فوری طور پر کیا کرنا چاہئے۔ خون بہت بہے تو کیا ترکیب کرنی ضروری ہے۔ اپنے کاندھے کی ضرورری ہے۔ اپنے کاندھے کی ڈوری کھولو، گلے سے اسکارف نکالو۔ ریف ناٹ اس طرح لگائی جاتی ہے۔ مریض کو اس طرح اٹھایا جاتا ہے۔ کبھی منوا بھانڈ کی ٹیکری پر چڑھائی ہورہی ہے۔ کبھی بھد بھدا چلے جارہے ہیں کہ، ہاں باٹیاں پکائی جائیں گی اور گوٹ ہوگی (ایک مرتبہ پلیٹس کی انگلش ہندوستانی ڈکشنری ہندوستانی ڈکشنری اٹھا کے دیکھا تو پکنک کے لئے یہی بھوپال کا ہمارا مانوس لفظ گوٹ نظر آیا تو نہ پوچھئے کتنا اچھا لگا)

معلوم نہیں نواب حمید اللہ خاں نے سیاسی داؤں پیچ کہاں سے سیکھے تھے۔ کیونکہ اس میدان میں خاصی مہارت حاصل کرلی تھی۔ ان کی ایک خصوصیت تو یہ تھی کہ پڑھے لکھے ماڈرن خیالات کے انسان تھے اور یہ بات انہیں دوسرے راجاؤں اور نوابوں سے الگ کرتی تھی اور شائد اسی لئے وہ مدت تک رجواڑوں کے ایوان کے صدر رہے اور اس رشتے سے ہر وائسرے سے دوستانہ تعلقات رہے۔ خلافت تحریک کے رہنماؤں سے تعلقات پیدا کئے۔ مولانا محمد علی کے داماد شعیب قریشی کو وزارت تعلیم سپرد کر دی، جنگ بلقان میں میڈیکل مشن کے معروف ڈاکٹ کرنل عبدالرحمٰن کو اپنا معالج خاص اور حمیدیہ اسپتال کا سربراہ بنا کر بھوپال بلالیا۔ ملک میں کانگرس کا زور تھا لیکن بھوپال میں کانگرس کے نام سے چند سیٹھ ساہوکار تھے اور ان سب کو نواب کی سرپرستی حاصل تھی۔ ہندوستان کے سبق شنکر دیال شرما کا تعلق بھی ایسے ہی ایک خاندان سے تھا۔ انہیں نواب نے وظیفہ دے کر تعلیم کے لئے لندن بھیج دیا۔ گاندھی جی سے براہ راست رشتہ قائم کرکے انہیں بھوپال بلایا۔ جب سروجنی نائڈو کی بیٹی پدمجا بیمار ہوئیں تو نواب نے انہیں بھوپال بلایا، محل کے اندر ایک مکان میں ٹھہرایا۔ یہاں ڈاکٹر عبدالرحمٰن نے پدمجا کا علاج کیا۔ جب نواب

کے بھتیجوں سعید الظفر اور رشید الظفر سے نواب کی مقدمہ بازی ہوئی تو نواب نے محمد علی جناح کو اپنا وکیل مقرر کیا۔ جناح صاحب اس سلسلے میں کئی بار بھوپال آئے اور نواب کے مہمان رہے۔ دوسرے راجہ اور نواب عام طور پر عیاشی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ حمید اللہ خان ان سے بالکل الگ تھے۔ علی گڑھ کے قیام نے ان میں وسعت نظر پیدا کی تھی اور پڑھے لکھے مہذب لوگوں سے تعلقات پیدا کرنے کا موقع بھی دیا تھا۔ اسی بناء پر سرسید کے پوتے راس مسعود کو بھوپال بلا کر اپنا مشیر مقرر کیا اور راس مسعود کے ذریعہ علامہ اقبال کو مہمان بنا کر شیش محل میں ٹھہرایا۔

نواب کی سالگرہ کے موقع پر ایک مشاعرے کی بنیاد بھی پڑ گئی۔ مشاعرے کی ذمہ داری ہمارے والد کے سر آئی۔ جوش اور ساغر سے پہلے ہی سے دوستانہ تعلقات تھے۔ اب حفیظ جالندھری، فراق، جگر احسان دانش وغیرہ سے بھی تعلقات پیدا ہوئے۔ ان تمام شاعروں کو میں نے سب سے پہلے اپنے گھر پر ہی سنا۔ جگر صاحب کے ساتھ کچھ بدمزگی ہو گئی تھی اس لئے وہ کبھی گھر نہیں آئے۔ ہوا یہ کہ رشید الظفر خاں کے یہاں ایک محفل میں میر انیس کا ذکر چھڑ گیا تو جگر صاحب نے کہا کہ جی ہاں ناظم اچھے تھے۔ ہمارے والد فردوسی اور انیس کو خدائے سخن سمجھتے تھے۔ حافظہ غضب کا تھا اس لئے دونوں کے بے شمار اشعار یاد تھے۔ جگر کی بات سن کر غصہ آ گیا اور وہیں بیٹھ کر ایک ہجو کہہ ڈالی اور وہیں سنا دی جس میں جگر پر اس طرح کی چوٹیں کی گئی تھیں کہ تم انیس کا کلام کیا سمجھو کہ ٹھرا نہ باشد اور کرگھانہ باشد وغیرہ، جگر صاحب نے بہت کہا کہ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی لیکن تعلقات میں گرہ پڑ گئی۔

ان دنوں شعر ترنم سے پڑھے جانے کا رواج عام تھا۔ جگر صاحب کے ترنم میں ایک خاص ادا تھی۔ آواز کثرت شراب نوشی کی وجہ سے پھٹ گئی تھی لیکن جگر کے ترنم میں یہی آواز جادو جگاتی تھی۔ حفیظ جالندھری تو خیر کلاسیکی موسیقی کے رموز سے واقف تھے۔ عام طور پر وہ کسی نہ کسی راگنی کا سہارا لیتے تھے اور واقعی خوب پڑھتے تھے۔ بیچ بیچ میں فقرے بازی بھی ہوتی جاتی تھی۔ احسان دانش، روش صدیقی، شعری بھوپالی، ساغر نظامی سب ہی نے ترنم سے شعر پڑھنے کا انداز ایجاد کیا تھا۔ رہ گئے فراق گورکھپوری تو ان کا ایک واقعہ سن لیجئے۔ بھوپال کے ایک مشاعرے میں جب فراق صاحب کو دعوت سخن دی گئی تو

انہوں نے حسب معمول تحت اللفظ میں غزل سنانی شروع کی۔ لوگ ان کے تحت اللفظ جھیلنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ایک شور ایک ہنگامہ۔ جگر صاحب کھڑے ہوئے، فراق صاحب کے شاعرانہ مقام پر روشنی ڈالی اور لوگوں سے اپیل کی کہ انہیں سنیں لیکن پھر وہی شور وہی ہنگامہ۔ آخر جگر صاحب نے روش صدیقی سے درخواست کی کہ وہ فراق کی غزل ترنم سے سنائیں تب جا کر شور ختم ہوا۔ جوش ملیح آبادی کی بات الگ تھی۔ وہ اپنی بھاری بھرکم شخصیت اپنی آواز کی گھن گرج اور شعر کی ادائیگی کے ذریعہ رنگ جما دیتے تھے۔

بھوپال کے لوگ نواب حمید اللہ خاں سے خوش نہیں تھے۔ ریاست میں بڑے اور اہم عہدوں پر ان لوگوں کو بیٹھا دیا گیا تھا جنہیں نواب نے ذاتی تعلقات یا سیاسی مصلحت کے تحت بھوپال بلا لیا تھا۔ بھوپالیوں کے لئے رہ گئی صف کلرکی۔ اسٹیٹ پیپلز کانفرنس نے سب سے پہلے بھوپالی اور غیر بھوپالی کے سوال پر تحریک چلائی۔ شاکر علی خاں اس تحریک کے سب سے بڑے رہنما تھے۔ شاکر علی خاں کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ اگر کوئی ان پر تنقید کرے تو اس پر سنجیدگی سے غور کرتے تھے اور اپنی غلطی کو تسلیم بھی کرتے تھے۔ جلد ہی انہوں نے بھوپالی کے سوال کو ترک کیا اور بھوپال میں منتخب ذمہ دار حکومت کا مطالبہ اپنایا۔ پنڈت جواہر لال نہرو ریاستوں میں عوامی تحریکوں کی ہمت افزائی کرتے تھے اور اسٹیٹ پیپلز کانفرنس یا پر جالمنڈل کے صدر بھی تھے۔ شاکر علی خاں عوام میں جتنے مقبول ہوتے گئے جواہر لال نہرو کے اتنے قریب ہوتے گئے۔ ایک زمانہ وہ بھی آیا جب دیسی رجواڑوں کے عوامی لیڈروں میں پنڈت نہرو کے قریب ترین سمجھے جاتے تھے عبداللہ اور شاکر علی خاں۔ شیخ صاحب بڑے لیڈر تھے، عوام میں بہت مقبول تھے لیکن بھوپال واحد ریاست تھی جہاں کا فرمانروا بھی اور اس کے خلاف تحریک چلانے والا لیڈر بھی مسلمان تھا اور اس کی تائید اور حمایت کرنے والے بھی مسلمان تھے۔

شاکر علی خاں انتہائی دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ سادگی پسند، منکسر مزاج، نئی چیزیں سیکھنے پر ہمیشہ تیار گفتگو کے ماہر۔ جس محفل میں بیٹھ جائیں اسے دلچسپ حکایتوں سے زعفران زار بنا دیں اُن کے قہقہوں کی آواز دور تک سنائی دیتی تھی۔ سیاست دانوں کے درمیان بیٹھیں گے تو سیاسی لطیفے، دہلی میں مولوی سمیع اللہ کی دوکان پر بیٹھیں گے تو ان ہی کے مذاق لطیفے، آہستہ آہستہ کانگریس سے مایوس ہوتے

گئے، آخر کار کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے اور اس پارٹی کے ٹکٹ پر اسمبلی کا الیکشن لڑتے اور جیتتے رہے۔ اسمبلی کی طرف سے جو گھر بھوپال میں ملا تھا وہ ایک طرح سے کمیونسٹ پارٹی کا دفتر باہر سے آنے والے کمیونسٹوں کے لئے مہمان خانہ بن گیا۔ شادی انہوں نے کی نہیں۔ زمین پر جہاں جگہ ملی لیٹ کے سو گئے۔ سردیوں میں ایک کمبل ساتھ رہتا تھا۔ رات کو اوڑھنے کے کام آتا تھا اور دن میں سوئٹر یا کوٹ کی جگہ استعمال ہوتا تھا۔ ان کے احباب اور شناساؤں کا حلقہ بہت وسیع تھا جس میں سیاسی لوگ بھی تھے غیر سیاسی لوگ بھی، مولوی بھی تھے اور پنڈت بھی شاعر بھی تھے اور شاعری سے دور کا بھی لگاؤ نہ رکھنے والے بھی۔ بس شرط یہ تھی آدمی خوش مزاج ہو، دوسروں کے علاوہ اپنے اوپر بھی ہنس سکے۔ اور ہنستے ہنساتے یہ شخص دنیا سے سدھار گیا۔

بھوپال پٹھانوں کی بستی تھی۔ اسے آباد بھی پٹھانوں ہی نے کیا تھا۔ بھوپال کے پٹھان دریادل، خوش مزاج، ہنسوڑ، لطیفے باز ایک طرف ہاکی اور کرکٹ کے شوقین تو دوسری طرف بٹیر بازی مرغ بازی اور کئی اور بازیوں کے دلدادہ جن کا ذکر صرف مردانے میں ہوتا تھا۔ عام طور پر گھروں اور دوکانوں کے آگے سرخ پتھر کی سلیں نکلی رہتی تھیں جنہیں پٹیا کہتے تھے۔ ان پر پیر لٹکا کر اطمینان سے بیٹھ جاتے اور گپ مارتے۔ اس کو کہتے تھے پٹیا پالٹکس۔ کہتے ہیں ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ ادھر محل میں کوئی فیصلہ ہوا اور اس فیصلے کی اطلاع گھڑ سوار پیامبر کے ہاتھ ریذی ڈنٹ کو بھیجی گئی ادھر پٹیوں پر بیٹھے ہوئے حضرات کو ساری اطلاع مل گئی اور حکومت کا خفیہ فیصلہ پٹیوں پر گپ کا موضوع بن گیا۔ یہ خبر اڑتے اڑتے نواب سلطان جہاں بیگم کے کان تک پہنچی، انہیں اعتبار نہ آیا۔ آخر آزمائش کے طور پر ایک دن گھڑ سوار کو سادہ کاغذ کا لفافہ دے کر ریذیڈنٹ کی کوٹھی کی طرف روانہ کیا۔ ادھر یہ پیک صبا خرام خالی لفافہ لئے بازار کے چوراہے سے گزرا ادھر پٹیوں پر بیٹھے گٹکا کھاتے ہوئے خان صاحبان نے قہقہہ لگایا اور بولے "کیوں خان آج تو صرف ہوائی گھوڑے دوڑائے جا رہے ہیں"۔

بدھوارے میں ابراہیم سائکل والے کی دوکان کی پٹیا پر دو آدمی پیر لٹکائے بیٹھے ہیں۔ آپ ادھر سے جب بھی گزریں۔ دونوں یہیں ملیں گے۔ ایک صاحب بہت وجیہہ، گھنگھریالی بال، بڑی بڑی

آنکھیں، کلین شیو بدن پر شیروانی چہرے پر سنجیدگی۔ آپ کی تعریف؟ مجو میاں کہتے ہیں زمینداری سے گھر بیٹھے آمدنی ہو جاتی ہے۔ کچھ کرنے کو نہیں تو ابراہیم سائکل والے کی دوکان پر کیوں نہ بیٹھیں کہ یہ شاہراہ پر واقع ہے اور اس طرح آنے جانے والے لوگوں سے علیک سلیک کا موقع فراہم کرتی ہے۔ دوسرے صاحب کا حلیہ ان سے بالکل مختلف ہے۔ منہ پر خشخشی داڑھی کچھ سفید کچھ کالی، منہ میں گٹکا، انگلی میں چونا، سڑک پر ہر آنے جانے والے سے کبھی صاحب سلامت کبھی چھیڑ چھاڑ۔ آپ کا اسم شریف؟ مجھے اجو حرامی کہتے ہیں۔ وہ تو بے تکلفی سے کہہ گئے لیکن آپ شرما گئے۔

اس جوان عورت کا نام ہے پراکی۔ گورا رنگ کٹورہ جیسی آنکھیں۔ موتی جیسے چمکتے ہوئے دانت لہنگے اور چولی میں ملبوس جن کا رنگ انتہائی شوخ۔ ماتھے پر بڑی سی بندی سر سے پاؤں تک چاندی کے زیور میں لدی پھندی سڑک پر پیدل چلتی کسی بھی گھر کے اندر جا سکتی ہے۔ اسے کوئی چھیڑتا نہیں۔ کوئی ہاتھ نہیں لگاتا۔ وہ جہاں بھی جائے محفوظ ہے۔ دماغی مریض ہے لیکن ایسی کہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتی۔ ہمارے گھر میں آتی ہے اور والدہ کے پاس بیٹھ کر خوب ہنستی ہے خوب باتیں کرتی ہے۔ بتاتی ہے کہ آج نواب صاحب کی موٹر روک کر میں نے ان سے یہ کہا اور انہوں نے یہ جواب دیا۔ نواب کو اس نے بھائی بنایا ہے۔ رکشا بندھن پر ان کے راکھی ضرور باندھتی ہے۔ کسی نے اگر پریشان کیا تو نواب کو اس نے بھائی بنایا ہے۔ رکشا بندھن پر ان کے راکھی ضرور باندھتی ہے۔ کسی نے اگر پریشان کیا تو نواب سے شکایت کر دیتی ہے شائد اسی لئے کوئی نہیں چھیڑتا۔ کسی کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے جو بھوپال کے قریب کسی گاؤں میں آباد ہے۔ معلوم نہیں بھوپال اب بھی نوجوان لڑکیوں کے لئے اتنا ہی محفوظ ہے کہ نہیں۔

اور یہ ہیں بنے خاں۔ فلم والے بنے خاں بھوپالی نہیں بلکہ سچ مچ کے بنے خاں۔ درمیانہ قد، چھریرا بدن منہ پر خشخشی داڑھی۔ پولیس میں ملازم ہیں۔ ہاکی میں فل بیک کھیلتے ہیں اولمپک کے لئے ہاکی کی جو ٹیم منتخب کی گئی ہے اس میں یہ بھی شامل ہیں۔ بھوپال کے کئی ہاکی کھلاڑیوں نے نام پیدا کیا۔ منیر اور شکور بھوپال سے علی گڑھ چلے گئے تھے اور پھر غالباً دھیان چند کی ٹیم کے ساتھ اولمپک کھیلنے بھی گئے تھے۔ میں نے ان دونوں کو اور بنے خاں کو بھوپال میں اور دھیان چند کو مئو میں کھیلتے دیکھا تھا۔ ان لوگوں نے

ہاکی کے کھیل کو آرٹ بنا دیا تھا۔ جو آج کی یورپی اسٹائل ہاکی کے کھیل سے بالکل مختلف تھی۔

بنّے خاں ننگے پاؤں کھیلتے تھے۔ جب اولمپکس کی بات چلی تو ان کے سامنے پہلی پریشانی کی بات کو یہ آئی کہ انہیں جوتے پہن کر کھیلنا پڑے گا جو ان کے لئے خاصا وقت طلب اور تکلیف دہ معاملہ تھا۔ لیکن جس چیز کی وجہ سے انہوں نے اولمپکس میں کھیلنے سے انکار کر دیا وہ یہ تھی کہ ''ارے خاں وہاں اگر سور کھلا دیا تو؟'' لوگوں نے سمجھایا کہ خاں صاحب وہاں سور کے علاوہ اور چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ ہندوستانی ٹیم میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو گوشت کو ہاتھ نہیں لگاتے تم بھی وہی کھانا۔ لیکن بنے خاں کو یقین تھا کہ ملک سے باہر گئے تو ایمان ضرور خراب ہوگا۔ چنانچہ نہیں گئے لوگ کہتے تھے کہ دراصل وہ ڈرتے اس بات سے تھے کہ اگر جہاز ڈوب گیا تو کیا ہوگا۔

ہمارے گھر سے کچھ دور ایک پرانی دقیانوسی قسم کی حویلی تھی۔ اس کے پھاٹک میں داخل ہوئے تو ایک بہت بڑا سا کمرہ نظر آئے گا۔ یہاں کئی لوگ کرسیوں اور بینچوں پر بیٹھے ہوئے ہیں ایک طرف ایک بڑا سا پلنگ ہے جس پر ایک عظیم الجثہ بزرگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ گل مچھے اور پٹوں نے ان کے سر اور منہ کو اور بھی بڑا بنا دیا ہے۔ ہاتھ میں ایک بٹیر ہے اور منہ میں کاکن۔ بٹیر کو منہ کے قریب لے جاتے ہیں تو بٹیر ان کے منہ سے کاکن چگ لیتی ہے۔ یہ ہیں سدّا میاں بیگم بھوپال کے ماموں ان کے بارے میں طرح طرح کے قصے مشہور ہیں۔ ایک مرتبہ اپنے ڈرائیور سے کہ گاڑی نکالو ہمیں باہر جانا ہے۔ وہ بولا میاں گاڑی ذرا خراب ہوگئی ہے اسے ٹھیک کرنا ہے۔ بولے تو ٹھیک کرو۔ کہنے لگا میاں اسکرو ڈرائیور کے بغیر گاڑی ٹھیک نہیں ہو سکتی اور اسکرو ڈرائیور ہے نہیں۔ سدا میاں بگڑ گئے۔ بولے ''قسم قرآن کی کہ میاں ایک تو ڈرائیور اور اوپر سے سکرو ڈرائیور بھی رکھو یہ کیا بات ہوئی''۔

چند زندہ دلان بھوپال نے ایک تنظیم بنائی تھی جس کا نام تھا ''انجمن گھلا''، یعنی کاہلوں کی انجمن۔ یہ وہ لوگ تھے جو زندگی کی تگ و دو میں اتنے الجھے رہتے تھے کہ کچھ دیر مل بیٹھ کر دلچسپ باتیں کرنے کا موقع انہیں کم ہی کم ملتا تھا۔ جب کبھی موقع ملا ایک جمع ہو گئے چائے شربت حقے پان کے دور چلتے رہے۔ شعر و شاعری ہوتی رہی۔ گپ ہوتی رہی۔ اس انجمن کی بس ایک ہی شرط تھی کہ لیٹا ہوا شخص

بیٹھے ہوئے کو بیٹھا ہوا شخص کھڑے ہوئے کو کوئی بھی کام کرنے کا حکم دے سکتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ لوگ کمرے میں لیٹے لیٹے داخل ہوتے تھے۔ ہمارے بزرگ دوست شاکر علی خاں بھی اس محفل میں شرکت کرتے تھے اور اگر جگر مراد آبادی شہر میں ہوئے تو وہ بھی ضرور آتے تھے۔ ایک مرتبہ اراکین فرش پر دراز تھے۔ حقے کا دور چل رہا تھا۔ ایک صاحب نے حقہ اپنی طرف کھینچا تو چلم ان صاحب پر الٹ گئی کچھ انگارے شیروانی پر پڑے۔ شیروانی جلنے لگی لیکن وہ حضرت اسی طرح لیٹے رہے۔ آخر ایک صاحب سے یہ خوفناک منظر دیکھا نہ گیا۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور زور سے چیخے ''ارے میاں کیا گھر میں آگ لگاؤ گے'' جن صاحب کی شیروانی جل رہی تھی اطمینان سے بولے ''اب آپ اٹھ گئے ہیں تو ذرا شیروانی کی آگ بجھایئے۔ دوڑ کے پانی لایئے'' اور ان کو یہ خدمت انجام دینی پڑی۔

بھوپال میں ایک اردو اخبار شائع ہوتا تھا ''ندیم''۔ اس کے بانی اور مدیر تھے حکیم قمر الحسن۔ حکیم صاحب بھوپال کے شفا خانے میں بڑے حکیم بھی تھے اور اخبار کے ایڈیٹر بھی حکیم بھی بہت اچھے تھے اور ایڈیٹر بھی جب بھی زکام کھانسی نے پریشان کیا حکیم صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ ان کے بیٹے بدر الحسن علی گڑھ میڈیکل کالج میں پروفیسر تھے۔ دلچسپ شخصیت کے مالک تھے ایک صاحب جنہوں نے اپنا نام رکھا تھا خان عبدالغفار خاں۔ پستہ قد دبلے پتلے۔ سر پر مختصر سا صافہ، بغل میں کاغذوں کا ایک پلندہ سارے شہر میں پیدل پھرا کرتے تھے۔ اردو میں دو ایک ابتدائی کتابیں پڑھ رکھی تھیں اور بس۔ ایک اخبار کے ایڈیٹر تھے جو مختلف ناموں سے کبھی کبھی جلوہ دکھلا جاتا تھا۔ کہیں سے کوئی اسکنڈل ہاتھ آ گیا تو خاں صاحب نے اخبار چھاپ دیا۔ اخبار کیا تھا چیتھڑا تھا۔ جس کے متعلق اسکینڈل شائع کرتے تھے وہ ان کی پٹائی کر دیتا یا کچھ پیسے دے دیتا اور یہ خاموش ہو جاتے۔

بھوپالی پٹھانوں میں اس وقت قبائلی زندگی کی سادگی اور جمہوریت کے عناصر باقی تھے۔ ممکن ہے اس کی وجہ بڑی حد تک خود کفیل زندگی ہی ہو۔ شادیاں عام طور پر مسجدوں میں ہوتی تھیں۔ لڑکی کے گھر برات لے جانے کا رواج نہیں تھا لیکن عام طور پر وہ بھی قبائلی انداز میں۔ دستر خوان بچھا دیا گیا اور بہت بڑی بڑی سینیوں میں پلاؤ لا کر رکھ دیا گیا۔ ہر سینی کے گرد چار آدمی کھانے بیٹھ گئے۔ تھوڑا پلاؤ اپنی طرف

سرکایا تھوڑی بورانی ملائی کھانا شروع ہوگیا۔

نچلے طبقے میں طلاق اور خلع کا رواج عام تھا۔عورت کو پورا حق حاصل تھا کہ وہ خلع کے لئے عدالت سے رجوع کرے۔والد کے پاس ایسے مقدمے بہت آتے تھے کہ عورت نے خلع کی درخواست دی اور اعلان کر دیا کہ مہر میں نے معاف کیا۔بس مجھے خلع دلوادو ظالم مرد سے پیچھا چھوٹے۔

مذہبی معاملات یا انفرادی پسند ناپسند کے متعلق عام لوگوں کے رویہ میں کٹر پن یا کوتاہ نظری بالکل نہیں تھی۔سلطانیہ گرلز اسکول کی پرنسپل اور بہت سی استانیاں عیسائی تھیں۔زنانہ اسپتال میں تو عیسائی ڈاکٹرانیوں اور عیسائی نرسوں کے علاوہ کوئی اور تھا ہی نہیں۔شیعہ سنی اختلافات سے اہل بھوپال زیادہ واقف نہیں تھے۔اس کی وجہ شاید یہ تھی بھوپال میں صرف دو یا تین خاندان شیعوں کے تھے۔مسعود نامی علی گڑھ یونیورسٹی کے تعلق سے اپنے زمانے کے مشہور انسان تھے جن کی شہرت کی وجہ ان کی مشہور معروف شرارتیں تھیں۔ہمارے گھر کے قریب ہی رہتے تھے۔ایک دن ہمارے گھر آئے۔ان دنوں لکھنؤ میں شیعوں کی طرف سے تبرا اور سنیوں کی طرف سے مدح صحابہ کے جھگڑوں کی شہرت تھی۔مسعود نامی نے بھی کہیں سے اڑتی خبر سن لی تھی۔والد سے بہت معصومیت سے پوچھنے لگے کیوں صاحب تبرّا کے کیا معنیٰ ہے؟

شیعہ گھروں میں ایک گھر ہمارا تھا۔اسکول میں جب لڑکوں کو پتہ چلا کہ ہمارا تعلق شیعہ گھرانے سے ہے تو گویا ہمیں چڑھانے کے لئے دو ایک دن ایک شعر پڑھا گیا جو ہمیں آج تک یاد ہے:

کربلا میں بیر بوی بکریاں سے چر گئیں   کھٹملو ماتم کرو شیعوں کی نانی مر گئیں

کچھ دوست اس دنیا سے کوچ کر چکے۔ایک تھے گھرو میاں کوئی ساڑھے چھ فٹ کا قد چوڑی ہڈیا خالص بھوپالی لب ولہجہ پیٹ کے خاطر درزی کی دکان کھول لی تھی لیکن تن من دھن سے کمیونسٹ پارٹی کی خدمت کرنا اپنا فرض اولین سمجھتے تھے۔شاعر بھی تھے انقلابی نظمیں کہتے تھے۔

یہ ہیں محمد علی تاج۔ان سے اس وقت ملاقات ہوئی جب ہم لکھنؤ سے اور پھر بمبئی سے بھوپال آیا جایا کرتے تھے۔ان کے ہونٹوں پر اور آنکھوں میں ہمیشہ ہنسی مچلتی رہتی تھی۔بذلہ سنج،ہنسوڑ بقراط قسم کے انتہائی بددماغ قسم کے،عالموں کا مذاق اڑا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل۔انتہائی حساس شاعر اور

شاعری میں دور دور تک مزاح یا ہنسی کا پتہ نہیں۔ دراصل یہ ظاہری بشاشت اور بذلہ سنجی اس کرب اور پریشانی کا پردہ تھا جو شائد ان کا مقدر بن چکی تھی۔ مالی پریشانیوں نے کبھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا شاعری میں کسی کو استدانہ بنایا۔ جو کچھ حاصل کیا اپنی ذہانت اور اپنی محنت سے حاصل کیا۔ ہمارے لڑکپن میں بھوپال میں غزل کے دو مستند نام تھے شعری بھوپالی اور باسط بھوپالی اس نسل کے بعد دو نام اور چمکے: تاج اور اختر سعید۔ تاج کے دو ایک شعر سن لیجئے تو اندازہ ہو جائے گا کہ غزل کے مزاج پر اس کی گرفت کتنی مضبوط تھی۔

شرِ تیشہ سے روشن ہے کہستانِ حیات رگِ ہر سنگ میں اک رو ہے تمناؤں کی
اب چاند ہے ہاتھوں میں سن اے لیلیٔ گیتی ہم تیرے لئے تجھ سے بھی آگے نکل آئے

خاکہ

عبدالحمید اعظمی

شامی پیر

اسے اتفاق کہوں یا حسنِ اتفاق کہ میرے پھوپھی زاد اور ہم جماعت پروفیسر فیضان احمد جو زیر تعمیر گومل یونیورسٹی کے پروجیکٹ ڈائریکٹر اور رجسٹرار تھے میرے یہاں مقیم تھے۔ شام ہم لوگ خنک موسم کا لطف اٹھا رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اٹھایا تو ایک نئی بلکہ بالکل ہی اجنبی آواز نے السلام علیکم کہا اور پروفیسر فیضان کو پوچھا۔ فیضان نے فون لیا اور نہایت ادب سے جی ہاں۔ بہت اچھا جیسے الفاظ دہراتے رہے۔ فون ختم ہوا تو میں نے پوچھا۔ کس کا فون تھا بولے نواب صاحب کا۔ یہ برائے نام نواب صاحب ہیں۔ بولے نہیں یہ تو ہمارے وائس چانسلر ہیں اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے نواب ہیں۔ کہہ کیا رہے تھے۔ وہ لاہور جا رہے ہیں کل صبح یہاں آئیں گے۔ ضروری کام نمٹائیں گے۔ میں نے کہا خدا خیر کرے۔ میرے یہاں تو سفید پوش اور دلق پوش گدڑی کے لعل ہی آتے ہیں۔ نواب پہلی بار آرہے ہیں۔ آخران کی خاطر تواضع بھی تو ضروری ہے یہ نہ ہو کہ تواضع میں کمی کی وجہ سے وہ تمہیں خاطر ہی میں نہ لائیں۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اچھا کیا جو نواب صاحب کو گھر کا پتہ نہ بتایا۔ جی نہیں انہوں نے کہا میں صبح اسلام آباد پہنچ کر پتہ معلوم کراونگا۔ چلو یہ تو اچھا ہوا۔ پھر بھی آخر نواب صاحب کے آنے کی خبر تو گرم ہے یہ نہ ہو کہ صبح تشریف لائیں تو میں عرق آلود پیشانی کے ساتھ بڑی لجاجت سے کہوں آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا۔ میری اس تشویش کو فیضان نے اپنی دلکش مسکراہٹ کے فیضان سے رفع دفع کر دیا۔ بولے نواب صاحب آنے جانے کے معاملے میں سیر چشم مگر کھانے کے معاملے میں نہایت محتاط ہیں۔ چھوڑیئے ایسی بھی کیا احتیاط جو پرہیزی کھانا وہ کھاتے ہیں کوشش کر کے تیار کرا لیں گے۔ ویسے تو ڈرانے والوں نے ہمیں تو مُسور کی دال بھی اتنا کہہ کر خوف زدہ کر دیا ہے کہ یہ منہ اور مسور کی دال۔ دیکھئے پرہیز کی بات سو فیصد درست ہے مگر یاد رکھیے وہ دوسروں کے یہاں کھانے سے بالکل ہی پرہیز کرتے ہیں۔ تو کیا

اتنے طویل سفر میں سارا دن بھوکا رہتے ہیں جی نہیں وہ وقت پر کھاتے ہیں۔ یہی تو پہیلی ہے کہ وہ کھاتے کہاں سے ہیں۔ اپنے باورچی خانے سے۔ وہ کہاں ہوتا ہے ان کی معیت میں ان کی کار کے پیچھے ایک جیپ ہوتی ہے جس میں خان سامان، نوکر چاکر، کھانا پکانے کا سارا سامان ہوتا ہے۔ وقت پر نواب صاحب کا کھانا دستر خوان پر چُن دیا جاتا ہے۔ سچ مچ مجھے کچھ نہیں کرنا ہوگا۔ بیچ میں رات ہی تو ہے صبح خود دیکھ لینا۔

جب دوسرے روز نواب صاحب تشریف لائے تو وہ کسی طرح نواب نہ نظر آئے، نہ ٹوپی۔ نہ پگڑی، نہ ریشمی کمر بند۔ نہ کمر میں خنجر اور پیش قبض نہ ہاتھ تلوار کے قبضے پر۔ نہ ہی منجھے ہوئے سیاستدان اور سابق اسپیکر کا انداز۔ مصافحہ اور معانقہ کے بعد بولے۔ میں آپ سے اچھی طرف واقف ہوں، فیضان صاحب نے آپ کا ذکر اتنی بار کیا ہے کہ آپ جانے پہچانے ہی لگتے ہیں۔ سرکاری باتوں کے ختم ہوتے ہی باتوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ وقت کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ میں نے نواب صاحب سے قیامِ انگلستان میں ان کی مصروفیات کا ذکر چھیڑ کر چوہدری رحمت علی کے کتابچے Now or Never کی تشکیل اور تصنیف کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کی نواب صاحب نے بتایا کہ کیمبرج میں وہ ہندوستانی مسلم طلباء کی انجمن کے صدر تھے اور چوہدری صاحب سیکرٹری۔ اُس کتابچہ کے مندرجات میں ان کا بھی ہاتھ ہے۔ ذکر جو چلا تو پھر گویا دبستان کھل گیا۔ باتیں دلچسپ تھیں اور طرزِ بیان اس سے زیادہ دلکش شاہ جارج پنجم سے اپنی ملاقات کا احوال مزے لے لے کر بیان کیا۔ میں نے پوچھا انہوں نے آپ کو بلایا تھا۔ بولے۔ جی نہیں۔ ایک دن جانے جی میں کیا آئی ایک خط لکھ ڈالا جس میں ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا تھا۔ ہفتے بعد ہی جواب آ گیا کہ فلاں تاریخ کو فلاں وقت آپ بکنگھم پیلس پہنچ جائیں۔ شہنشاہ نے آپ کو پانچ منٹ کے لئے شرف باریابی بخشا ہے۔ وقت پر حاضری دی۔ ان کے ملٹری سیکرٹری نے بار بار یاد دلایا آپ کی ملاقات کا وقت صرف پانچ منٹ ہے "ہنس کر گزاریا اسے رو کر گزار دے" وہاں کے سارے ادب آداب سے گزرا۔ شاہ کی دست بوسی کی۔ بادشاہ سلامت نے صوبہ سرحد کے بارے میں رکھی سے چند سوالات کیے۔ میں نے وہاں کے قبائل اور ان کی شاخوں کا ذکر کیا ہی تھا کہ شہنشاہ معظم کی خود اپنی قبائلی رگ ایسی پھڑکی کہ وہ

سوال پر سوال کرتے گئے اور نواب صاحب جواب دیتے گئے۔ ہر جواب نئے سوال کا پیش خیمہ بنتا رہا۔ سیکرٹری نے چکر پر چکر لگائے لیکن اعلیٰ حضرت کی دلچسپی دیکھ کر نہ اسے شاہ سے کچھ کہنے کا یارا ہوا نہ نواب کو اٹھانے کی خفت اٹھانے کا حوصلہ۔ نوے منٹ بعد نواب صاحب نے رخصت لی اور سیکرٹری نے اطمینان کا سانس لیا۔ نہ جانے کتنے ملاقاتیوں کو بے نیل مرام لوٹ جانا پڑا۔ اس طرح کے تجربات اور واقعات کا دفتر کھلا ہوا تھا۔ میں نے پیشہ ورانہ عادت سے مجبور ہو کر نواب صاحب سے گزارش کی کہ کوئی ناقابل فراموش واقعہ بیان فرما دیجئے جسے آپ اپنے حافظے سے جھٹک نہ سکے ہوں۔ چلئے آپ وہ واقعہ بھی سن لیجئے جو نصف صدی سے زیادہ گزرنے کے باوجود ابھی کل ہی کا محسوس ہوتا ہے۔ میں چھٹیوں میں کیمبرج سے گھر آیا کرتا تھا' اس بار بھی آیا اور روایات کے مطابق ڈپٹی کمشنر سے رسمی ملاقات کے لئے اس کے دفتر پہنچا۔ خالص انگریز تھے' مسرت کا اظہار بھی کیا اور یہ بھی بتلایا کہ انہیں انتظار بھی تھا کہ آپ آئیں تو آپ کی ملاقات شامی پیر سے کرادوں جو قبائلی سرداروں کے اصرار پر شام سے تشریف لائے ہیں اور سرکٹ ہاؤس میں فروکش ہیں جہاں ان کی دعائیں لینے اور ان سے ملاقات کرنے والوں کا صبح تا شام میلہ سا لگا رہتا ہے۔ آپ کل صبح آٹھ بجے سرکٹ ہاؤس پہنچ جایئے۔ پیر صاحب آپ سے ملاقات کے مشتاق ہیں۔ وہ تو عربی بولتے ہوں گے جس سے میں نابلد ہوں۔ بولے آپ ان کی صاف ستھری انگریزی سن کر حیران رہ جائیں گے۔ لوگ باگ تو اسے بھی پیر صاحب کا روحانی تصرف سمجھتے ہیں۔ پیر صاحب سے شرف ملاقات کے حصول کے شوق میں آٹھ بجے سے پہلے ہی سرکٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب موجود تھے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھا دیا گیا' اس دوران ڈپٹی کمشنر اندر والے کمرے میں آتے جاتے رہے' تھوڑی دیر بعد آ کر خوشخبری سنائی کہ انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے والی ہیں۔ پیر صاحب تشریف لانے ہی والے ہیں۔ وہ پیر صاحب کی کرامات کا تذکرہ کرتے رہے اور نواب صاحب کی آتش شوق بھڑکتی گئی۔ ان کی نظریں دروازے کے پردے پر گڑی ہوئی تھیں۔ اچانک پردہ ہٹا اور ڈپٹی کمشنر سرتاپا مودب ہو گئے۔ نواب صاحب بھی غیر ارادی طور پر کھڑے ہو گئے' ایک قد آور سرخ و سفید شخصیت سفید براق چوغہ پہنے چہرے پر سنجیدہ مسکراہٹ لئے نمودار ہوئی۔ نواب صاحب نے دیکھا وہی لمبوترا چہرہ ستواں ناک اندر کی جانب

دھنسی ہوئی چمکدار آنکھیں بالکل وہی تھیں۔ جانی پہچانی دیکھی بھالی نواب صاحب کے منہ سے بیساختہ نکلا Sir, It's you (جناب والا یہ آپ ہیں) اتنا سنتے ہی پیر صاحب نے چونک کر دیکھا اور الٹے پاؤں کمرے میں واپس ہو گئے۔ ڈپٹی کمشنر دوڑ کر کمرے میں گئے۔ واپس آکر پریشانی کے عالم میں گویا ہوئے۔ آپ یہیں ٹھہریں گے۔ رہ گئی پیر صاحب سے ملاقات اسے آپ بھول جائیں۔ پھر میں گھر جاتا ہوں نواب صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ جی نہیں آپ کہیں نہیں جاسکتے۔ اسی کمرے سے سیدھے انگلستان ہی جائیں گے۔ گھر جا کر والدہ سے اجازت تو لے لوں۔ سمجھ لیجئے انہوں نے اجازت دے دی ہے۔ آپ کا سامان تھوڑی دیر میں یہاں آجائے گا۔ پیر صاحب سے تو ملا دیں۔ وہ کیمبرج میں میرے استاد تھے میں ان کا چہیتا شاگرد تھا۔ آپ کسی سے نہیں ملیں گے شام کی گاڑی سے آپ جارہے ہیں سیلون لگا دیا گیا ہے۔ آپ کے ساتھ ایک فوجی افسر ہوگا جو آپ کے ساتھ بمبئی تک جائے گا۔ وہاں سے آپ جانے والے پہلے جہاز سے سیدھے کیمبرج جائیں گے، فوجی افسر سے آپ گپ شپ لگاتے رہیں تنہائی کا احساس نہیں ہوگا۔ اس دن شامی پیر کے نیاز حاصل کرنے والوں کو مایوس لوٹنا پڑا۔ اعلان ہوا کہ پیر کسی سے نہیں ملیں گے سارا دن عبادت میں گذاریں گے۔ بمبئی میں فوجی افسر سائے کی طرح ساتھ رہا۔ جہاز روانہ ہوا۔ وہاں کوئی ملاقات کے لئے نہیں آیا مسافروں کو اجازت ہی نہیں تھی۔ لندن میں بھی بندرگاہ پر فوجی افسر نے استقبال کیا۔ کیمبرج میں تعطیل کے باوجود کمرہ تیار تھا۔ بعد میں معلوم ہوا شامی پیر بھی دوسرے روز لوٹ گئے کہاں گئے ظاہر ہے شام گئے ہوں گے' جہاں انہیں مشرق وسطیٰ میں ایک نئی سحر لانے کا فریضہ انجام دینا تھا۔ میں نے نواب صاحب سے پوچھا آخر یہ ذات شریف تھے کون۔ نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا کیمبرج یونیورسٹی کے اسکول میں میرے استاد ٹامس ایڈورڈ لارنس تھے جنہیں بعد میں لارنس آف عریبیہ کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔

برطانیہ نے سرحدی قبائل کو رام کرنے کے لئے یہ ڈھونگ رچایا تھا۔ اقبال نے افغانیوں کی غیرت دین کا علاج یہ بتایا تھا کہ ''ملا'' کو کوہ ودمن سے نکال دو۔ برطانیہ نے جعلی مُلا کے ذریعے علاج بالمثل کی داغ بیل ڈالی تھی۔

خاکہ

پروفیسر محمود مرزا

تہی دامن

پی آئی اے کالونی میں کرایے پر مکان لینے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ضرورت پڑے تو پی آئی اے کا ٹکٹ رعایت سے مل جائے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ شیخ دین محمد کی رہائش بھی اسی کالونی میں ہے۔ شیخ صاحب سے میری پرانی یاری ہے۔ وہ کسی فیکٹری میں فورمین ہیں۔ تکنیکی مہارت میں اپنا ہمسر کسی کو نہیں پاتے۔ یہ اور بات ہے کہ مہینے میں ایک دو بار گوجرانوالہ جانا ان کا معمول ہے۔ کہتے ہیں ''مشین خراب ہو گئی تھی۔ گوجرانوالہ سے مستری کو لے کر آیا ہوں'' ''ایک پرزہ ٹوٹ گیا تھا گوجرانوالہ میں کاریگر سے ٹھیک کرا کے لایا ہوں'' ایک روز میں نے پوچھا ''شیخ صاحب کیا گوجرانوالہ میں لوگوں کو آپ سے زیادہ مشینری کا علم ہے؟'' مسکرا کر کہنے لگے ''کوئی مستری یا کاریگر گوجرانوالہ میں ایسا نہیں جو میرا شاگرد نہ ہو۔ چھوٹے موٹے کام اب میں خود نہیں کرتا شاگردوں سے کرا لیتا ہوں۔''

ایک بار شام کے وقت تشریف لائے۔ غالباً کسی نے انہیں اخبار پڑھ کر سنا دیا تھا۔

شیخ صاحب۔ آج کل اخباروں میں ایٹم بم کا بڑا چرچا ہے۔

میں۔ ہاں ہے تو سہی۔ مگر اس سے ہمیں کیا۔

شیخ صاحب۔ ایٹم بم بنتا کیسے ہے؟

میں۔ سفلی عمل کے ذریعے

شیخ صاحب۔ بہت خوب، بہت خوب، سارا مسئلہ ہو گیا۔

میں۔ شیخ صاحب اس کا علم تو صرف ان چند لوگوں کو ہے، جنہوں نے اسے بنایا۔

شیخ صاحب۔ مشینری استعمال کی ہو گی۔

میں۔ جی ہاں۔ گوجراوالہ سے منگوا کر۔

شیخ صاحب ہنس پڑے بات آئی گئی ہوئی۔

تجسس شیخ صاحب کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ وہ پیکرِ خلوص ہیں۔ اچھائی برائی ہر ایک میں ہوتی ہے۔ نہ جانے میری کتنی کوتاہیوں کو وہ نظر انداز کر دیتے ہیں۔

پچھلے دنوں ایک عزیز کی شادی میں شرکت کرنے کے لئے ملتان سے بلاوا آیا۔ میں روانہ ہوا تو شیخ صاحب اسٹیشن تک چھوڑنے آئے۔ چلتے وقت کہنے لگے کل اسی گاڑی سے واپس آ جائیے۔ میں آپ کو لینے آؤں گا۔ وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں۔ گرم علاقہ ہے اور ویسے بھی آپ کا مزاج سوداوی ہے۔

ملتان میں شادی کی تقریب مختصر سی تھی۔ کھانا اور بھی مختصر۔ میں نے کھانے کے بعد میز بان سے اجازت چاہی۔ وہ پہلے ہی گرمی کی شدت اور مہمانوں کی کثرت سے گھبرائے ہوئے تھے۔ باہر تک رخصت کرنے آئے۔ کہنے لگے ''بس سے جانا۔ آج کل بسیں ایئر کنڈیشنڈ ہیں۔ سفر آرام سے کٹ جائے گا۔'' میرے دماغ میں اور ہی سودا سمایا ہوا تھا۔ تانگے پر سوار ہوا۔ گھنٹہ گھر کا رخ کیا۔ اب شہر ملتان تھا، اہل ملتان تھے اور میں تھا۔

ملتان میں گھنٹہ گھر ہے۔ اس کے باعث پاکستان کے اکثر شہر ملتان پر رشک کرتے ہیں۔ اسلام آباد چلے جائیے۔ ملک کا دارالحکومت ہے مگر وہاں گھنٹہ گھر نہیں۔ ایوان صدر اور سپریم کورٹ کی عمارات عالیشان سہی لیکن انصاف کی نظر سے دیکھیں تو گھنٹہ گھر کے بغیر شہر خالی خالی دکھائی دیتا ہے۔ لاہور کو لیجئے۔ عروس البلاد ہے۔ تجارتی شہر ہے۔ گہوارۂ علم وادب ہے لیکن گھنٹہ گھر سے محروم ہے۔ مینارِ پاکستان کی بات اور ہے۔ اس پر گھڑیاں نصب نہیں۔ اس کے حوالی میں وقت ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ ان ساعتوں کو گزرنے سے روکے کھڑا ہے جن میں قراردادِ پاکستان پیش کی گئی تھی۔

گھنٹہ گھر پہنچ کر ملتان کے اکثر علاقوں تک رسائی آسان ہو جاتی ہے۔ ہر طرف سڑکوں کا جال نظر آتا ہے۔ کشادہ اور تنگ سڑکیں۔ ٹریفک کا رش سب پر یکساں۔ ویگنیں، عوامی رکشہ دھواں چھوڑتے ہارن بجاتے، ٹریفک کے اشارے توڑتے رواں رواں۔ موٹر کاریں، موٹر سائیکلیں براق سے تیز کسی کو آگے کی پروا نہ پیچھے کی فکر۔ جس کو بچنا ہو خود بچے۔ موت برحق۔ جو وقت مقرر ہے ٹل نہیں سکتا۔ ایمان پختہ

ہوتو رفتار کیوں نہ تیز ہو۔

فٹ پاتھ پر چلنے والے وحشت زدہ گرمی سے بے حال۔ بیزاری ایسی کہ کوئی راستہ پوچھے تو جھڑک دیں۔ راستہ مانگے تو اڑ جائیں۔ بوڑھے جوانوں سے آگے نکلنے کی فکر میں جوان بوڑھوں کو پیچھے دھکیلنے کی دھن میں ہیں۔ افراتفری کا عالم دیکھنے کو ملتا ہے۔

کاروباری مراکز یہاں بہت سے ہیں۔ تاجر خندہ رُو، کشادہ جبیں۔ مال وافر گاہک بہت۔ لین دین ہمہ وقت جاری۔ مال دینے والے قیمت لے کر خوش، قیمت دینے والے مال لے کر خوش۔ بڑی دکانوں کے آگے مزدور بیٹھے ہوئے۔ سامان زیادہ ہوتو اٹھا کر خریدار کی گاڑی میں رکھ دیا۔ اس نے اجرت پوری دی تو سلام کیا۔ کم معلوم ہوئی تو منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے پیسے کیسے میں ڈال لئے۔ زیادہ کا تقاضہ نہیں کیا۔

عوام باشعور ہیں۔ ملکی سیاست کو سمجھتے ہیں لیکن اس پر بحث نہیں کرتے۔ قیمتیں چڑھ جائیں تو دکاندار سے جھگڑتے ہیں نہ حکومت کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ دکاندار قصوروار نہیں اور حکومت کے خلاف احتجاج کرنا خواہ مخواہ پولس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانا ہے۔ ملتا اولیا کی چوکھٹ ہے۔ عقیدت مندی اہلِ ملتان کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ وزیروں بلکہ وزیروں سے اعلیٰ تر لوگوں کی تقریریں بھی عقیدت سے سننے کی کوشش کرتے ہیں مگر اُن کے وعدوں پر تنقید کرتے ہیں نہ وعدوں کے ایفا کی اُمید پر خود فریبی میں مبتلا ہوتے ہیں۔

یہاں خوشحال لوگوں کے دو طبقے ہیں۔ بالائی طبقے میں مخدوم، مشائخ اور سجادہ نشین شامل ہیں۔ وہ چمکیلی کاروں، اسمبلیوں کی ممبری، زمین کے بڑے بڑے رقبوں اور مُریدوں کی کثیر تعداد کے مالک ہیں۔ زیریں طبقہ سرکاری حکام، تاجرانِ کرام اور نو واردانِ سیاست پر مشتمل ہے۔ ان میں سے اکثر کے پاس نئی موٹر سائیکلیں اور بعض کے پاس پرانی موٹر کاریں ہیں تاہم عزیزوں کی غیر موجودگی میں وہ پبلک ٹرانسپورٹ کے استعمال کو ترجیح دیتے ہیں۔ آبادی کا ایک طبقہ گداگری پر معمور ہے۔ ملتان کے گداگر صحت کے اعتبار سے باقی ساری آبادی پر حاوی ہیں۔ خدا انہیں نظرِ بد سے بچائے۔ وہ ان چار

میں سے تیسرا ستون ہیں جن پر ملتان قائم ہے۔ باقی ستون گرد، گرما، اور گورستان بفضلہٖ محفوظ ہیں۔

ہر جگہ کی طرح غریب یہاں بھی آباد ہیں۔ ان کے پاس اولاد کی کثرت اور وسائل کی قلت کے سوا اور کچھ نہیں۔ وہ گندی جگہوں میں رہتے ہیں۔ جھوٹ بولتے ہیں۔ بھوک کی مار کھاتے اور گھٹیا برانڈ کے سگریٹ پیتے ہیں۔ کوئی ان کے حال پر ترس کھاتا ہے نہ وہ کسی کے حال پر ترس کھاتے ہیں۔ مزدوری ان کا پیشہ اور آجر کو زک پہنچانا ان کا شیوہ ہے۔

ملتان صنعتوں کا شہر ہے۔ کپڑے کی صنعت، کھاد کی صنعت اور خاص طور پر حلوہ سوہن کی صنعت، کپڑے اور کھاد کے کارخانے بڑے وسیع ہیں۔ مگر افسوس کہ حلوہ سوہن کی صنعت ابھی تک کاٹیج انڈسٹری کی سطح سے اوپر نہیں اٹھی۔

ملتان سے لوٹتے ہوئے ان مبارک ہستیوں کی بارگاہ میں حاضر ہونے کی حسرت رہ گئی جن کے دم قدم سے اس شہر کی عظمت وابستہ ہے۔ وقت تنگ ہو رہا تھا۔ گاڑی کی روانگی میں زیادہ دیر نہیں تھی میں تیزی سے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ گاڑی بروقت آئی اور لاہور بغیر تاخیر پہنچی۔ پلیٹ فارم پر شیخ صاحب موجود تھے۔ ہم باہر نکلے اور ویگن میں جا بیٹھے موسم گرم تھا۔ ویگن چلی تو جسم کو ہوا لگی۔ حواس درست ہوئے تو گفتگو شروع ہوگئی۔

میں: شیخ صاحب گاڑی ٹھیک وقت پر لاہور پہنچ گئی۔ یہ ڈرائیور کا کمال تھا۔

شیخ صاحب: وہ کیسے؟

میں: دو تین جگہ سگنل نہیں ملا۔ ٹرین دس دس منٹ کھڑی رہی۔ مگر ڈرائیور کاریگر تھا جہاں موقع ملا انجن کی رفتار بڑھا دی۔

میری زبان سے تو کاریگر کا لفظ ویسے ہی نکل گیا لیکن شیخ صاحب نے اسے اچک لیا۔ مسکراتے ہوئے بولے۔ گوجرانوالہ کا ہوگا۔

میں نے گرہ لگائی۔ اور ہوگا بھی آپ کا شاگرد۔

غرض ان ہی خوش گپیوں میں راستہ طے ہوتا رہا۔ اکبر چوک پر پہنچے تو شیخ صاحب نے میرا

ہاتھ دبایا۔ کہنے لگے ذرا بتاؤ یہ جگہ اکبر چوک کیوں کہلاتی ہے؟ مجھے کیا معلوم جی میں آیا کہہ دوں یہاں اکبر بادشاہ کا محل تھا لیکن اس عظیم شہنشاہ کو اس تنگنائے میں لا بٹھانا بے ادبی تھی صاف کہہ دیا مجھے علم نہیں۔

شیخ صاحب ٹھنڈا سانس بھر کر بولے کل کلاں کو پوچھنے والے پوچھیں گے جوہر ٹاون کی وجہ تسمیہ کیا ہے تو انہیں بھی ایسا ہی کورا جواب مل جائے گا۔ مجھے شیخ صاحب کی مایوسی پر دکھ ہوا۔ میں نے کہا شیخ صاحب کیا کوئی دور ایسا بھی آئے گا جب لوگ اس بطل حریت کا نام تک بھول جائیں گے جسے مولانا محمد علی کہتے ہیں۔ جوہر تو لاحقہ ہے صرف تخلص۔ شیخ صاحب نے خوش ہو کر جزاک اللہ کہا اس اثنا میں ہم گھر کے قریب پہنچ چکے تھے۔

رخصت ہونے لگے تو شیخ صاحب نے پوچھا وہاں بزرگوں کی خدمت میں سلام عرض کرنے گئے؟ میں نے شرمندہ ہو کر کہا وقت نہیں ملا شیخ صاحب کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں کہنے لگے جن کی روحانی سلطنت میں آپ گھومتے پھرتے رہے ان کے دربار میں حاضر بھی نہ ہوئے۔ کون جانے وہاں سے کیا مل جاتا۔

شیخ صاحب چلے گئے میں وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ گھر کا دروازہ ساتھ ہی تھا۔ اندر جاؤں تو کیسے جاؤں۔ میں تو ملتان سے تہی دامن لوٹ آیا ہوں۔

آغا گل

گونگا پہاڑ

باپ نے اپنا تعارف ثناء اللہ کے نام سے کروایا تھا، شناختی کارڈ بھی اس نے پیش کیا۔ اس کا بیٹا صمد بھی کوئی آٹھ برس کا ہوگا۔ صمد کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی، جب کہ ثناء اللہ نے کھانے پینے کا سامان اور چھاگل اٹھا رکھی تھی۔ ان کی تلاشی مکمل ہو چکی تو دم لینے کو وہ سپاہیوں کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ حوالدار کے حکم پہ انہیں پیالے پیش کی گئی۔

ثناء اللہ نے سرگوشی کی ''گزشتہ ماہ صمد کی والدہ اچانک فوت ہوگئی۔ تب سے اسے ساتھ ساتھ لئے پھرتا ہوں کہ ماں کو یاد نہ کرے۔ اس نے کہیں سنا کہ آماج کی چوٹی آسمان سے باتیں کرتی ہے۔ ضد کر رہا تھا کہ پہاڑ پہ جا کے پہاڑ کی باتیں سنیں گا۔''

حوالدار نے ایک محبت بھری نظر اس محروم بچے پہ ڈالی۔

''اس کی ماں آسمانوں میں رہتی ہے، شاید وہ سمجھتا ہو پہاڑ کے ذریعے ماں سے باتیں کرے گا۔ میرا بیٹا بھی اسی عمر کا ہے۔ پنڈ دادن خان میں پڑھتا ہے۔ چھ ماہ سے اس کی شکل نہیں دیکھی۔''

''کب سے ان پہاڑوں میں پڑے ہو۔ تمہیں تو اجنبی ہی لگتے ہوں گے۔''

''بس کیا کریں روزی جو یہیں لکھی ہے۔ جہاں دانہ پانی ہو۔ کھینچ کے لے جاتا ہے۔'' لہجے کی مایوسی مردانگی کے پردے سے چھلک اٹھی۔

باپ بیٹا رخصت ہونے لگے تو حوالدار نے نصیحت کی ''خیال رکھنا اوپر سے فائر بھی آتا ہے، بہتر تو یہی ہے واپس چلے جاؤ۔''

میری بھی مجبوری ہے صمد پہاڑ کی باتیں سننا چاہتا ہے۔ ''کیوں صمد؟''

''ہاں'' صمد نے اثبات میں سر ہلایا۔

حوالدار کو بچے پہ پیار آ رہا تھا۔ بالکل اس کے اپنے ہی بیٹے کا ہم عمر تھا اس نے صمد کے گال تھپتھپائے۔ اور پدرانہ شفقت سے بولا ''زیادہ آگے نہ جانا بیٹا۔ واپس چلے آنا یہ پہاڑ شاید پہلے کبھی بولتے ہوں۔ اب تو گونگے ہو چکے ہیں یا شاید انہیں فالج ہو گیا ہے۔''

باپ بیٹا گفتگو کرتے درّے کی جانب بڑھنے لگے۔

زیادہ چڑھائی نہیں تھی، انہیں دشواری پیش نہ آئی۔

''بابا یہ پہاڑ گونگا ہو چکا ہے کیا؟'' صمد کے معصوم ذہن سے سوال ابھرا۔

''پہلے تو نہیں تھا۔ شاید اب ہو چکا ہو دیکھو کیسی خاموشی ہے۔ حاکم ہمیشہ محکوم کی زبان کاٹ کے رکھ دیتے ہیں۔ شاید اس کی بات بھی کٹ چکی ہے۔ چلو واپس چلتے ہیں۔ گونگا کیا بولے گا؟''

''بابا تھوڑی دور تو چلیں کیا پتہ بول بھی پڑے۔ اور اگر ہمارے پہاڑ کی زبان کوئی کاٹنے آیا تو میں اسے ماروں گا'' صمد نے چھڑی فضا میں لہرائی۔

یہاں چڑھائی شروع ہو رہی تھی۔ اُن کے ماتھے پہ پسینہ آنے لگا۔ صمد اب تک پہاڑ کے گونگے پن میں کھویا ہوا تھا۔

''بابا! اتنا بڑا پہاڑ خود کسی کی زبان نہیں کاٹ سکتا۔''

ثناء اللہ ہنس دیا، ''واہ بیٹا میرے ذہن میں اب آیا پہاڑ بھی تو جواباً زبان کاٹ سکتا ہے۔''

باپ بیٹا ہنستے مسکراتے بلندی کی جانب بڑھ رہے تھے کہ اچانک اوپر سے تڑتڑ کی آوازیں آنے لگیں۔

''بابا! سنو پہاڑ بول رہا ہے، یہ میرے لئے بول رہے ہیں'' صمد خوشی سے قہقہے لگانے لگا۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ لیکن تڑتڑ اور دھماکوں کی آوازیں اس ترائی سے بلند ہوئیں جہاں دم لینے کو رک کر چائے پی تھی۔

ثناء اللہ کانپ کے رہ گیا۔ اس نے کھانے پینے کے سامان کا بوجھ کندھوں سے نوچ پھینکا۔ جھپٹ کر صمد کو دبوچ لیا۔ اتفاقاً وہ ایک ایسے مقام پہ تھے جہاں چھپنے کی جگہ ہی نہ تھی۔

''صمد بیٹا ہم کو اس فائر میں آ گئے ہیں، تمہیں کلمہ آتا ہے''

''ہاں ہاں پورا پورا آتا ہے'' صمد نے فخریہ انداز میں اعلان کیا۔

''اچھا میرے ساتھ آواز ملا کر کلمہ پڑھو'' ثناء اللہ بہ آواز بلند کلمہ طیبہ کا ورد کرنے لگا۔ اس نے صمد کو مضبوط گرفت میں یوں جکڑ رکھا تھا کہ اس کا جسم صمد کے گرد ڈھال بن چکا تھا۔

پہاڑ بولتا رہا' بولتا ہی چلا گیا صمد اپنے باپ کے ساتھ ساتھ کلمہ طیبہ کا ورد کرتا رہا۔

پھر پہاڑ خاموش ہو گیا باپ کا ورد جاری رہا۔ البتہ آواز کسی گہرے کنویں سے آ رہی تھی۔ بہت ہی نقاہت تھی۔ پھر پہاڑ کی مانند ثناء اللہ بھی گونگا ہو گیا۔

سپاہیوں نے دیکھا چیختا چلاتا بچہ ان کی جانب دوڑا چلا آ رہا ہے، چھڑی کہیں گر چکی تھی۔ قمیض خون میں بھیگی ہوئی تھی۔

انہوں نے چابکدستی سے بچے کا جسم ٹٹولا۔ جسم پہ زخم کا نشان نہ تھا۔ لباس پہ لگا خون اس کے باپ کا تھا۔

''میرے باپ کو بچالو'' صمد التجائیں کرنے لگا۔

''کیا ہوا ہے اسے'' سپاہی پیش قدمی سے گریزاں تھے۔

''بابا کچھ نہیں بولتا اس کے منہ سے خون نکل رہا ہے۔ پہاڑ نے اس کی زبان کاٹ ڈالی ہے۔''

ڈاکٹر خیال امروہوی

چاپلوس وائرس

فارسی لغت کے مطابق چاپ ہندی سے ماخوذ ہے۔جس کے معنی فنِ نقش گری، تصویری تحریریں بھی ہیں۔ہندی اعتبار سے چاپ قدموں کی آہٹ کے معنوں میں ہے۔خوشامد کے معنوں میں زیادہ مستعمل ہے کیونکہ خوشامدی یعنی چاپلوس اپنے چکنے چپڑے لفظوں سے اپنے مدمقابل کو دباتا ہے، اپنا کام نکالتا ہے۔فارسی لغت میں لوس کے معنی بھی چاپلوسی کے ہیں۔چرب زبان، چاپلوس وہ ہوتا ہے جو خود کو تقرب، قرابت یا نزدیکی جتانے کے لئے وجہ بے وجہ تعریف و توصیف سے کام لیتا ہے۔

لُوس سے لوسی نکلا ہے یعنی دُم ہلانے والا کتّا یا کتیا۔دودھ ملائی چٹ کر جانے والی گربہ لوسی کہلاتی ہے، اس طرح چاپ لوسی سلاطین مغلیہ سے بھی قبل یعنی اشوکا اور چندر گپت موریا کے دور سے خوشامد کے معنوں میں ہے پہلے ہندی بھاشا میں حکمرانوں کے لئے جو زبان تراشی گئی تھی وہ خوشامدانہ الفاظ اور جملوں پر مشتمل تھی، مثلاً راجہ، مہاراج، کرماکرن، اپنی راج دھانی کی دان نکالیں، غریب غرباء آپ کی راج دھانی کے لئے پرماتما سے دعا کرینگے۔جب مہاراج خوش ہو کر سکہ رائج الوقت ان کی طرف پھینک دیتا تھا۔ایرانی کلچر کے تحت جو مغلیہ خاندان آے ان کے لئے فارسی آمیز القاب تراشے گئے جیسے، جہاں پناہ، خسرو زمان و مکاں، ظلِ الٰہی، قارون وقت، حاتم دوراں، مالک گنج باد آور فخر آدم، سلطان العلوم وغیرہ ان القاب کا ذکر کلاسیکی ادب کے دیباچوں میں بھی موجود ہے، بڑی سے بڑی تخلیقی کتابوں کو جاہل، مجہول بادشاہ جیسے (جلال الدین اکبر شہنشاہِ ہندوستان) سے منسوب کیا جاتا تھا۔غلامی اور زرعی کلچر جب صنعتی دور میں داخل ہوئے تو انگریز کمپنی نے شاہ ہندوستان شاہ جہاں سے انگریز کمپنی چلانے کی اجازت مانگی حکم ہوا کہ زمین دیدی جائے۔اس دور میں بھی انگریزی لٹریچر میں چاپلوسی وائرس نے اپنا زہر پھیلایا سید احمد خاں نے مسلمانوں کی جان بچانے کے لئے اپنی ایسی تحریروں سے اس طرح

بر سا پر چڑھایا کہ مغرب زدہ گروہ آج تک اس بانس سے نیچے نہ اتر سکے۔

پاکستان کے گذشتہ ۵۸ برسوں میں چاپلوس وائرس نے اپنے اثرات دکھائے۔یہ وائرس زیادہ تر افسر شاہی (Bureaucracy) نے پال پوس کر زہریلا کیا،مثلاً ہر محکمے میں صبح ہی صبح جو سرکاری ملازمین آتے ہیں وہ سب سے پہلے بڑے افسر کے کمرے میں داخل ہو کر نہایت خضوع وخشوع،آداب وتسلیم اور کورنش کے ساتھ نوکری کا آغاز کرتے ہیں۔اس چاپلوسی وائرس کا قاعدہ ہے کہ وہ افسر صاحب کی صحت،رنگ روپ کی تعریف کرینگے۔سوٹ کے کپڑے،سلائی کے بارے میں ایسی ایسی زہریلی تعریفیں سننے میں آتی ہیں کہ یقین ہو جاتا ہے ڈنگی مچھر کی موجودگی صرف قصہ کہانی نہیں بلکہ یہ چاپلوسی بھی ایک وائرس ہے۔اس وائرس کے کثرت سے فوائد ہیں سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ چاپلوسی وائرس والا تمام لازمی قوانین سے آزاد ہو جاتا ہے۔میڈیکل کالجوں میں اپنی اولاد کو داخل کروالیتا ہے،بلا انتخاب بادشاہ بن بیٹھتا ہے چاپلوسی وائرس کے نقصانات میں سب سے پہلے لاوارث کسان مزدور آتے ہیں جنہیں دھکے مار مار کر نکال دیا جاتا ہے۔

خوشامدی وائرس کا ایک شعبہ ''ٹرخالوجی'' ہے جسے بڑے بڑے ٹرخالوجسٹ چلاتے ہیں،ان کا رتبہ اور مرتبہ ٹیکنو کریٹ (فنی ماہرین) کے برابر ہوتا ہے ان کی ماہانہ تنخواہیں لاکھوں میں ہوتی ہیں۔ ٹرخالوجی کی تعریف یہ ہے کہ ''جینوئین'' درخواست گزاررں کو بھی انشاء اللہ ماشاء اللہ کہہ کر اس خوبی سے رفع دفع کر دیا جاتا ہے کہ درخواست گزار اختلاج قلب میں مبتلا ہو کر دفتر سے مایوس گھر لوٹ آتا ہے۔

ٹرخالوجی ایک فن ہے جو عمل اور سچائی کے برعکس مخصوص وائرس مرض الموت کی صورت میں پیدا ہوتی ہے انگریز کے دور میں تاخیر کو ''ریڈ ٹیپ ازم'' کہا جاتا تھا۔یہ وائرس رنگ برنگے نوٹوں سے اپنی خوراک لیتی ہے۔اس میں دیر سویر کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔وکلاء اپنے موکلین سے کہتے ہیں کیوں مارا مارا پھر رہا ہے روپیہ پیسہ جوڑ کر لے آئیں جج صاحب کو بھی خرید لیتا ہوں نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ ٹرخالوجی والے چند سو لیکر چھ ماہ آگے کی تاریخ دینے میں کوئی پس وپیش نہیں کرتے،رقم دیدو تاریخ جتنی چاہے بڑھوالو۔

اساتذہ مقدس ترین افراد تصور ہوتے تھے، جب سے نج کاری شروع ہوئی گورنمنٹ تعلیمی اداروں میں چاپلوس اساتذہ اور ٹرخالوجسٹ حضرات نے کالجوں کو ویران اور برباد کر کے علم و تعلیم کا ایسا منہ کالا کیا کہ اب بیرون ملک پاکستان کی کسی ڈگری کو بھی تسلیم کرنے سے معذرت کر لی جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خوشامد یا چاپلوسی غربت اور بے وسلیگی کی علامت ہے، خدا کے بارے میں تو بندہ کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ عنقریب اسی کی بارگاہ میں کھڑا ہو جانا ہے، تاہم حقیقت یہ ہے کہ خدائے دو جہاں کو بھی چاپلوسی اور خوشامد اس قدر پسند ہے کہ اس نے کثرت سے حمد و ثنا کرنے والوں کے لئے جنت بنوا رکھی ہے چاپلوس وائرس کے مزید خوشگوار اثرات یہ بھی ہیں کہ انسان اپنی بدترین زندگی کے باوجود جب اپنی تعریف سنتا ہے تو اس کا نفس (ذات) دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا ہے۔ قد و قامت لحیم شحیم ہو جاتا ہے بگڑے کام سنور جاتے ہیں اس وائرس کو مارنے کی آج تک کوئی دوا یا انجکشن ایجاد نہیں ہو سکا۔ ہم دوسروں پر تنقید کیا کریں جب ہماری بے جا تعریف ہو جاتی ہے تو پھولے نہیں سماتے۔

چاپلوس زدہ وائرس والوں نے ثقافتی روابط کو قائم رکھنے کے لئے طرح طرح کے تعریفی جملے تراش لیے ہیں۔ مثلاً انتہائی کمزور نحیف و نزار کمزور صحت والے کو پہلوان جی کہتے ہیں، اس طرح وہ چند دنوں کے لئے زندہ ہو جاتا ہے غریب رفقیر، بے خانماں افراد کی جھونپڑیوں کو دولت خانہ کہہ کر خوش کر دیا جاتا ہے۔ بدشکل کالی پیلی خاتون کو قلوپطرہ کے حسن سے شباہت دیکر اسے چند دنوں زندہ رہنے کی مہلت دی جاتی ہے۔ جس پر وہ اس جھوٹی تعریف پر کئی بار آئینہ دیکھتی ہے دنداسہ ملتی ہے، سرمہ کا جل لگاتی ہے تبت سنو جو اس کا غریب شوہر کبھی لایا تھا دن میں کئی بار منہ پر تھوپ کر خوش ہو لیتی ہے۔ چاپلوسی کا وائرس بین الاقوامی سیاست میں بھی داخل رکھتا ہے جس کے زہریلے اثرات کی جمہوری عوام کو ایک فی صد بھی خبر نہیں ہوتی۔ اس وائرس سے بچنے کی پی۔ ٹی۔ وی پر گڑگڑا کر روزانہ دعائیں مانگی جاتی ہیں لیکن عملی طور پر کسی ضلع سے خبر نہیں آتی کہ ڈینگی وائرس کا خاتمہ کر دیا گیا ہے جب عمل نہ ہو تو کوئی دعا قبول نہیں ہوا کرتی۔

\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-

کہانی

ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی

نیا سورج

ڈاکوؤں کے چیف فتو خان کے مکان کے دروازے پر وڈیرہ منگو خان کی لاش خون میں لت پت پڑی تھی۔

لحیم شحیم، دیو ہیکل، بڑی بڑی گھومی ہوئی مونچھیں، چمکتی ہوئی آنکھیں، خوفناک چہرہ دو گھوڑا بوسکی کی اونچی پگڑی، گلے میں سونے کی چین ہاتھوں کی انگلیوں میں بھاری بھاری سونے کی انگوٹھیاں۔ ہاتھ میں اب تک کلاشن کوف اور ٹرائیگر میں پھنسی ہوئی انگلی لیکن لوڈ ہونے کے باوجود وہ انگلی دبا نہیں سکا تھا کہ خود گولی کا نشانہ بن گیا۔ جہاں گولی لگی تھی وہاں سے اب تک خون نکل رہا تھا اس کے دہشت ناک چہرے کو دیکھ کر اب بھی خوف محسوس ہو رہا تھا۔

منگو خان گوٹھ دریا خان کا وڈیرہ تھا۔ وڈیرہ شاہی اس کے خاندان میں جدی پشتی تھی اس کا باپ دادا پردادا نہ معلوم کہاں تک یہ سلسلہ چلا گیا تھا۔ دریا خان گوٹھ خاصا بڑا تھا آبادی بھی زیادہ تھی گوٹھ کا بچہ بچہ منگو خاں کو ذاتی طور پر جانتا تھا۔ منگو خان کے پاس پورے گوٹھ کا ریکارڈ تھا۔ کتنے بچے ہیں، کتنی عورتیں ہیں، کتنی لڑکیاں ہیں کتنے پڑھے لکھے لوگ ہیں کون کیا کرتا ہے' کس کے کس سے تعلقات ہیں' کس کو کس کی رقم دینی ہے' کس کی بیٹی شادی کے لئے بیٹھی ہے۔ کس نے اپنی زمین میں اضافہ کیا ہے، کس کے شہر والوں سے تعلقات ہیں' کون اس کے خلاف آواز اٹھا سکتا ہے' منگو خاں کو پل پل کی خبریں ملتی تھیں' اپنے ہی گوٹھ کی نہیں بلکہ دوسرے گوٹھوں کی بھی۔ سب یہ بات جانتے تھے کہ منگو خاں کو کن کن باتوں سے دلچسپی ہے وہ کن کن باتوں سے چڑتا ہے اسے خوش کرنے کے لئے کون کون سے طریقے ہیں۔ شام کو مڈل اسکول کی پکی اور خوب صورت عمارت میں محفل جمتی تھی۔ مدرسے کا ہیڈ ماسٹر اور دوسرے استاد گھر پر رہتے تھے اور سرکاری تنخواہ کے علاوہ سال بھر کا کھانا پینا وڈیرے کے ذمے تھا۔ وہاں سرکاری ادارے تھے

ہی کتنے ڈاک خانہ، پولیس اسٹیشن، لوکل بورڈ، میونسپلٹی وغیرہ۔ وڈیرہ ہر جگہ تھا اور جہاں وہ نہیں تھا وہاں اس کے گرگے ہوتے تھے۔

منگو خان کی اپنی جیل تھی، اپنے سپاہی تھے، اپنا انتظام تھا، اس کی جیل میں اس کے ناپسندیدہ شخص نہ جانے کب سے سڑ رہے تھے، وہ ایک طرح سے اس علاقے کا ڈکٹیٹر تھا جو چاہتا تھا اور جس طرح چاہتا تھا کرتا تھا۔ پولیس والوں نے کبھی اس کے کام میں دخل نہیں دیا ان کو ان کے اخراجات پابندی سے مل جاتے تھے۔ وہ خود تو سیاسی آدمی نہیں تھا لیکن ہر الیکشن پر وہ ایک خطیر رقم لے کر بک جاتا تھا اس کی مدد سے اس علاقے سے جو لوگ کامیاب ہوتے تھے وہ اس کی ہر ممکن مدد کرتے تھے اس پر کوئی آنچ نہیں آنے دیتے تھے۔ جب وہ سیاہ عربی گھوڑوں کی ننگی پیٹ پر سواری کرتا تھا تو بالکل چنگیز خان لگتا تھا رستہ میں چلتے ہوئے لوگ رک جاتے تھے۔ لوگوں کی گردنیں جھک جاتی تھیں وہ بے نیازی سے سر اونچا کر کے ہیبت ناک انداز سے چلنے کا عادی تھا۔ لوگ جانتے تھے کہ اس علاقے میں اس کے مقابلے کا کوئی دوسرا دہشت گرد نہیں ہے اس سے الجھنا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے وہ جس سے ناخوش ہوتا دوسرے دن وہ ناپید ہو چکا ہوتا تھا۔ پیر، فقیر، سید، مولوی، ملا، دکاندار چھوٹے بڑے زمیندار سب نے اپنا رویہ منگو خان کی مرضی کے مطابق کر لیا تھا۔

منگو خان قطعی ان پڑھ تھا لیکن ضرورت کے لئے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی ساتھ رکھتا تھا اس کے اپنے جان نثار سپاہی تھے سپاہی تو وہ خود انہیں کہتا تھا دراصل وہ ڈاکوؤں کا ایک بڑا ٹولہ تھا منگو خان کا یہ شغل تھا کہ وہ دور دور تک ان جان نثاروں سے ڈاکے ڈلواتا تھا۔ سرکاری پہرے داروں کو اغواء کرواتا تھا خاص طور سے غیر ملکی باشندوں کو وہ شہر تک سے اٹھوا لیتا تھا بڑے بڑے تاوان وصول کرتا تھا۔ اس کا کوئی آدمی کبھی گرفتار نہیں ہوا اور اگر غلطی سے پکڑ بھی لیا جاتا تو وہ متعلقہ حکام کو صرف ایک فون کرتا تھا اس کا آدمی دوسرے دن اس کے پاس پہنچ جاتا تھا۔

دن گزر رہے تھے منگو خان کی مونچھوں کے بالوں میں چاندی جھانکنے لگی تھی وہ کبھی کبھی اداس بھی ہو جاتا تھا۔ اس کی چار بیویاں تھیں لیکن بیٹا صرف ایک بیوی سے تھا۔ عجیب بات تھی بچپن سے ہی اس

لڑے کی عادتیں مختلف تھیں حویلی میں کوئی دوسرا بچہ جا ہی نہیں سکتا تھا۔ مردانے میں باپ کے پاس وہ کبھی کبھار جاتا تھا۔ وڈیرے کو یہ بات بہت بری لگتی تھی وہ سمجھتا تھا کہ اس کی ماں اسے کمزور اور بزدل بنادے گی ۔وہ چاہتا تو اس کی ماں کو چھوڑ دیتا لیکن یہ خیال کر کے کہ یہی ایک اولاد ہے گڑبڑ ہو جائے گی۔

رحیم بخش کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی اس کی ماں نے ہی اسے پڑھایا۔ وہ ایک اسکول ماسٹر کی بیٹی تھی جسے منکو خان اس کے گھر سے اٹھالایا تھا۔ ماسٹر صاحب عزت دار آدمی تھے وہ منکو خان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے ہاں انہوں نے یہ کمال کر دکھایا تھا کہ بعد میں باقاعدہ شادی کر کے بیٹی کو وڈیرے کی بیوی بنادیا تھا۔

رحیم بخش بہت کم عمر تھا کہ حیرت کی حد تک ذہانت کی باتیں کیا کرتا تھا۔ اس کے نانا ماسٹر صاحب ابھی زندہ تھے وہ اسے باتوں ہی باتوں میں تعلیم دیا کرتے تھے۔ جب رحیم بخش نے میٹرک کر لیا تو منکو خان کو اس کے کسی حواری نے مشورہ دیا کہ اسے آکسفورڈ یونیورسٹی بھجوا دیا جائے اس کا خیال تھا کہ وہاں رہ کر وہ انگریزوں کی سی حاکمیت سیکھ جائے گا پھر وہ یہاں کا ایک پڑھا لکھا وڈیرہ ہو گا۔ منکو خان نے یہ بات مان تو لی تھی لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی طبیعت میں تبدیلی آنے میں خاصا وقت لگ جائے گا اور جب تک وہ میرے ساتھ مل کر معرکے سر نہیں کرے گا اس کے لیے مشکلات آتی رہیں گی وڈیرہ شاہی چلانے کے لئے تربیت کی ضرورت ہے تعلیم کی نہیں لیکن اب تو اس نے ہاں کر لی تھی۔ رحیم بخش ولایت چلا گیا۔

رحیم بخش جب آکسفورڈ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کر کے واپس آیا تو وہ بے حد بدلا ہوا انسان تھا اس کی زندگی میں نظم وضبط تھا اور وہ قانون کو بڑی اہمیت دیتا تھا، انصاف کا اس کا اپنا ایک مخصوص نظریہ تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بات بھی قانون کے خلاف ہو۔ طبیعتوں کا یہ تضاد بڑھتا چلا جا رہا تھا منکو خان کو یہ باتیں زہر لگتی تھیں۔ اگر وہ اکلوتا بیٹا نہ ہوتا تو وہ اسے پہلے ہی دن ختم کر دیتا اسے بے حد افسوس تھا کہ اس نے اس پر اتنی رقم برباد کی اور اپنے لیے ایک بہت بڑا مخالف پیدا کر لیا جس آدمی نے منکو خان کو اسے ولایت بھیجنے کا مشورہ دیا تھا منکو خان نے اسے بہت ذلیل کیا اور اس کی پگڑی اتار کر پاؤں تلے روندھی

اور کہا تم میرے خیر خواہ نہیں میرے دشمن ہو۔

باپ اور بیٹے کی جنگ شروع ہو گئی۔ دونوں اپنے اپنے اصولوں کو بہتر سمجھتے تھے، اس کا حل منگو خان نے یہی نکالا کہ رحیم بخش کو شہر میں ایک بہت بڑا کاروبار کروایا اور اسے مجبور کیا کہ وہ اب شہر میں ہی رہے اگر چاہے تو اپنی ماں کو بھی لے جائے۔ رحیم بخش کو کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ باپ سے ٹکرانا بھی نہیں چاہتا تھا شہر چلا گیا۔

منگو خان پھر اپنے مشاغل میں مصروف ہو گیا۔ ڈاکو اتنا مال لاتے تھے کہ اس کا سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا اس کی وجہ سے دشمنیاں بھی بڑھ رہی تھیں۔ ڈاکوؤں کا چیف فتو خان جو کہ منگو خان کا دست راست تھا کچھ الجھا الجھا سا رہنے لگا بعد میں معلوم ہوا کہ فتو کی بیٹی سیانی ہو گئی ہے اس کی شادی کی فکر تھی، کوئی مناسب اور شریف آدمی رشتے کے لئے تیار نہیں تھا لوگ جانتے تھے کہ فتو خان بے حد خطرناک قسم کا ڈاکو ہے بات بعد میں کرتا ہے پہلے گولی مارتا ہے ایسے آدمی سے رشتہ داری کا کوئی شخص تصور بھی ذہن میں نہیں لا سکتا تھا اور فتو اپنے جیسے ڈاکو کو یہ رشتہ دینا پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ سوچتا میری زندگی تو گناہوں میں بیت گئی اب ایسا نہ ہو کہ بیٹی کو کوئی اچھا شوہر نہ مل سکے۔ فتو ایک بیٹی کا باپ تھا اور یہ مسئلہ نہایت ہی نازک اور الجھا ہوا تھا۔ کہتے ہیں ایسے آدمی کے دل میں نیکی کا ایک خاص تصور ہوتا ہے۔ جس تک وہ خود تو نہیں پہنچ پاتا لیکن کسی نہ کسی کے ذریعے وہ چاہتا ضرور ہے کہ وہ نیکی کا راستہ اختیار کرے نہ جانے کب اور کیسے منگو خان نے اپنے ایک دوست کے مشورے سے یہ بات کہلوائی تھی کہ وہ فتو کی بیٹی سے شادی کرنے کے لئے تیار ہے۔ فتو گو کہ منگو خان کا دست راست تھا اس کے باوجود یہ بات اس کے بدن میں تیر کی طرح ترازو ہو گئی وہ بلبلا اٹھا۔ اس کے دل میں منگو خان کی کوئی عزت نہیں رہی تھی اس کا دل میلا ہو گیا لیکن اسے منگو خان کی بے پناہ طاقت کا اچھی طرح اندازہ تھا اس لئے خاموشی اختیار کی شاید بات ٹل جائے۔ منگو خان ایک ضدی اور سر پھرا شخص تھا اس نے فتو کی خاموشی کو بغاوت کے مترادف سمجھا۔

ایک دن منگو خان بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا۔ بڑھاپا شروع ہو چکا ہے موت کا کیا بھروسہ نہ جانے کب آن دبوچے۔ پھر اسے اپنا تعلیم یافتہ بیٹا رحیم بخش یاد آیا۔ اس کا منہ کر کرا ہو گیا وہ اس کے لئے قطعی

بے کار تھا۔ رحیم بخش کی اچھی باتیں بھی اسے اچھی نہیں لگتی تھیں اور کبھی کبھی تو وہ اپنی نفرت کا اظہار کر بھی دیتا تھا وہ کرتا بھی کیا یہی ایک راستہ اس کے لئے کھلا ہوا تھا۔ ہوسکتا ہے جب عملی زندگی میں رحیم بخش قدم رکھے تو اس کی باتیں اس کی سمجھ میں آجائیں اور اس طرح اس کی جانشینی کا مسئلہ حل ہو جائے لیکن اس کے لئے وہ کب تک انتظار کرسکتا تھا یہ مسئلہ اس کے لئے نہایت صبر آزما تھا اور اس کے لئے اس کے پاس وقت نہیں تھا لیکن وہ کرے بھی تو کیا یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

ایک دن اس کے ایک حواری نے مشورہ دیا۔ فتو یوں تو نہیں مانے گا تو اس کی بیٹی کو اٹھا لے بعد میں شادی بھی ہوسکتی ہے۔ ماسٹر صاحب کی بیٹی کو تو اٹھا کر ہی تو لایا تھا۔ عزت دار آدمی تھا بعد میں شادی کرتے ہی بنی تھی۔ فتو بھی ایسا ہی کرے گا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فتو کی بیٹی سے کوئی بیٹا ہو جائے اس کی تربیت تم خود کرنا۔ اسے زندہ رہنا تم خود سکھانا تمہاری جانشینی کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ رحیم بخش کا انتظار کرنا اب فضول ہے۔ وہ تمہارے مطلب کا نہیں رہا۔ منکو خان کو امید کی ایک کرن نظر آئی۔ پھر سوچا بیویاں میری اور بھی ہیں اگر اس سے بھی اولاد نہ ہوئی تو بات وہیں کی وہیں رہے گی۔ پھر جیسے کسی نے اس کے کان میں کہا تجربہ کرنے میں کیا حرج ہے۔ مشورہ دینے والے نے اسے پھر الجھا دیا۔

منکو خان فیصلہ کر کے اٹھا۔ تجربہ کرنے میں کیا حرج ہے جو کچھ ہونا ہے وہ تو ہو گا ہی منکو خان نے بڑے شوق سے قد آدم آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ میں ابھی اتنا بوڑھا بھی نہیں ہوا ہوں مونچھوں میں ضرور سفید بال زیادہ آگئے ہیں۔ اس نے خضاب لگایا۔ مونچھوں کو بل دیئے۔ پگڑی کو اور اونچا کیا اور جب اس نے کلاشن کوف اٹھائی اور اپنی سیاہ عربی گھوڑی پر سوار ہوا تو اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے دراصل اس کا یہ معمول تھا جب وہ کسی بھی معرکے پر جاتا تھا۔ آج کا معرکہ بھی ایسا ہی تھا صرف اس میں رومان کا عنصر زیادہ تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے کچھ سے کچھ ہونے لگا گولیاں چلنے لگیں گوٹھ والے حیران اور پریشان تھے باہر سے کوئی حملہ آور نہیں آیا تھا۔ یہ سب اپنے ہی لوگ تھے اس محلے میں گولیاں چل رہی تھیں جو منکو خان کے جان نثاروں کا تھا۔ فتو تو اپنے مشن پر گیا ہوا تھا اس کے چند آدمی گھر پر موجود تھے جو منکو خان کی ہیبت

سے خائف تھے وہ حیران تھے ان کی سمجھ میں بات ہی نہیں آرہی تھی یہ کیا ہو رہا ہے کیوں ہو رہا ہے لیکن جب منگو خان نے فتو کی بیٹی پر ہاتھ ڈال دیا تو گولیوں کی آوازیں زیادہ تیز ہو گئیں۔ فتو بھی نہ جانے کہاں سے قسمت کا مارا آ گیا۔ وہ مالک کو اس حالت میں دیکھ کر حیران تو ہوا لیکن اس کی غیرت یہ برداشت نہ کر سکی کہ اس طرح اس کی موجودگی میں کوئی اس کی بیٹی کو اٹھا کر لے جائے اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اس نے منگو خاں کو زور سے آواز دی جواب میں منگو خان نے فائر کھول دیا اور فتو کی گھوڑی زمین پر گر کر تڑپنے لگی۔ فتو نے ایک دفعہ آسمان کی طرف دیکھا پھر اپنی بیٹی کی بے کسی دیکھی ایک لمحہ کے لئے اس کی زندگی کے سارے واقعات بجلی کی طرح آئے اور اسے بہت سی باتیں یاد آ گئیں اس کی آنکھیں ابل پڑیں ان سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ ڈاکو کی کوئی عزت نہیں بیٹی بیٹی ہی ہوتی ہے خواہ وہ ڈاکو کی ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی کلاشن کوف سے ایک شعلہ نکلا۔ منگو خان کی لاش زمین پر پڑی تھی۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا اسکی انگلی لبلبی پر رکھی کی رکھی رہ جائے گی۔

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ رحیم بخش بھی آ گیا۔ رحیم بخش کے لئے یہ بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں ایک عزم تھا۔ وہ طیش میں نہیں آیا۔ اپنے بابا کی لاش پر آ کر وہ کھڑا ہو گیا اس کی آنکھیں نم تھیں اس نے ایک لمحے کے لئے اپنی ماں کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں ویران ویران سی تھیں سکتہ سا ہو گیا تھا۔

رحیم بخش کی آواز اس خاموشی میں گونجی۔ لوگو تم سب کے ساتھ انصاف ہو گا۔ میرے باپ نے جو ظلم کیے ہیں میں ان کی تلافی کی کوشش کروں گا۔

سورج غروب ہو رہا تھا پہاڑیوں کے پیچھے اس نے اپنا منہ چھپا لیا تھا۔ رحیم بخش نے کہا کل صبح ایک نیا سورج طلوع ہو گا نئے عزم، حوصلے امید اور توانائی کے ساتھ۔

کہانی

محمد عباس

اداس پرندے☆

ایک بوڑھے درخت کی سب سے اونچی شاخ پر دو پرندے اداس بیٹھے تھے۔ دن کا پچھلا پہر تھا دونوں خاموش تھے اور مایوس نظروں سے دائیں بائیں دیکھ رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں کسی کا شدت سے انتظار ہے۔ دونوں عمر کے اس حصے میں تھے جب زندگی خزاں کی زد میں آجاتی ہے اور قدرت کی طرف سے بلاوے کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ اس بوڑھے جوڑے کے بچے بڑے ہو کر اور بال و پر نکال کر اڑ گئے ہیں اور اپنے لئے علیحدہ گھونسلے بنا چکے ہیں۔ اب بوڑھے پرندوں کا گھونسلا خالی ہے اور ایک اجاڑ سے گھر کا منظر پیش کر رہا ہے پھر بھی روزانہ شام ہوتے ہی یہ اداس جوڑا غیر آباد گھونسلے کی طرف لوٹ آتا تھا کھا پی کر چند ضروری اور غیر ضروری باتیں کر کے سونے کی کوشش کرتے مگر نیند کے انتظار میں کافی وقت لگ جاتا اس دوران وہ اپنے کسی بچے کا ذکر چھیڑتے مگر اداس ہو کر جلد ہی خاموش ہو جاتے انہیں ہر روز اپنے بچوں میں سے کسی نہ کسی کا انتظار رہتا مگر کوئی نہ آتا۔ دل برداشتہ ہو کر وہ غنودگی کی کیفیت میں پناہ لیتے انہیں یاد آتا کہ کبھی ان کے گھونسلے میں رونق ہوتی تھی بچے کھیلتے کلکلیاں کرتے اور ایک دوسرے کو چھیڑتے اور تنگ کرتے یہ دونوں انہیں دیکھ کر خوش ہوتے رہتے یہ دونوں دانا دنکا چن کر جب واپس آتے تو ان کے بچے اچھلتے کودتے ان کا استقبال کرتے درخت کی خاموش شاخوں میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی مگر بچوں کے چلے جانے کے بعد ان کی شامیں اداس ہو گئیں کیونکہ درخت بھی خاموش اور ساکن ہوتا کوئی آواز نہیں آتی تھی وہ دونوں مایوس سے ہو کر خالی گھونسلے کی طرف لوٹ آتے ان کی آنکھیں بھیگی ہوتیں لب ہل رہے ہوتے اور انہیں زندگی بے معنی سی محسوس ہوتی انہیں وقت رکا ہوا محسوس ہوتا انہیں اپنے کھانے پینے سے بھی اب کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی بس ایک

☆ ''اداس پرندے'' ایک استعارہ ہے جس کے گرد فاضل مصنف نے پاکستانی معاشرے میں اُن بوڑھے والدین کے کرب تنہائی اور اذیت ناک احساسات کا تانا بانا بنا ہے جن کے بچے انہیں چھوڑ کر سمندر پار کے ملکوں میں چلے جاتے ہیں۔ (ادارہ)

عادت تھی جسے وہ پوری کر لیتے۔

اجڑے اور غیر آباد گھر کے سربراہ کی کوشش ہوتی کہ زندگی میں کچھ نہ کچھ دلچسپی قائم رہے اور دونوں کا وقت کسی حد تک آرام سے گزر جائے کبھی کبھی وہ کوئی کہانی چھیڑ دیتا کبھی ماضی کی باتیں کرتا اور اچھے دنوں کو یاد کرتا تو دونوں کچھ وقت کے لئے اپنی کلفت بھول جاتے تاہم وہ جلد ہی پھر اداس ہو جاتے خالی گھونسلا انہیں جلد ہی اداس کر دیتا اور وہ دونوں بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے۔

سونے سے پہلے کچھ بے معنی سی باتیں کرتے کرتے دونوں ادھوری نیند کی آغوش میں چلے جاتے خواب دیکھتے جن میں وہ اپنے بچوں کو واپس آتا ہوا دیکھتے اور خواب میں ان سے باتیں کرتے مگر صبح ہوتے ہی ان کی مایوسی اور اداسی انہیں دوبارہ گھیر لیتی نیند بھی پوری نہ ہوتی اور رات میں کئی بار ان کی آنکھ کھل جاتی پھر گھونسلے سے آہوں اور سسکیوں کی آوازیں آنے لگتیں صبح ہوتی اور وہ تھوڑا بہت کھا پی کر پھر اسی شاخ پر آبیٹھتے اور امید بھری نظروں سے اپنے دن کا آغاز کرتے خاندان کا سربراہ وقت گزاری کے لئے باتیں شروع کر دیتا کبھی وہ تاریخ کا سہارا لیتا کبھی فلسفیانہ باتیں کرتا اور زندگی کے مسائل پر تبصرہ شروع کر دیتا کبھی قسمت اور جبر وقدر کے مسئلہ پر باتیں کرنے لگتا بظاہر باتوں میں مصروف دونوں دائیں بائیں نظر ڈالتے کہ شاید کوئی بھولا بھٹکا بچہ آنکلے اسی موہوم امید کے سہارے وہ سارا دن گزار دیتے مذہب نفسیات تاریخ اور معاشرتی تجزیات سے تھک کر دونوں پرندے زندگی کی بے رحم حقیقتوں کا سامنا کرنے کے لئے اپنے خالی گھونسلے کی طرف لوٹ آتے اور ایک اداس اور طویل رات شروع ہو جاتی جس میں انتظار کی اذیت ان کا مقدر بن چکی تھی۔ گھونسلے کا سربراہ اپنی ہمسفر کو تسلی دیتا رہتا مگر یہ طفل تسلی ہوتی، پھر اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا جن کا موضوع بچوں کے باہمی تعلقات، ماں باپ کے حقوق وفرائض اور انسانی رشتے سے ہوتا۔ کبھی وہ ان نظریات کے بارے میں سوچتا جو سماجی ماہرین اور فلسفیوں نے وضع کر رکھے ہیں، کبھی وہ ماں کے مقام ومرتبہ کے بارے میں سوچتا وہ سوچتا کہ نپولین نے اپنی ماں کو دنیا کی خوبصورت ترین عورت کہا تھا کبھی وہ یاد کرتا کہ اقوام متحدہ کے سابق سیکریٹری جنرل اُوتھاں نے اپنی بوڑھی والدہ کے پاؤں پر سجدہ کیا تھا اور اس کی یہ سجدے کی حالت میں تصویر کسی امریکی میگزین کے ٹائیٹل پر شائع ہو چکی تھی، کبھی وہ سوچتا کہ ماں تو وہ مخلوق ہے جس کی بابرکت گود میں

اللہ کے پیغمبروں نے پرورش پائی تھی معلوم نہیں کہ راہ خیالات کی کن کن دوریوں میں گھومتا اور بالآخر وہ ذہنی طور پر تھکاوٹ محسوس کرتا اور روحانی اور دلی طور پر مایوسی اور نا امیدی کا شکار ہو جاتا، پھر سوچتا کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی زندگی اسے دی ہے وہ اس نے گزارنا ہے کیوں نہ اس زندگی کو ہمت حوصلے اور ممکنہ طور پر قابل حصول خوشی اور خوشدلی سے گزارے وہ اپنی ہمسفر سے ہلکی پھلکی دلچسپ باتیں کرنے لگتا ماضی کتنا حسین تھا کتنا خوشگوار تھا۔ اس کی ہم سفر بھی ماضی کی خوشگوار یادوں میں شریک ہو جاتی اور کچھ وقت کیلئے ان کے اداس چہروں پر کچھ رونق آ جاتی۔ بزرگ پرندہ کبھی حضرت یوسفؑ کی باپ سے جدائی کا قصہ سناتا، کبھی پورن بھگت کی کہانی لے بیٹھتا، کبھی رام کے بن باس کی باتیں کرتا، وہ اصل میں اپنی ہم سفر کی اداسی اور مایوسی دور کر کے دل کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا رہتا۔ مگر حقیقت کو خیالی باتوں سے بدلنا ممکن نہیں ہوتا اس لئے کچھ دیر بعد پھر دونوں اداسی میں ڈوب جاتے ان کی اداسی کا کوئی مستقل اور پائیدار علاج نہیں تھا اگر تھا تو وہ اس کے بس کے باہر تھا کاش ان کے بچوں میں سے کوئی آ جائے اور ان کے ساتھ کچھ وقت گزارے پھر بے شک وہ اپنے نئے گھونسلے کو لوٹ جائے!

تحقیق و تلخیص: زاہد رضا خاں
ترجمہ : سید منصور عاقل

ترک ادیب اُرحان پاموک

(سال ۲۰۰۶ء کیلئے ادب کا نوبل انعام یافتہ)

اُرحان پاموک ۱۹۵۲ء میں استنبول (ترکی) میں پیدا ہوا۔ اپنی کتاب ''استنبول'' میں لکھتا ہے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد سے ۲۲ سال کی عمر تک آرٹسٹ بننے کے شوق میں مصوری کے شعبہ سے وابستہ رہا۔ امریکن رابرٹ کالج استنبول سے ڈگری حاصل کرنے کے بعد استنبول ٹیکنیکل یونیورسٹی میں تین سال تک فن تعمیر کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد صحافت کا شوق پیدا ہوا تو استنبول یونیورسٹی میں داخلہ لیا لیکن عملاً صحافت کبھی اختیار نہیں کی۔ ۲۳ سال کی عمر میں پاموک نے ناول نویس بننے کا فیصلہ کیا اور لکھنا شروع کر دیا۔

پاموک کا پہلا ناول ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا جسے ایوارڈز سے نوازا گیا۔ اگلے ہی سال پاموک نے اپنا دوسرا ناول شائع کیا جس پر ۱۹۹۱ء میں انعام دیا گیا۔ اس کا ناول ''قصر ابیض'' (The White Castle) ۱۹۹۰ء کے بعد انگریزی اور دیگر متعدد زبانوں میں ترجمہ ہوا جس کے بعد پاموک کی بین الاقوامی شہرت کا آغاز ہوا۔ پاموک کو ۱۹۸۵ء سے ۱۹۸۸ء تک امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی میں وزیٹنگ سکالر رہنے کا موقع ملا جہاں اس نے اپنا مشہور ناول ''کتاب سیاہ'' (The Black Book) لکھا جس میں استنبول شہر کی نہایت دل آویز منظر کشی کی گئی ہے یہ ناول ترکی میں ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا اس کے فرانسیسی زبان میں ترجمہ پر انعام دیا گیا۔ اس ناول کے بعد پاموک کو بین الاقوامی سطح پر مزید پذیرائی حاصل ہوئی اور اُس کی تخلیقی و تخیلی صلاحیتوں کا اعتراف کیا گیا۔

پاموک کا ناول ''حیات نو'' (The New Life) جس میں یونیورسٹی کے نوجوان طلباء کو موضوع بنایا گیا ترکی ہی میں ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا جسے ترکی ادب میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب قرار دیا گیا۔ ۱۹۹۸ء میں پاموک کا ایک اور ناول ''میرا نام احمر ہے'' (My Name is Red) شائع ہوا جو

عثمانی اور فارسی فنکاروں اور ان کے غیر مغربی دنیا کو دیکھنے اور پیش کرنے کے انداز کا احاطہ کرتا ہے اس ناول پر مصنف کو فرانسیسی۔ اطالوی اور دوسرے بین الاقوامی اعزازات ملے۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے وسط سے پاموک کا انداز تحریر مملکت ترکی کے حوالے سے تنقیدی ہو گیا اور اس نے حقوق انسانی نیز آزادیٔ اظہار کے موضوعات کو اپنا نصب العین بنالیا اس کے باوجود پاموک نے سیاست سے کوئی باقاعدہ وابستگی اختیار نہیں کی۔ ایک اور ناول ''برف'' جسے وہ اپنا پہلا اور آخری سیاسی ناول کہتا ہے ۲۰۰۲ء میں منصۂ شہود پر آیا۔ اس ناول میں سیاسی دین پسندوں' فوجیوں' سیکولر عناصر نیز ترک اور کرد قوم پرستوں کے مابین کشمکش اور شدت پسندی کی پُرمعنی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ۱۹۹۹ء میں ''رنگ ہائے دگر'' (Other Colours) کے عنوان سے پاموک کے ادب وثقافت سے متعلق اُن مضامین کا مجموعہ چھپا جو مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہو چکے تھے ان کے علاوہ پاموک کی نجی یادداشتوں پر مبنی نگارشات بھی اس مجموعہ میں شامل کی گئیں۔

پاموک کی کتاب ''استنبول'' اُس کی سوانح پر مشتمل ہے جو ایک شاعرانہ کاوش ہے یہ مصنف کی ابتدائی یادداشتوں اور استنبول شہر پر ایک ایسے پُرکشش مضمون پر مشتمل ہے جسے مصنف کی ذاتی البم سے لی گئی تصاویر اور مغربی مصوروں اور فوٹو گرافروں کی بنائی ہوئی نادر تصویروں سے آراستہ کیا گیا ہے اُن تین برسوں سے قطع نظر جو پاموک نے نیویارک میں گزارے اس کی باقی تمام عمر استنبول کے گلی کوچوں میں گذری ہے۔ گزشتہ تیس سال سے لکھنے کے علاوہ پاموک نے اور کوئی کام نہیں کیا نہ پیشہ اختیار کیا' اُس کے ناول اب تک چالیس سے زیادہ عالمی زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

پاموک کی تخلیقات نے ترک قوم کی نفسیاتی ساخت پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ اُس کی تحریروں کا عمومی ہدف ثقافتی تبدیلی اور ایک ایسے ملک میں مغربی انداز میں زندگی بسر کرنا ہے جو مغربی نہیں ہے۔ پاموک ماضی کی جستجو میں سرگرداں نظر آتا ہے اور وہ ماضی کے معاشروں اور کرداروں پر اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے۔ ایک صدی سے زیادہ ترک عوام کی زندگی میں مغربی سانچوں میں ڈھل جانے کا جارحانہ رجحان سرکاری ترجیحات کا حصہ بنا رہا ہے۔ پاموک بھی اسی حکمران طبقہ کی پیداوار ہے اور اُس نے اس عہد سے بھرپور استفادہ کیا ہے' لیکن اُس کی تخلیقات اس کے عالمی گردو پیش کی طرح ایک طویل تر

عمرانی، ثقافتی اور مذہبی تاریخ کی نشاندہی کرتی ہیں۔

پاموک اپنی ہم عصر ترک نسل کا ایسا ناول نویس ہے جو ہم عصر یورپی ادب کے بحرِ ذخار میں غواصی کی بہترین صلاحیتیں رکھتا ہے وہ اس بات پر مسرور و مطمئن ہے کہ وہ سب کچھ دراصل روایتوں کی بازیافت ہے جسے اُس کے اکثر قارئین تجزیہ و ایجاد سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ ایسی روایتی دانش کا منکر ہے جو مغرب پسندی کے جنون کی اسیر ہو اور ماضی کو یکسر فراموش کر دے۔

پاموک کہتا ہے ''کُردوں کا معاملہ انتہائی اذیت ناک ہے۔ میں نے اس سلسلہ میں واضح سیاسی بیانات بھی دیئے ہیں اور نہ صرف کُردوں کی مدافعت کی ہے بلکہ اس مسئلہ کے جمہوری انداز میں حل کئے جانے پر زور دیا ہے، چنانچہ اس ضمن میں میرے خلاف شدید ردِعمل پایا جاتا ہے لیکن میں اپنی پیشانی پر ''آزادی کے لئے لڑنے والے مزاحمت کیش مصنف'' کا لیبل چسپاں دیکھنا نہیں چاہتا اور نہ ہی میں ایک ''سیاسی ادیب'' کی حیثیت سے اپنی شناخت پسند کرتا ہوں، میرا مقصد ''تبدیلی کی مابعد الطبیعات'' اور ماضی کی شناخت کے بارے میں انسانی ردِعمل تک محدود ہے۔ میرے نزدیک مشرق و مغرب یا جدت و روایت کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ کسی نہ کسی سبب روایت تبدیل ہو جاتی ہے۔ مجھے تو صرف اُس کی فکر ہے جسے ہم گنوا بیٹھے ہیں۔''

مزید کہتا ہے:

''مشرق و مغرب کے درمیان میں ایک پُل کا کردار ادا کرنا چاہتا ہوں کیونکہ پل کا تعلق کسی بھی براعظم (خطہ) سے نہیں ہوتا اور نہ اس کا تعلق کسی تہذیب سے ہوتا ہے اس کی نظر دونوں تہذیبوں پر ہوتی ہے اور پھر بھی وہ ہر دو کے لئے ایک بیرونی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔''

ثقافتوں کا تصادم:

پاموک کہتا ہے ''میرے نزدیک ثقافتوں کے درمیان تصادم کی بات چاہے وہ مغرب کی جانب سے ہو یا مشرق کی جانب سے جس سے میرا بھی تعلق ہے بنیادی طور پر غلط ہے یہی بات میں نے اپنے ناولوں میں کہی ہے کہ ہمیں پلٹ کر دیکھنا چاہئیے کہ وہ تمام نسلیں چاہے ان کا تعلق مغرب سے ہو یا

مشرق سے صرف نسلیں ہیں۔ چنانچہ مشرق و مغرب اپنی جگہ جغرافیائی حقیقتیں سہی لیکن ان سے متجاوز وابستگی کا احساس جنگ کا راستہ ہموار کرتا ہے۔ میرا یہ یقین ہے کہ ترکی نے گزشتہ ماہ و سال کی رفتار کے دوران اپنی جمہوریت کو خود بربادی کی نذر کیا ہے کیونکہ اسکے دانشوروں نے نیز میڈیا اور پریس نے مشرق کی مشرقیت اور مغرب کی مغربیت پر اپنے ایقان وایمان کا ضرورت سے زیادہ اظہار کیا ہے جب ترکی مغربیت کی آغوش میں چلا گیا تو اس ملک کے اُن پس ماندہ طبقات نے جو رجعت پسند تھے۔ غریب تھے۔ ان پڑھ تھے اور نچلے طبقوں سے تعلق رکھتے تھے جدت پسندی کے تقاضوں کی مزاحمت کی جیسا کہ دنیا بھر میں رواج چلا آیا ہے۔ وہ روایتی زندگی کا تحفظ چاہتے تھے چنانچہ سب کچھ عین معمول کے مطابق تھا کیونکہ جب جدت پسندی کی طرف سفر کا آغاز کیا جاتا ہے تو یہی کچھ ہوتا ہے افسوسناک امر یہ ہے کہ ایسے طبقوں کے خلاف ترک مملکت کا ردعمل انتہائی سفاک اور جارحانہ تھا اُن کی تحقیر وتوہین کی گئی۔ اُن کے تمدن و معاشرت کو پست سمجھا گیا اور ان کے دکھ درد کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی چنانچہ یہی وجہ تھی کہ اُس ماضی سے ہم ہاتھ دھو بیٹھے۔ ۱۱ ستمبر کے واقعہ کے بعد اب میں محسوس کرتا ہوں کہ امریکہ۔ یورپ اور تمام مغرب اُسی غلطی کا اعادہ کر رہے ہیں جو اسی برس قبل ترکی سے سرزد ہوئی تھی۔

اُرحان پاموک مزید کہتا ہے کہ ''میں ایک ناول نگار ہوں میرے پاس ان مسائل کا کوئی حل نہیں ہے لیکن میں وہ ناول جو گذشتہ پچیس برس سے لکھ رہا ہوں ان میں انہیں مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ شناخت کے مسائل کسی تہذیب سے وابستہ ہونے کا احساس اور بعض لوگوں کا یہ خیال کہ تہذیبیں قریب نہیں آسکتیں یا میری طرح وہ لکھنے والے بھی ہیں جنہوں نے ادب کے ذریعے ان موضوعات کو حدف توجہ بنایا ہے اور اپنے قارئین کو بتایا ہے کہ اصل بات تہذیبوں کی نہیں بلکہ انسانی زندگیوں کی ہے روزمرہ زندگی کے چھوٹے موٹے معمولات کی ہے اور زندگی کے ماحول میں رچے بسے رنگوں اور خوشبوؤں کی ہے جو ہماری زندگی کے گردان گنت کہانیوں کے تانے بانے بُن دیتے ہیں۔

۱۲۔ اکتوبر ۲۰۰۶ء کو جب سویڈن کی اکادمی نے اُرحان پاموک کے لئے نوبل انعام برائے ادب کا اعلان کیا تو وہ تمام پیش گوئیاں دھری کی دھری رہ گئیں جو شام کے معروف و مقبول شاعر علی احمد

سعید کے حق میں کی گئی تھیں۔ اکادمی کے قرطاس تحسین وتعارف میں کہا گیا کہ ''اپنے آبائی شہر استنبول کی غمزدہ روح کی جستجو میں پاموک نے ثقافتوں کے تصادم کی نئی علامتوں کو دریافت کیا ہے۔''

سال ۲۰۰۵ء کے دوران ترکی کے وکلاء کی دو پیشہ ورانہ تنظیموں نے پاموک کے خلاف فوجداری الزامات عائد کئے جن کا تعلق ۱۷-۱۹۱۵ کے آرمینی قتل عام اور اناطولیہ میں تیس ہزار کردوں کی اُس خونریزی سے تھا جن کے بارے میں پاموک نے بیان جاری کیا تھا تاہم ۲۲ جنوری ۲۰۰۶ء کو یہ الزامات ختم کر دیئے گئے۔ بعد کے ایک بیان میں پاموک نے کہا کہ اُس کا مدعا اظہار رائے کے مسائل کی جانب توجہ دلانا تھا۔ پاموک پر جب یہ الزامات لگائے گئے تھے تو بین الاقوامی سطح پر ایک ہیجان برپا ہو گیا تھا اور یورپین یونین میں ترکی کی شمولیت کے حوالے سے بحران پیدا ہو گیا تھا، چنانچہ یورپی پارلیمنٹ نے اعلان کیا تھا کہ وہ پانچ ارکان پر مشتمل ایک وفد اس مقدمے کی کارروائی دیکھنے کے لئے بھیجے گی۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے بھی ایک بیان جاری کیا کہ پاموک اور چھ دوسرے افراد جو اس مقدمہ میں ملوث تھے انہیں رہا کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ عالمی شہرت یافتہ اُٹھ اہل قلم نے بھی پاموک کے خلاف اس مقدمہ کی سخت ترین الفاظ میں مخالفت کی اور اسے حقوق انسانی کی صریح خلاف ورزی قرار دیا، چنانچہ جب پاموک کے خلاف یہ الزامات واپس لے گئے تو مغربی میڈیا میں اس خبر کا زبردست استقبال کیا گیا۔

فارسی

بشیر حسین ناظم

نعتِ رسولِ مقبولؐ

جز مدحتِ رسولؐ نبود است کامِ ما
زنشد مے شرابِ مودّت بہ جامِ ما

بادِ صبا ز زلفِ نبیؐ غالیہ بیار
از طیبِ گل سکوں نہ پذیرد مشامِ ما

آراستہ ز نعت نبیؐ چوں شود زباں
آید ہمائے بخشش و غفراں بدامِ ما

گرویم گرد روضۂ مقصود کائناتؐ
زاہد چرا نہ چرخ بگردد بکامِ ما

ازیمن مدح و وصف طرازیٔ شاہ دیں
"ثبت است برجریدۂ عالم دوامِ ما"

ماخاک پائے خواجۂ دیںؐ، بوترابی ایم
بالاست از بلندیٔ کیواں مقامِ ما

مارا چہ باکِ زیغ و ارابہ و گمرہی
مولا علیستؑ، بندۂ مولا، امام ما

خواہیم در ثنائے پیمبر دہیم جاں
مارا رسانِ الٰہی بہ قصد و مرام ما

مائیم بلبلان چمن زار حمد و نعت
خوش قسمتیم ، ہست مدینہ کنام ما

حب و ولائے آلِ رسولؐ است فضلِ حق
عشقِ نبیؐ ست مایۂ یحیِ العظام ما

واعظ کند پسند لذائذ، ولے رفیق!
ذکر خداست جزوِ طعام و ادامِ ما

رخسارۂ بدور و شموس و نجومِ عرش
روشن شود ز جلوۂ ماہِ تمام ما

طوبیٰ لنا، بہ زمرۂ عشاق مصطفیؐ
ناظم نوشتہ ہست بہ فردوس، نام ما

حسن عسکری کاظمی

نعت

وہ فخرِ آدمؑ و عیسیٰؑ حبیبؐ ربِ جلیل
وہ بے مثال کا بندہ نہ کوئی جس کا مثیل

وہی ہے موجبِ تخلیق آسمان و زمیں
وہ کائنات کا شاہد وہ زندگی کی دلیل

خدا نے بھیجا ہے اسؐ پر درود کیا کہنا
حبیبؐ پاک وہ نُور مبیں وہ اصلِ اصیل

اسیؐ کے دم سے شعورِ وفا کا پیمانہ
اسیؐ کے فیض سے جنت کا مستحق ہے قتیل

جہانِ حُسن کا فرماں روا غلام اس کا
اذانِ عشق میں وہ صاحب جمال و جمیل

اسیؐ نے دینِ براہیمؑ کو رکھا زندہ !
وہیؐ ہے نازشِ کل انبیاء و فخرِ خلیل

اسیؐ کا ذکر ہے اک معجزہ زمانے میں
کہاں وہ ذاتِ گرامی کہاں یہ عمر قلیل

حصیر نوری

نعت

خدا کی حمد اور نعت نبیؐ میں
فلاحِ دین و دنیا ہے اسی میں

حبیبؐ کبریا کو یاد رکھیے
ہمیشہ راحت و رنج و خوشی میں

دکھا دے مجھ کو بھی یارب دکھا دے
دیارِ مصطفیٰؐ بھی زندگی میں

خدا خود عاشق و شیدا ہے انؐ پر
کوئی تو بات ایسی ہے نبیؐ میں

سرِ محشر یہ سرمایہ ہے کافی
جو گزرے زندگی یادِ نبیؐ میں

غلامی میں محمدؐ کے جو پائی
کہاں لذت ہے ایسی خواجگی میں

حصیر خستہ جاں لازم ہے دن رات
گزارو مصطفیٰؐ کی پیروی میں

صابرؔ عظیم آبادی

نعت

مہ جبین و دل نشین و مہ جمال
حُسن تیرا بے نظیر و بے مثال

سوچتا رہتا ہوں میں تنہائی میں
کب مدینے جاؤں ،کب ہو گا وصال

دشتِ غربت میں نہ بھٹکا میں کبھی
رہبری کرتا رہا تیرا خیال

فکرِ فردا اب نہیں آقاؐ مجھے
تیری رحمت دھوگئی گردِ ملال

ارفع و اعلیٰ ہے تیرا مرتبہ
تو بلندی ، تو ثریا ، تو کمال

تیرے جیسا میں نے دیکھا ہی نہیں
خوش جمال و خوش خیال و خوش خصال

ڈوب جائے روشنی میں تیرگی
غم کے ماروں پر ستاروں کو اچھال

ہو اگر چشمِ عنایت اس طرف
بیت جائیں زندگی کے ماہ وسال

صابرؔ خستہ کو بھی شاہِ عرب
عشق کی دولت سے کردے مال مال

مشتاق شبنم

نعت

درحقیقت آپؐ سا کوئی کہاں! کوئی نہیں
اے شفیع المذنبینؐ اے مہرباں! کوئی نہیں

ہیں پیمبر اور بھی پر آپؐ سا اللہ کا
ہم مزاج وہم خیال وہم زباں کوئی نہیں

دوستو معراج کی تفصیل کیا تفسیر کیا
جب محمدؐ اور احد کے درمیاں کوئی نہیں

انبیاء میں مرتبہ یہ ہے مرے سرکارؐ کا
برگزیدہ سب ہیں وجہ کُن فکاں کوئی نہیں

دیکھئے قرآن کو اس زاویے سے دیکھئے
آپ کی سیرت کا ایسا ترجماں کوئی نہیں

ہر بشر شبنم بقدرِ ظرف پاتا ہے مراد
گنبد خضرا کے جیسا آستاں کوئی نہیں

رباعی

قرآن کی ترتیل و روانی ہیں حضورؐ
تخلیقِ دو عالم کی کہانی ہیں حضورؐ
یوں سمجھے اگر کوئی سمجھنا چاہے
اک لفظ ہے اللہ معانی ہیں حضورؐ

عرش ہاشمی

نعت

ذوقِ طلب عطا کریں، حُسنِ نظر عطا کریں
اب ہیں دعائیں بے اثر، آقاؐ اثر عطا کریں

کوئی طلب مجھے نہ ہو، قلب ہو مطمئن مرا
زر کی طرف نہ جو اُٹھے ایسی نظر عطا کریں

میری زبان گنگ ہے، میرا قلم خموش ہے
نعت حضورؐ لکھ سکوں ایسا ہُنر عطا کریں

یادِ حضورؐ جن میں ہو، نعتِ حضورؐ جن میں ہو
آقاؐ ہمیں وہ روز و شب، شام و سحر عطا کریں

پیشِ نظر سدا فقط اُسوۂ مصطفٰےؐ رہے
اپنے کرم سے یا نبیؐ، ایسی نظر عطا کریں

در پہ جو اُن کے آگئے، دل کی مُراد پا گئے
کیسے کوئی کمی رہے، آقاؐ اگر عطا کریں

طیبہ نگر کی آس میں کب سے یہ عرشؔ ہے، اِسے
زادِ سفر عطا کریں ، اِذنِ سفر عطا کریں

حسن زیدی

نعت

دوستو جب سے کہ میں پیروِ حسّان ہوا
میری بخشش کا ہر اِک مرحلہ آسان ہوا

آپؐ کی ذاتِ مبارک سے جو انجان ہوا
اُس پہ مُطلق نہ خدا کا کبھی فیضان ہوا

اپنی کوتاہی پہ جو شخص پشیمان ہوا
اُس گنہگار کا حامی شہِؐ ذیشان ہوا

وِرد کرنے لگا میں نعتِ رسولِؐ عربی
جب کبھی گردشِ دوراں سے پریشان ہوا

نعت کے صدقے میں جو مانگا خدا سے پایا
پورا ہر ایک مرے قلب کا اَرمان ہوا

غیب سے زادِ سفر اُس کو مُہیّا ہوگا
جو بھی مدّاحِ نبیؐ بے سَرو سامان ہوا

میں ہوں سلطانِ دو عالم کا ثنا خواں کہ حسنؔ
منتظرِ میرا درِ خُلد پہ رضوان ہوا

ضیاالحسن ضیاؔ

نعت

نبیؐ کی نعت کرتا ہے بیاں دل
ضیاؔ خود بن گیا میری زباں دل

میں گردِ راہِ طیبہ ہو گیا ہوں
کہاں میں ہوں نجانے ہے کہاں دل

سفر کا اذن مل جائے جو مجھ کو
مدینے لے کے پہنچوں ناتواں دل

کھلے ہیں پھول شانِ احمدیؐ کے
ہے خوشبوئے نبیؐ سے گلستاں دل

نبیؐ کی یاد مہمانِ نبیؐ ہے
نبیؐ کی یاد کا ہے میزباں دل

نگاہیں سجدہ ریزی کر رہی ہیں
رسولِ پاکؐ کا ہے مدح خواں دل

رواں ہر سانس ہے طیبہ کی جانب
ضیاؔ میرا ہے میرِ کارواں دل

کرامت بخاری

سلام

آتے نہ کربلا میں جو سردارِ کربلا
کھلتا کہاں یہ عقدۂ دشوارِ کربلا

تفسیر مصحفِ رُخِ شبیر کے لیے
آئینہ خود ہے حاشیہ بردارِ کربلا

کیسے مٹائیں اِن کو زمانے کی ظلمتیں
آثارِ کردگار ہیں آثارِ کربلا

جن سے بندھی ہوئی تھیں اُمیدیں رسولؐ کی
وہ مرکزِ یقین ہیں سرکارِ کربلا

دنیا میں لازوال ہے شاہِ اُممؑ کا غم
دُنیا میں بے مثال ہے کردارِ کربلا

پیشِ نظر ہے منظرِ کرب دبلا ہنوز
آنکھیں ہوئی ہیں روزنِ دیوارِ کربلا

لاکھوں سلام اے مرے مولائے تشنہ کام
لاکھوں درود قافلہ سالارِ کربلا

ڈاکٹر خیال امروہوی

حُسینؑ شناسی

نشاطِ حرف سے پُر ہیں سماعتیں کیا کیا حسینیت نے عطا کیں علامتیں کیا کیا
صداقتوں کا صلہ ہیں عداوتیں کیا کیا ملیں نہ راہ انا ہیں جراحتیں کیا کیا

صنم پرست وفا کا نظام کیا جانیں
حسین ابن علی کا مقام کیا جانیں

اگرچہ عقل پہ ابلیسیت بھی طاری ہے صدائے حق کو دبانا ازل سے جاری ہے
جہاں ہے نُور وہاں کارگاہِ ناری ہے جفا کے زہر کا تریاق جانثاری ہے

غمِ حُسینؑ میں دل کی نجات شامل ہے
فقط نجات نہیں کائنات شامل ہے

بلا کی دھوپ میں صحرا کی لُو معاذ اللہ سر فرات تھے سوکھے سبُو معاذ اللہ
کہیں شجر نہ کہیں پر نمو معاذ اللہ ہر اک مقام پہ بکھرا لہُو معاذ اللہ

نگاہِ وقت نے جو امتحان دیکھا ہے
کسی نے ایسا کہاں خاندان دیکھا ہے

وہ دور دوشِ نبی پر جسے مقام ملا امام عصر رسالت سے ہمکلام ملا
مگر وہ عہد کہ جس میں عجب نظام ملا نہ حُسنِ ذات نہ یزداں کا احترام ملا

یہی ہے دین تو اس دین سے نجات ملے
حرم سے ہے کہیں بہتر کہ سومنات ملے

مگر حُسینؑ کے کردار کی نظیر نہیں یزیدیت سے زیادہ کوئی حقیر نہیں
زمانہ اتنا بھی ابلیس کا اسیر نہیں اسی کو مان رہا ہے جو بے ضمیر نہیں

حسینیت کسی صورت سے مر نہیں سکتی
کوئی صدی بھی فراموش کر نہیں سکتی

مرے قلم سے جو دردوالم برستے ہیں عدو بھی ان کے لئے روز وشب ترستے ہیں
درِ حسینؑ پہ جانے کے جو بھی رستے ہیں وہ اتنے عام نہیں اور نہ اتنے سستے ہیں

نجف کو چھو کے جو راہِ وفا نکلتی ہے
وہ علقمہ کے کنارے پہ جا نکلتی ہے

مقام شمس کو فاسق زمین کیا جانے عظیم فکر کا رتبہ کمین کیا جانے
فرازِ عرش کو شمرِ لعین کیا جانے عروجِ فقر کو خاقانِ چین کیا جانے

امام وہ ہے جو دانش کو عام کرتا ہے
صلیب جبر پہ چڑھ کر کلام کرتا ہے

حسینیت سے یزیدوں کو پاش پاش کریں نیا جہان نئے پاسباں تلاش کریں
جمود توڑ کے تخلیقِ ارتعاش کریں حسینیت کی حقیقت سبھی پہ فاش کریں

ہر اک قدم پہ عمل ایسا بے مثال ملے
کہ اپنی ذات ہی آئینہ کمال ملے

حُسین رہبر عالی وقار ودیں پرور بصیر و عادل و حماد و عبدِ مستظہر
اصیل باپ کا بیٹا عظیم ماں کا پسر گلوں کے رنگ میں بھی جس کے خون کا ہے اثر

جو سر بلند ہے نیچا کبھی نہیں ہو گا
حُسین دوسرا پیدا کبھی نہیں ہو گا

اسے جہاں میں تھا حاصل وہ اختیار حیات کہ اک اشارے پہ جھک جائیں سب جمادونبات
سمٹ کے مشک میں آجائے آبنائے فرات کھڑے ہوں حکم کے پابند سارے ادراکات

مگر کریم کبھی سنگ دل نہیں ہوتا
اسیر مخمصۂ آب و گِل نہیں ہوتا

ہمیں تو حُر کی طلب ہے جو سب کو چھوڑ آیا
مقام و مرتبہ نام و نسب کو چھوڑ آیا

وفا کی راہ میں زر کی طلب کو چھوڑ آیا
خلوص و عشق میں سارے عرب کو چھوڑ آیا

عظیم جبر کا لمحہ تو اس پہ بیت گیا
مگر وہ حق کا طرفدار مر کے جیت گیا

وقارِ حضرت عباس نامدار نہ پوچھ
ہٹائے کیسے کناروں سے پہرہ دار نہ پوچھ

حصولِ آب میں کھائے ہیں کتنے وار نہ پوچھ
ہوا ہے کیسے سکینہ سے شرمسار نہ پوچھ

وہ ایک وقت کہ دشمن نہ تشنہ کام رہے
یہ ایک دور کہ سوکھے سبھی کے جام رہے!

ڈاکٹر خیال امروہوی

☆

وہ دور بنے طرفہ عجب خوشخبری کا
معیار کھلے جس میں تری داد گری کا

ہر ضرب سے جب ٹوٹ کے گرتے رہے ٹکڑے
انجام نظر آیا ہمیں شیشہ گری کا

چندھیا گئیں جب روشنی طبع سے آنکھیں
تب درک فراہم ہوا روشن نظری کا

مقہور خدوخال کی صورت نظر آئی
آسیب مسلط ملا سرگشتہ سری کا

ایوان کے غرفوں سے کبھی جھانک ہی لیتے
موقع جنہیں ملتا ہی نہیں شب بسری کا

لاسلک سے رہتا ہے روابط کا چراغاں
لے گا نہ کوئی نام بھی اب نامہ بری کا

بجھنا ہے تو اک موج ہی کافی ہے ہوا کی
"کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا"

☆

دل تکملۂ جاں کا سبب کیوں نہیں ہوتا
وجدانِ سحر قاتل شب کیوں نہیں ہوتا

تسلیم کہ ہے معجزۂ روح بھی برحق
احیا مگر اس وصف کا اب کیوں نہیں ہوتا

شاہوں پہ ہی قرنوں سے ہے کیوں بارش انعام
ساتھی کسی قلاش کا رب کیوں نہیں ہوتا

مٹتی نہیں کیوں نسل کی فرسودہ روایات
منسوخ غم نام ونسب کیوں نہیں ہوتا

تہذیب میں کیوں رچ گئی اس درجہ فحاشی
ماحول پرستار ادب کیوں نہیں ہوتا

تعزیر کے تیزاب میں جب گھل گئے اعصاب
پھر پوچھنا کیا رقصِ طرب کیوں نہیں ہوتا

کب تک یونہی القاب کی بہتاب رہے گی
انسان کا انسان لقب کیوں نہیں ہوتا

مضطر اکبر آبادی

☆

دسترس سے آدمی کی دور کب مہتاب ہے
یہ تو اس کی فتح مندی کا درخشاں باب ہے

یا کسی بھی خواب کی تعبیر ہی کوئی نہ تھی
یا پریشاں کثرتِ تعبیر سے ہر خواب ہے

لوگ کہتے ہیں کہ ہے نایاب دنیا میں وفا
میں یہ کہتا ہوں کہ ہے یہ شے مگر کمیاب ہے

اول شب سے مسلسل تک رہا ہے، چاند کو
منتظر کس کا نہ جانے دیدہ بے خواب ہے

بے ادب لوگوں کا دنیا میں نہیں کوئی مقام
آدمیت کا شرف پابندئ آداب ہے

ڈوب جاتے ہیں سرِ ساحل بھی کم ہمت مگر
اہلِ ہمت کے لئے منجدھار بھی پایاب ہے

ہو چکا ہے آدمی بے دخل جس سے ایک بار
پھر اسی جنت میں جانے کے لئے بیتاب ہے

اس بہانے رابطہ رہتا ہے کچھ احباب سے
باعثِ تسکینِ دل بے مہرئ احباب ہے

زندگی ہے ایسے دریا کی طرح مضطر جہاں
جابجا کھولے ہوئے منہ اک نہ اک گرداب ہے

اکبر حیدر آبادی (آکسفورڈ۔ برطانیہ)

☆

یہ کیا کہ عشق تھا تقدیر کے احاطے میں
یہ کیا کہ دل رہا زنجیر کے احاطے میں

عجیب سہو یہ سرزد ہوا محبت سے
کہ رکھا حسن کو تشہیر کے احاطے میں

وہ حرفِ درد کہ مرقوم لوحِ دل پہ رہا
نہ آسکا کبھی تقریر کے احاطے میں

بس ایک خواب حقیقت نہ بن سکا ورنہ
ہزاروں خواب تھے تعبیر کے احاطے میں

تھی جن کے لمس کی دیرینہ آرزو دل کو
وہ خال و خد رہے تصویر کے احاطے میں

ہوئی جو فکر کو جنبش تو آب و گل کا جہاں
سمٹ کے آگیا تدبیر کے احاطے میں

ہزار چاہا مگر ساتویں جہت نہ ملی!
زمیں رہی فلکِ پیر کے احاطے میں

نگاہ رک گئی کیوں ایک ہی ستارے پر
جہاں تھے اور بھی تسخیر کے احاطے میں

اتر گیا وہ ہر اک دل میں دفعتاً اکبر
جو شعر آگیا تاثیر کے احاطے میں

سید رفیق عزیزی

☆

صبح کی رحل پہ آیاتِ طرب لے کر آ
شام کے طشت میں اوراقِ ادب لے کر آ

رشتۂ حضرتِ انساںؑ سے پتہ جس کا چلے
اپنی زنبیل میں وہ نام و نسب لے کر آ

آ رہا ہے تو ذرا اہلِ ملامت کے لئے
کچھ نہ کچھ بے طلبی کی ہی طلب لے کر آ

ظرف سازی ہو تو منّت کشِ اوزار نہ ہو
جس کا ڈھب تو نہ سمجھ پائے وہ ڈھب لے کر آ

پیاس کے لاکھے جسے ہونٹ میسّر ہوں اگر
صرف نظروں کے سمندر پہ وہ لب لے کر آ

ہمرہِ بے طلبی جنبشِ طلب ساتھ نہوں
جا مسبّب سے کوئی ایسا سبب لے کر آ

وہ جو میخانۂ تنزیہہ سے بے مانگے ملے
بزمِ تشبیہ میں وہ بنتِ عنب لے کر آ

جسم کیا، روح بھی رقصاں نظر آئے جس میں
نغمۂ کُن کا وہ پوشیدہ طرب لے کر آ

جس میں جب، اب کا تعین نہوا ے میرے رفیق
بے تعین کا کوئی ایسا ہی "اب" لے کر آ

شارق بلیاوی

☆

آبِ و گِل سے جدا سمجھتا ہے
خود کو وہ جانے کیا سمجھتا ہے

کون سا عکس کس طرح کا ہو
یہ ہنر آئینہ سمجھتا ہے

روشنی یونہی تو نہیں ہوتی
کیا ہے جلنا دیا سمجھتا ہے

پوچھتا ہی نہیں وہ حال کبھی
وہ مرا مدعا سمجھتا ہے

واقف گردشِ حیات ہے یہ
دل تری ہر ادا سمجھتا ہے

میں سمجھتا ہوں اک خدا کو بس
باقی باتیں خدا سمجھتا ہے

اک عبادت ہے بے خودیٔ عشق
پر زمانہ برا سمجھتا ہے

کس صدا میں ہے کرب پوشیدہ
دل درد آشنا سمجھتا ہے

حسن پروردۂ انانیت
ظلم کرنا روا سمجھتا ہے

سید مشکور حسین یاد

☆

اصل میں اپنا دیدۂ عریاں
شوق کا ہے جریدۂ عریاں

اس کے پیکر میں دیکھئے سنئے
قدِ آدم قصیدۂ عریاں

اس کی پل پل سے گرتے ہیں پھل پھول
ہے زمانہ چکیدۂ عریاں

سامنے آنے کی ہوس مت پوچھ
سارا عالم ندیدۂ عریاں

کیوں نہ مانندِ دیدہ کہیے اسے
ہے خموشی شنیدۂ عریاں

خوشبو جس کی تلاش میں کھو جائے
غم وہ رنگِ پریدۂ عریاں

زینتِ ہر افق ہے جس کا وجود
جاں ہے وہ خط کشیدۂ عریاں

ضامنِ تازگی و حرمتِ خلق
یادؔ وہ لب چشیدۂ عریاں

سہیل اختر

☆

مرے احباب کہنے کو وفا بھی ساتھ رکھتے ہیں
جو رُت بدلے تو نشتر کی ادا بھی ساتھ رکھتے ہیں

اگرچہ بال و پر ٹوٹے ہوئے ہیں ہم اسیروں کے
مگر ہم عزم و ہمت کی ہوا بھی ساتھ رکھتے ہیں

محبت میں کسی منزل پہ رشتہ ٹوٹ سکتا ہے
کہو تو واپسی کا راستہ بھی ساتھ رکھتے ہیں

یہ اہلِ زر اگر خنجر بکف ہیں تو انہیں کیا ڈر
غریبوں کے لئے یہ خوں بہا بھی ساتھ رکھتے ہیں

حقارت سے نہ دیکھو اے زمانے کے ستم کیشو
کہ ہم بے بس عصائے بددعا بھی ساتھ رکھتے ہیں

اگرچہ مضطرب رکھتی ہیں ہم کو ہجر کی راتیں
مگر ہم تیری یادوں کی ردا بھی ساتھ رکھتے ہیں

ترے قدموں میں سر اپنا جھکا دیتے ہیں خلوت میں
مگر محفل میں دل والے انا بھی ساتھ رکھتے ہیں

دیارِ ہجر میں سنتے ہیں شب کا بھی سفر ہوگا
چلو رختِ سفر میں اک دیا بھی ساتھ رکھتے ہیں

حسن عسکری کاظمی

☆

اپنی آنکھوں سے لہو میں تیرتے سر دیکھنا
خامشی سے یہ تماشا اور دن بھر دیکھنا

عافیت کوشی ہماری گھر میں ہم بیٹھے رہے
کھول کر دل کا دریچہ غم کا منظر دیکھنا

ہم نے مجنوں کی طرح شرطِ وفا پوری نہ کی
ہاتھ میں بچوں کے اب نفرت کے پتھر دیکھنا

ایک سناٹا فضا آئی بھرے بازار میں
دفعتاً کتنے بدن پھر خون میں تر دیکھنا

آشنائی کی سند ہاتھوں سے کس نے چھین لی
آتے جاتے اجنبی چہروں کو اکثر دیکھنا

رونقِ شہرِ نگاراں لوٹ بھی آئے حسن
رہ گیا تقدیر میں اجڑے ہوئے گھر دیکھنا

حسیر نوری

☆

تمام رنگِ جہاں میرے دیکھے بھالے ہیں
کہیں اندھیرے ہیں یارو کہیں اجالے ہیں

کوئی بھی مشورہ ان کو نہ دو تو بہتر ہے
جو اپنی راہ میں کانٹے بچھانے والے ہیں

ہوائے تیز سے شاخوں کے خشک پتے سب
ٹپک کے اشک کی مانند گرنے والے ہیں

تمام دن کی مسافت کے بوجھ نے یکسر
ہمارے جسم پہ گرد و غبار ڈالے ہیں

میں اپنے آپ کو ڈھونڈوں تو پا نہیں سکتا
جہاں زیادہ اندھیرے ہیں کم اجالے ہیں

سفر اسی کی رفاقت میں طے ہوا ہے حسیر
تمام راستے اس کے مگر نرالے ہیں

کرامت بخاری

☆

پھینک رہا ہے کوئی پتھر
یاد کی گہری جھیل کے اندر

جھلمل جھلمل کرتا جائے
سطح آب پہ اس کا پیکر

سمٹ گئی انکار کی خوشبو
پھیل گیا اقرار کا منظر

ساحل ساحل پیار کسی کا
روئے بانہوں کو پھیلا کر

وہم و گماں کی ویرانی میں
پھرتا رہتا ہوں میں اکثر

ٹھہر گیا رہوار تمنا
یہ کیسے انجام پہ آ کر

ہر لمحہ اک ذہنی الجھن
ہر ساعت اک بھاری پتھر

اس کو تو سمجھا نہیں پایا
دل کو ہی سمجھایا اکثر

☆

دشمنوں کے درمیاں لکھتے رہے
ہم محبت کی زباں لکھتے رہے

زیست کے سادہ ورق پر عمر بھر
زندگی کو امتحاں لکھتے رہے

گھر کی دیواروں میں گھر کے رہ گئے
اس قفس کو آشیاں لکھتے رہے

بجز شب غم کون تھا اپنا رفیق
رات کو ہی رازداں لکھتے رہے

حیرتی تھے اور حیرانی کے ساتھ
اس تحیر کا بیاں لکھتے رہے

ہم کسی خطرے سے بھی خائف نہ تھے
عمر بھر سچائیاں لکھتے رہے

کچھ نہ کچھ لکھنے کی عادت تھی ہمیں
حاصل عمر رواں لکھتے رہے

مڑ کے دیکھو تو کہیں کچھ بھی نہیں
وہ یقیں تھا یا گماں لکھتے رہے

منظور ہاشمی (علی گڑھ۔انڈیا)

☆

اک تری یاد ہے اور اک مری تنہائی ہے
بس ہمیں دونوں سے کیا انجمن آرائی ہے

جانے کس رنگ میں آیا وہ نظر آج ہمیں
آنکھ حیران ہے ، آئینہ تماشائی ہے

اتنی شدت سے اسے یاد کیا تھا دل نے
آئینہ توڑ کے، تصویر نکل آئی ہے

آج پھر اس نے ، مجھے یاد کیا ہے شاید؟
آج پھر دل کے دھڑکنے کی ،صدا آئی ہے!!

ماہ و خورشید کے آنگن کے کسی گوشے میں
اک ستارے نے چمکنے کی قسم کھائی ہے!

اور کھلتی رہے آنکھوں میں وہ صورت ، ورنہ
شوق کس کام کا، کس کام کی بینائی ہے

صابر عظیم آبادی

☆

سنگِ در بولتے ہیں در نہیں بولا کرتے
گھر ہوں ویران تو وہ گھر نہیں بولا کرتے

جو بھی دانا ہیں وہ اکثر نہیں بولا کرتے
چپ کے موسم میں سمندر نہیں بولا کرتے

صاف گوئی سے سدا کام لیا کرتے ہیں
ہم کوئی بات بنا کر نہیں بولا کرتے

بولتے رہتے ہیں جو شام سے پہلے منظر
شام کے بعد وہ منظر نہیں بولا کرتے

اپنے رتبے کا جنہیں ہوتا ہے اندازہ وہ
اپنی اوقات سے بڑھ کر نہیں بولا کرتے

زور سے بولنا شیشے کی ہے فطرت صابرؔ
اُونچی آواز میں پتھر نہیں بولا کرتے

صدیق شاہد

☆

رُواں رُواں ہے شکایت، مگر سنائی نہیں
قیامت ایک طرح سے ہی یارو آئی نہیں!

سزائے جذبہ و احساس خود ہی کاٹیں گے
کہ جس جہان میں ہم ہیں وہاں خدائی نہیں

بلا سے ترک تعلق کی سوچ لے کوئی
کہ رسم و راہ کسی ایک سے بڑھائی نہیں!

یہ اتنا حسن جہاں میں کہاں سے آیا ہے
جب اٹھ گئی ہے نظر لوٹ کر پھر آئی نہیں

عجب حواس پہ چھایا ہے موسمِ تازہ
گرفتِ حیرت بے پایاں سے رہائی نہیں!

اتر گیا ہے وہیں قرضِ آگہی شاہد
صداقتوں کی شہادت جہاں چھپائی نہیں

سید صفدر حسین جعفری

☆

بس ایک جھلک سی مجھے دکھلائی گئی ہے
حیرت ہے فزدوں، قوت گویائی گئی ہے

ہر دل میں اُتر آیا ہے تنہائی کا آسیب
ہر گھر میں کہانی مری دہرائی گئی ہے

یہ حرص و ہوس ہے کہ محبت کا سفر ہے
ہر در پہ صدائے دل ہر جائی گئی ہے

بس ایک قدم میں نے اٹھایا تھا جنوں میں
اور دشت و دمن تک مری رسوائی گئی ہے

خونِ رگ انساں سے مزین ہیں صلیبیں
انصاف کی زنجیر بھی لٹکائی گئی ہے

صفدرؔ دل سودائی کی تہذیب کی خاطر
زنجیر عقوبت مجھے پہنائی گئی ہے

محمد اویس جعفری (سیاٹل۔امریکہ)

☆

مان لیں دل کا کہا اب کسی عنوان ضرور
ورنہ نادان اٹھائیگا یہ طوفان ضرور

یوں نہ کہیے کہ "کبھی آئیں گے اب چلتے ہیں"
ہم سے کیجیے کوئی وعدہ، کوئی پیمان ضرور

پھر اُسی طرح مجھے ٹوٹ کے چاہیں اِک بار
اور پھر شوق سے بن جایئے انجان ضرور

کوئی پوچھے نہ ہمیں لاکھ بلا سے اپنی
یاد ہے اُن کی، خیال اُن کا ہے پُرسان ضرور

جس قدر چاہے ستالے شب ہجراں ہم کو
ایک دن ہوگی خدا چاہے پشیمان ضرور

دل کے دامن میں سرِ شام مہکتے ہیں گلاب
کوئی گلزار صفت ہے یہاں مہمان ضرور

درد انعامِ محبت ہے مبارک ہو اویس
اس میں ہے دل کا زیاں جان کا نقصان ضرور

خالد یوسف (آکسفورڈ۔انگلینڈ)

☆

میں نہیں شاعرِ اصلی تو چلو مت سمجھو
میرے ہر شعر کو نقارۂ قدرت سمجھو

سمتِ مغرب سے جو طوفان اُٹھا ہے یارو
اس سے مرعوب نہ ہو اس کی حقیقت سمجھو

سانحہ جو بھی ہوا ظلمِ سراسر ہے مگر
ہوش والو اسے فطرت کی عدالت سمجھو

اپنے دشمن کو تمہاری ہی مدد سے مارا
سادہ دل ہم نفسو! اس کی سیاست سمجھو

تم غلامی میں گرفتار رہوگے صدیوں
وقت بدلے گا اگر وقت کی قیمت سمجھو

کفر ٹوٹا ہے نہ آثار کہیں صبح کے ہیں
ہرگز اس نظمِ زمانہ کو نہ رحمت سمجھو

ہم نہ ہوں گے تو یہاں خاک اڑے گی خالدؔ
آج کی محفلِ شعری کو غنیمت سمجھو

ارشد محمود ناشاد

☆

نغمۂ دردِ ترے سوز میں شامل رہے ہم
للہ الحمد! کہ آسودۂ منزل رہے ہم

بے خیالی میں بھی یہ دھیان بہ ہر طور رکھا
ایک لحظہ نہ ترے ذکر سے غافل رہے ہم

ناتوانی میں بھی اک کوہِ گراں کی صورت
گردشِ دہر! ترے مدِّ مقابل رہے ہم

پُشت پر دستِ دُعا کس کا رہا ہے ضَو ریز
تیرہ و تار شبوں میں مہِ کامل رہے ہم

ایک طوفانِ بلاخیز رہا چاروں اُور
عرصۂ عمر میں نادیدۂ ساحل رہے ہم

ع۔ق۔آور

☆

انہیں جو خط کبھی لکھتے تو بر ملا لکھتے
وہیں ہمیں بھی بلا لو، یہ التجا لکھتے

حکایتِ غمِ جاناں کبھی غمِ دوراں
ہم اپنا حال جو لکھتے تو اور کیا لکھتے

یہ اور بات کہ ان کو ذرا ذرا تھی خبر
مگر کچھ ہم بھی تو اپنا یہ ماجرا لکھتے

ملی نہ کارِ زمیں سے ہمیں کبھی مہلت
جو آسماں کے لئے کوئی واقعا لکھتے

خطوط یہ جو ہتھیلی پہ نقش ہیں اپنی
اسی زبان میں آور کوئی دعا لکھتے

اختر علی خاں اختر چھتاروی

☆

اختر، ہر اک انساں سے تم، پیار کرو، تو ہم جانیں
اس کی، اُس کی، خاطر دل، بیمار کرو، تو ہم جانیں

سچے دل سے اک دن، یہ ایثار کرو، تو ہم جانیں
سب کی خاطر، گھاٹے کا، بیوپار کرو، تو ہم جانیں

خود کو بھنور کی زد سے بچانا، کوئی انوکھا کام نہیں
ڈوب رہو خود، اور کسی کو، پار کرو، تم ہم جانیں

کانٹے بونا، کیا مشکل ہے، جس سے کہو، وہ بودے گا
بوئے ہوئے، ان کانٹوں کو، گلزار کرو، تو ہم جانیں

اوروں کے، عیبوں پر، تم کو، پتھر پھینکتے، دیکھا ہے
خود کو، اپنے عیبوں پر، سنگسار کرو، تو ہم جانیں

ظاہر، باطن، ایک نہیں ہے، بھاشن دیتے پھرتے ہو
یکسو ہو کر، نیکی کا، پرچار کرو، تو ہم جانیں

نور الزماں احمد اوج

☆

کس نے یہ زنجیر پہنائی کسے آواز دوں
اے شبِ ہجراں کی تنہائی کسے آواز دوں

صبح کی امید میں کاٹے ہیں لمحے ہجر کے
لے رہی ہے رات انگڑائی کسے آواز دوں

وقت نے افسوس یہ دن بھی دکھانا تھا ہمیں
کہہ رہے ہیں وہ بھی ہر جائی کسے آواز دوں

مدتوں بے کل رہا ہوں جس کی دُھن پر رات دن
بج رہی ہے پھر وہ شہنائی کسے آواز دوں

چھپ گئے ہیں ریت کے ٹیلوں میں منزل کے نشاں
اے جنونِ دشت پیمائی کسے آواز دوں

جتنے یارانِ کہن تھے اوج سب رخصت ہوئے
اب کہاں وہ بزم آرائی کسے آواز دوں

مشتاق شبنم

☆

کنارِ دیدۂ تر بولتا ہے
پسِ پردہ سمندر بولتا ہے

زبانِ جرأتِ اظہار ہے گم
ہر اک دل میں کوئی ڈر بولتا ہے

یہ پسِ منظر میں کیا کیا سازشیں ہیں
چمن کا پیش منظر بولتا ہے

حقیقت کچھ نہیں ہے پتھروں کی
بتوں میں حسنِ آذر بولتا ہے

سفر تاریخ کا طے کر رہا ہوں
مری راہوں کا پتھر بولتا ہے

کہاں ٹوٹا طلسم خسروانہ
ہیں مفلس چپ تونگر بولتا ہے

کمیں گاہوں سے جو آتا ہے سر تک
شناساؤں کا پتھر بولتا ہے

بھرم افلاس کا کھل جائے گا اب
کوئی سائل جو در پر بولتا ہے

کھٹکتا ہے وہی شبنمؔ نظر میں
جو سچے حرف اکثر بولتا ہے

☆

خود غرض کوئی خود نما کوئی
یہ بھی ہے عہدِ ارتقا کوئی

یک نفس کس کی چین سے گزری
زندگی ہے کہ ہے سزا کوئی

تیرگی پر بہت ہوئی تنقید
کیا دیا بھی کہیں جلا کوئی

سب ہیں اپنے ضمیر کے قیدی
کیسے ممکن کہ ہو رہا کوئی

جھانکتی ہے ہوا دریچوں میں
کیا جلا ہے یہاں دیا کوئی

امنِ عالم کی گفتگو کیا ہے
جیسے درویش کی صدا کوئی

کیوں ہوا میں محل بناتے ہو
جس کی ہوتی نہیں بِنا کوئی

شہر آواز کا سمندر ہے
کیا سنے گا مری صدا کوئی

تنگِ قامت نہ ہو جو اے شبنمؔ
کاش ایسی بنو ردا کوئی

ضیاء الحسن ضیاؔ

☆

ہر نفس ایک آس ہے میں ہوں
زندگی بے لباس ہے میں ہوں

میرے ہونے کا کچھ ثبوت نہیں
صرف میرا قیاس ہے میں ہوں

مجھ سے احساس کہتا رہتا ہے
وہ مرے آس پاس ہے میں ہوں

اس نے رکھا عجب جزیرے میں
ہر طرف ایک پیاس ہے میں ہوں

چہرے کُملا گئے ہیں پھولوں کے
سارا گلشن اُداس ہے میں ہُوں

غم کا بٹوارہ ہو چکا ہے ضیاؔ
جس کی یہ سب اساس ہے میں ہُوں

سید حبیب اللہ بخاری

☆

میرے گلشن میں کیوں بہار نہیں !
کیوں مری روح کو قرار نہیں!

کس قدر بیکلی کا عالم ہے
موسمِ گُل بھی سازگار نہیں

وہ مجھے بے وفا نہیں لگتے
کیوں مگر دل کو اعتبار نہیں !

رنج و راحت کا کیا تصور ہے
کوئی بھی چیز پائیدار نہیں

خوشدلی پر یقین رکھتا ہوں
اس لئے آنکھ اشکبار نہیں

میری محرومیِ نصیب نہ پوچھ
حالِ دل اس پہ آشکار نہیں

خاطر غزنوی

کلیوں سے خوشبو مت مانگو

اک تمنا
کالے پر پھیلائے
نظروں میں سجائے کاخ و کو
کالے کالے بادلوں کے سائے کی مانند پھیلی چار سو
شہروں شہروں قریہ قریہ کو بہ کو
ذہنوں، سوچوں اور دلوں پہ پنجے گاڑے
شپرک سی اک بلا ہے ہو بہو
شب گزیدہ سوچ کی مانند تاریکی کی خو
ہر بلند و بالا گھر کی چھت پہ اڑتی بھوک کے
دانتوں سے رستا زخم تازہ کا لہو
دندناتی خواہشوں کی بھوک
''میں'' کی پروازوں کے آگے
ایک زخمائی ہوئی درماندہ ''تو''
تخت و بخت و تاج و تعظیم و ریاست کے فسوں کی جستجو
سبز پنجوں میں گھری کلیوں سے مانگیں رنگ و بو
شہر و قریہ کے گلی کوچوں میں چلتی آندھیوں
میں آز کے سب موسموں کی آرزو
سیم و زر کی جستجو
ہیں ورائے ابر مرگ ناگہاں کی بجلیاں بے تاب
لیکن وقت کے احکام کی جانب لگی ہے
چشم و گوش و فکر، خنجر بر گلو
گو ہوس کی کوئی بھی حد ہے نہ سد
پھر بھی ہر اک دل ہے صید، حرص و آزِ حسن و جاہ و سیم و زر
اور زمیں کی آسماں پرداز گندم کی نمو
کب تھا گندم کا مزہ معلوم کس کو
پھر بھی یہ قابیل کی حسرت، محبت چھین لے
اور بہائے اپنے بھائی کا لہو
ساری ندیوں، سارے دریاؤں کے
فیض بے پناہ کو لوٹنے والا عدو
سیم و زر، حسن زمین و آسمان و فکر و فن
آراستہ ہر شے کو اپنا بنا لینے کی خُو

کرامت بخاری

راستے

راستے راستے
اجنبی راستے
رُک گئے ہیں کہیں چل پڑے ہیں کہیں
دھوپ کے راستے
چھاؤں کے راستے
ہنس دیے ہیں کہیں رو پڑے ہیں کہیں
راستے راستے
اجنبی راستے
کتنے آباد ہیں کتنے برباد ہیں
حادثے واقعے
سانحے سلسلے
یاد رکھتے ہیں یہ راز رکھتے ہیں یہ
کھول سکتے نہیں
بول سکتے نہیں
راستے راستے
اجنبی راستے

آگ

گاؤں کو جلایا تھا
دھیرے دھیرے وہ دھواں شہر میں بھی آیا تھا
آگ جو لگائی تھی
جس نے بھی لگائی تھی
رفتہ رفتہ چلتی وہ اس کے گھر بھی آئی تھی
آگ جو لگاتے ہیں
جلد یا بدیر اس کی زد میں وہ بھی آتے ہیں
آگ کب جلاتی ہے
خواب اور امیدوں کو
چاہے شہر جل جائیں
چاہے جسم جل جائیں
خواب اور امیدیں تو پھر بھی زندہ رہتی ہیں

سہیل اختر

زنجیر

(شیلے کی نظم کا منظوم ترجمہ)

(۱)

پُر سکوں ہو گئی ہے موجِ ہوا
جگمگانے لگے فلک پہ نجوم
شب اول کی نیند ہے شیریں
آہ! لیکن میں بستر غم پر
تیرے خوابوں سے چونک اٹھا ہوں
اور نجانے یہ کونسی زنجیر
اس طرح سے کشاں کشاں مجھ کو
تیری کھڑکی کی سمت لے آئی

(۲)

جوئے مست و سیہ کے سینے پر
باد آوارہ لڑکھڑانے لگی
چمپا کی خوشبو یوں ہوئی بے خود
نیند میں جس طرح کوئی خواہش
خواب کی سیج پُرسکوں پائے
شکوۂ عندلیب مضطر بھی
اس کے دل میں یوں ہوگیا بے دم
جس طرح میں نے تیرے سینے پر
اپنا سر رکھ کے اے نگارِ حیات
لینی ہے ایک آخری ہچکی !
آہ !اس سبزے سے اٹھا مجھ کو
جس پہ میں گر کے ہو گیا ہوں نڈھال
اور مرے لب پہ میری پلکوں پر
بارشِ بوسہء وفا کر دے
ہجر کی بے اماں اداسی سے
میرے چہرے کا اڑ گیا ہے رنگ
میرے پہلو میں میرا بے کل دل
کس قدر زور سے دھڑکتا ہے
اس کو پھر اپنے سینے سے اک بار
اتنی شدت سے بھینچ ڈال کہ یہ
پھٹ کے مجھ غمزدہ کو لے جائے
موت کی پرسکون وادی میں

قطعات

ڈاکٹر خیال امروہوی

نوائے شگرف انداز

قرض بھاری ہے تو کیا عہدہ بڑا ہو جائیے
آدمیت پر بہر عنواں فدا ہو جائیے
منفرد انداز اپنانا اگر مقصود ہے
انجمن تو انجمن خود سے جدا ہو جائیے

غلط کہ حسب طلب اپنے روز و شب ہونگے
یہ نامراد درخشاں ہوئے نہ اب ہونگے
مجھے تو چار عناصر ملے ہیں قسمت سے
بکھر گئے تو یہی موت کا سبب ہونگے

میں اداس جی رہا ہوں تو خطا مری یہی ہے
کہ خدا فروش بندوں کو سلام کر نہ پایا
مرے شعلہ بار دیپک سے چراغ کیسے جلتے
میں شرر تھا چند گھڑیاں بھی قیام کر نہ پایا

آتش افلاس ثریاتوں میں سوزاں ہے تو کیا
زندگی کے نام سے انساں ہراساں ہے تو کیا
ایک دن "ٹپ چون" پر ہوگا فروکش آدمی
آج یہ شاہین نظر پابند زنداں ہے تو کیا

تیرے لہجے سے برستا ہے خوشامد کا غبار
میرا فن یہ ہے کہ لفظوں سے شرر اڑتے ہیں
مصلحت کوش زمانہ یہ صدا دیتا ہے
چپ رہو ورنہ کھری بات پہ سر اڑتے ہیں

جو دامِ لمس میں آئے نہ زر کے پنجے میں
ہم ایسے حسن فراری کے منتظر کب ہیں
ہمیں کرن کی ضرورت نہ گرم سورج کی
کہ ہم تو خود ہی شبستاں میں شعلۂ شب ہیں

صدا بہ رنگ تحیّر فنا نے دی ہوگی
خصوصیت سے یہ دستک ہوا نے دی ہوگی
یہ زلزلے تو کبھی خود بخود نہیں آتے
یہ بد دعا کسی بے آسرا نے دی ہوگی

حسیر نوری

رباعیات

دنیا میں نہیں امن کہیں کس سے کہوں
کیا بن گئی آدم کی زمیں کس سے کہوں
ہر سمت ہے اک خواہش بے جا کا الاؤ
دوزخ ہے یہ فردوس بریں کس سے کہوں

اک آئینہ ہاتھوں سے مرے چھوٹ گیا
دل جیسے کوئی آبلہ تھا پھوٹ گیا
دنیا کو نظر بھر کے کہاں دیکھا حسیر
امیدوں کا اک ہار بنا ٹوٹ گیا

رتبہ مرا ہر شے سے بہت اعلیٰ ہے
واللہ مری ذات سے اجیالا ہے
بازارِ زمانہ کی ہوں رونق میں حسیر
سکے کی طرح اس نے مجھے ڈھالا ہے

افلاک کے ہر رمز میں در آیا ہوں
اک نقش کی مانند ابھر آیا ہوں
واللہ کہ اشرف ہوں خلائق میں ،میں
نادیدہ خلاؤں سے گزر آیا ہوں

صابر عظیم آبادی

رُباعیات

ہر بوجھ زمانے کا اٹھانا ہوگا
کچھ کارِ جنوں کر کے دکھانا ہوگا
انسان کی ہستی کا بھروسہ کیا ہے
اک وقت وہ آئے گا کہ جانا ہوگا

ماں باپ کا احسان اٹھالو یارو !
جنت میں مقام اپنا بنالو یارو !
دیوارِ در و بام و نظامِ ہستی
کردار کے پھولوں سے سجالو یارو !

مشکل میں نہیں کام یہ آنے والے
کیا درد کو سمجھیں گے زمانے والے
تکلیفِ سفر کیا ہے خبر رکھتے ہیں
ہجرت کی اذیت ہی اٹھانے والے

جاتے ہوئے اک شام سہانی دے جا
جو زندہ رہے ایسی کہانی دے جا
معلوم نہیں لوٹ کے کب آئے تو
رکھنے کے لئے کوئی نشانی دے جا

نقد و نظر

کتاب	قائداعظم جناح۔ برصغیر کا مردِ حریت
مصنف	شریف فاروق (تمغہ امتیاز)
مبصر	سید منصور عاقل
ناشر	مکتبہ اتحاد۔ اے۔۱۱۵ اسلامیہ کلب بلڈنگ پشاور
قیمت	پانچ سو پچیس روپے

"پاکستان آج بھی باطل قوتوں کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتا ہے اور کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جب اس کی عظمت اور قوم کی سالمیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی سازشیں نہ کی جا رہی ہوں اس کے باوجود اگر یہ ایٹمی قوت بن سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ قوم اپنے عظیم قائد کی تعلیمات اور جدوجہد حیات کو اپنا لے تو پاکستان ناقابل تسخیر قلعہ نہ بن سکے۔ صرف عزم و یقین کی قوت پیدا کرنے کی ضرورت ہے"

پانچ سو سے متجاوز صفحات پر مشتمل فکر انگیز اور عمل افروز زیر تبصرہ صحیفے کا یہ اقتباس جو صحافی شریف فاروق کی تازہ ترین تصنیف کا حرفِ آغاز کہا جا سکتا ہے اپنی معنوی کثیر الجہتی کے اعتبار سے چشم کشا بھی ہے اور دل گداز بھی۔ پاکستان جو عالمی نقشے پر جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ بن کر طلوع ہوا روزِ اول ہی سے سازش و شر کا ہدف بنا رہا اور آج بھی قوت و استقامت سے بہرہ مند ہونے کے باوصف اپنی بقا و استحکام کے چیلنج سے نبرد آزما ہے۔ یہ ایک لمحہ فکریہ ہے جو حُبِ وطن کے قالب میں ڈھل کر کتاب کے قارئین سے اُس ایقان و عمل کا متقاضی نظر آتا ہے جسے اس ملک کا موسس و عظیم

قائد اپنی قوم کو مقدس ورثہ کے طور پر سپرد کر گیا ہے۔

کتاب جس کا سرِ ورق برصغیر کے مردِ حُریت حضرت قائداعظم جناحؒ کی وجیہہ و متبسّم شبیہ سے آراستہ ہے جہانِ معنی کا ایک گنجینہ ہے جس میں قائد کے حیات و افکار اور برطانوی سامراج ہی نہیں بلکہ ان تمام حریف قوتوں کے خلاف منفرد جدوجہد کی ایک داستان محفوظ ہے جسے متعدد تاریخ نویسوں اور سوانح نگاروں نے اپنا موضوع بنایا ہے لیکن شریف فاروق نے جن نامعلوم یا کم معلوم گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے انہوں نے مصنف کی اس تاریخ ساز کاوش کو اور بھی وقیع و معتبر بنادیا ہے اس حقیقت کا اعتراف کتاب کے جن تقریظ نگار حضرات نے کیا ہے ان میں جناب شریف الدین پیرزادہ۔ ڈاکٹر جاوید اقبال۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد الغزالی۔ پروفیسر پریشان خٹک۔ جناب مجید نظامی اور ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف جیسی صاحبِ علم و بصیرت شخصیات شامل ہیں مصنف کی اس کاوش کی پروفیسر خٹک نے جس انداز سے پذیرائی کی ہے وہ بھی منفرد ہے فرماتے ہیں:

> ''سینے میں بہت سی چنگاریاں سنبھالے ہوئے ہوں اگر لکھنے پر آجاؤں تو کئی کتابیں اس کی متحمل نہیں ہوسکیں گی، میں نے اپنی کتاب نہیں لکھی صرف جناب شریف فاروق کی کتاب پر دیباچہ لکھا ہے جی چاہتا ہے کہ کتاب کی بجائے یہ دیباچہ صرف شریف فاروق کی ذات پر لکھ دوں''

مصنف کو یہ خراجِ تحسین بلا جواز اس لیے نہیں ہے کہ گذشتہ نصف صدی سے بھی زیادہ مدت پر محیط شریف فاروق کی وہ صحافتی و ملی خدمات ہمارے پیشِ نظر ہیں جو انہوں نے ایک دردمند مسلمان صحافی اور حُبِ وطن سے سرشار اہلِ قلم کی حیثیت سے انجام دیں اور اب تاریخ کی امانت بن چکی ہیں انہیں مہر و سالک جیسے نابغۂ روزگار صحافیوں کا شرفِ رفاقت روزنامہ انقلاب میں میسر آیا بعد ازاں ملک احسان الٰہی کے تاریخِ صحافت میں سنگِ میل روزنامہ احسان اور جناب حمید نظامی و جناب مجید نظامی کے نظریاتی استقامت کے علمبردار نوائے وقت سے طویل وابستگی نے ان کے تجربہ و مشاہدہ کی صلاحیتوں کو صیقل کیا ان کا قلم تصنیف و تالیف کے مسلسل عمل سے ہمیشہ گُہر بار رہا چنانچہ ان کی متنوع تخلیقات میں ایسے جواہر

پارے بھی شامل ہیں جو نہ صرف اُن کی بلاغتِ فکر ونظر کے مظہر ہیں بلکہ حُبِ وطن وملت کے شاہکار بھی ہیں جناب شریف الدین پیرزادہ اسی تاثر کو اپنے الفاظ میں یوں منتقل فرماتے ہیں:

''مجھے خوشی ہے کہ جناب شریف فاروق نے اپنی تصنیف میں انتہائی محنت توجہ اور عرق ریزی سے مستند انداز میں حقائق بیان کر دیئے ہیں اور یوں انہوں نے ایک اہم قومی فریضہ کو ادا کیا ہے انہوں نے متعدد مصنفین اور بالخصوص ہندوستانی سیاسی مورخوں کی کتب کے حوالوں سے ان تمام مخالفانہ بے بنیاد الزامات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے''

جنابِ شریف فاروق کی اس گراں بہا کاوش کو فرزندِ اقبال جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال بھی خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ جسے یقیناً مصنف کے لیے سند کی حیثیت حاصل ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

''اس کتاب کے مطالعہ سے قائداعظم کی زندگی کے ان گوشوں سے بھی پردہ اٹھتا ہے جن کا تعلق برطانوی سامراج سے تھا۔ یقیناً، اس کتاب کے مطالعہ سے قائد اعظم، پاکستان، مسلمانان ہند اور تعلیمات اسلام کے خلاف جن غلط بیانیوں سے کام لیا گیا ہے۔ مصنف نے پوری کوشش کی ہے کہ انہیں Expose کر دیا جائے''

فاضل مصنف کی محققانہ کاوش کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ انہوں نے زیرِ نظر کتاب کی ترتیب وتدوین میں اسّی سے زیادہ جن ماٰخذ سے استفادہ کیا ہے ان میں بیشتر کتب ومقالات واقعی بڑے نادر التحقیق مواد پر مبنی ہیں قائداعظمؒ پر سب سے معتبر ومقبول سوانح بھی جس امریکن مورخ سٹینلے ولپرٹ نے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نیویارک سے شائع کی انہیں میں شامل ہے لیکن مصنف نے انڈیا آفس لائبریری لندن کی جانب سے ہندوستانی سیاسی مدوجزر اور عوامی رہنماؤں کے بارے میں ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک کے طوفان پرور دور سے متعلق جو برطانوی ہند کی خفیہ دستاویزات (Transfer of Power) شائع کی ہیں ان کو خصوصی طور پر ہدفِ توجہ بنایا ہے کہ ان سے سیاسی جماعتوں اور سیاسی شخصیات کے بارے میں چونکا دینے والے حقائق سامنے آتے ہیں مصنف کا کہنا ہے کہ ''قائداعظم جناحؒ اور پاکستان کی تشکیل کے

حوالے سے مستند حقائق سامنے آنا شروع ہوگئے۔ان دستاویزات کی روشنی میں بھارت سمیت عالمی سطح کے دانشوروں، مورخین اور ریسرچ سکالرز نے منظم بھارتی سازشی پروپیگنڈہ کا تاروپود بکھیر کر رکھ دیا''

چنانچہ صاحب تصنیف نے دہلی یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس ڈیپارٹمنٹ کی ریڈر اور معروف بھارتی سکالر ڈاکٹر اجیت کی کتاب 'Jinnah- Secular and Nationalist' کو بالخصوص مرکز توجہ بنایا ہے جس میں مصنفہ نے جہاں قائداعظم کے خلاف ان کی کردارکشی کی مہم کو بے نقاب کیا ہے وہیں انہیں سیکولر ثابت کرنے کی بھی کوشش کی ہے جس سے مصنف نے مدلل اختلاف کرتے ہوئے زیر نظر تصنیف ہی میں ثابت کیا ہے کہ قائداعظم کے ذہن میں قیام پاکستان کی بنیاد اور جواز صرف اسلامی اقدارِ حیات کا نفاذ تھا۔مصنف کا یہ مخصوص ذہنی رجحان اور حب وطن کی قیمت پر کسی بھی تحریص وترغیب کو خاطر میں نہ لانا ان کے ذاتی اور صحافتی کردار کا نشانِ امتیاز بن گیا ہے گذشتہ تیس برس سے بھی زیادہ مدت سے وہ پشاور سے اپنے روزنامہ 'جہاد' کے ذریعہ صحت مند صحافت کے علم کو پورے عزم واستقلال سے تھامے ہوئے ہیں اسی شہر میں رہ کر وہ روزنامہ شہباز کے ادارتی عہد کو یادگار بنا چکے ہیں کم وبیش چھ دہائیوں پر مشتمل فاضل مصنف کی صحافتی زندگی کا بیشتر عہد ہمارے بھی حافظہ وتصور کی امانت ہے چنانچہ ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں باقیات الصالحات میں ایسی ہستیاں ہمارا سرمایہ ہیں کہ جن کے دل اگر دھڑکتے ہیں تو پاکستان کے لیے اور آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں تو پاکستان کے لیے۔

ہم جناب شریف فاروق کی اس مہتمم بالشان تصنیف کو نئی نسل کے لیے ایک ارمغانِ عظیم سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ ورثہ جو قائدِ اعظمؒ ہمارے سپرد کر گئے ہیں چراغ در چراغ روشنی بن کر آتے والی نسلوں کے اذہان کو منور کرتا رہے گا۔

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را　　　گاہے گاہے باز خواں ایں قصہء پارینہ را

کتاب	جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا مجاہد شاعر میر محمد اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی
مصنف	ڈاکٹر توصیف تبسم
مبصر	سید منصور عاقل
ناشر	نیشنل بک فاؤنڈیشن۔اسلام آباد
قیمت	ایک سو تیس روپے

ثقہ و متین اور سلیم و حلیم ڈاکٹر توصیف تبسم جو بحیثیت شاعر محتاج تعارف نہیں اور جنہیں دیکھتے ہی ان کے نجیب الطرفین بلکہ ذوقافتین ہونے پر ایمان لانا پڑتا ہے بڑے علیم و خبیر بھی نکلے کہ منیر شکوہ آبادی جیسے قدیم و نسبتاً کم معلوم شاعر پر ایسی بھرپور اور بے لاگ تحقیق کی کہ ہمارے حافظہ کے افق پر غالب کا یہ شعر یک لخت طلوع ہو گیا۔

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگنِ عشق   ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

زیر تبصرہ تحقیق (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا مجاہد شاعر میر محمد اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی) کے حوالہ جات و حواشی پر نظر ڈالی اور عالم استعجاب میں کم و بیش دو درجن صفحات کا مطالعہ کیا اور دیکھا کہ مصنف کے ممدوح کی 'حیات' سے متعلق مستند حوالوں کی تعداد ۲۳۶ ہے۔ 'حسبیہ شاعری' کے زیر عنوان ۵۹ نادر التحقیق مندرجات ہیں اور قلمی و غیر مطبوعہ کتب نیز مقالات اور اخبار و رسائل بشمول انگریزی ماخذ میں Pears Cyclopaedia اور Webster Dictionary شامل ہیں۔ یکصد سے متجاوز ان موقر حوالوں میں، تکرارِ ماخذ سے قطع نظر، کم و بیش ایک درجن مطبوعہ و غیر مطبوعہ جو مضامین و کتب براہ راست منیر شکوہ آبادی کے فکر و فن اور احوال و کوائف سے تعلق رکھتے ہیں ان کے مولفین و مصنفین میں فضل حسین اٹاوی، لالہ مادھو رام تاثیر اٹاوی، حسن افضل بدر، ڈاکٹر زہرہ بیگم یاسمین، آغا حیدر قلی خاں، دلدار نصرتی، پروفیسر ضیاء احمد بدایونی اور قاضی معراج دھولپوری شامل ہیں جن کی نگارشات 'ہماری زبان' علی گڑھ، 'مخزن' لاہور۔ علی گڑھ میگزین۔ 'ناظم' رامپور۔ اردوئے معلی علی گڑھ۔ 'آج کل' دہلی۔ جیسے بلند پایہ علمی و ادبی جرائد و رسائل میں شائع ہوئیں۔ فاضل مصنف نے زیر تبصرہ کتاب کی تدوین و تشکیل میں آغا

حیدر قلی خاں کے پنجاب یونیورسٹی ایم۔اے کے مقالے ''منیر شکوہ آبادی'' سے استفادہ کے علاوہ خود اپنے غیر مطبوعہ پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے بعنوان ''منیر شکوہ آبادی۔۔۔احوال و آثار'' سے اخذ و تلخیص پر مبنی وسیع تر کام لیا ہے البتہ فاضل مصنف سے ایک 'سہو کبیر' بھی سرزد ہوا ہے کہ انہوں نے اپنی اس علمی کاوش کی طباعت و اشاعت کا کام جس سرکاری ادارہ کو تفویض کیا اس نے حد درجہ فنی و علمی بے بضاعتی کا مظاہرہ کیا ہے خود صاحب تصنیف کے ساتھ جو ستم ظریفی روا رکھی گئی ہے وہ ناقابل معافی ہے یعنی کتاب کی پشت پر تلخیصی تعارف تو منیر شکوہ آبادی کا دیا گیا ہے لیکن اسے مزین کیا گیا ہے پروفیسر ڈاکٹر توصیف تبسم کی بے تعارف شبیہ سے جسے کوئی بھی اجنبی ناظر صرف منیر شکوہ آبادی ہی کی تصویر پر محمول کر سکتا ہے یہی نہیں بلکہ ایسے مخبوط المعانی الفاظ و تراکیب کتاب کے متن میں در آئے ہیں جنہیں کسی طرح بھی فاضل مصنف سے جن کا شین قاف ہی نہیں املا و انشاء بھی قابل رشک ہے منسوب نہیں کیا جا سکتا ہمیں یقین نہیں آتا کہ ''مشاہیر شعراء'' اور ''دوران میں'' جیسی لایعنی تراکیب پر تاسف کا اظہار کس سے کیا جائے!

جہاں تک کتاب کے تحقیقی معیار کا تعلق ہے اس کی برملا تصدیق پروفیسر توصیف تبسم کی دقیق کاوش اور علمی بصیرت سے ہوتی ہے۔ان کا مدعا و مقصد درج ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے:

> ''میر محمد اسمعیل منیر شکوہ آبادی (۱۸۱۸۔۱۸۸۰) کا شمار انیسویں صدی کے ان باکمال شاعروں میں ہوتا ہے جن کی قوتِ ایجاد و اختراع اور قدرتِ زبان سے انکار ممکن نہیں ہے ان کی ضخیم کلیات کم و بیش تمام اصنافِ سخن پر محیط ہے لیکن افسوس ہے کہ جہاں ان کے شاعرانہ رتبہ کے تعین میں بعض اہل نقد و نظر افراط و تفریط کا شکار رہے ہیں وہیں ان کی زندگی کے اہم گوشوں کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جو ان کا حق تھا''

چنانچہ محترم محقق منیر کے نسبی۔فکری اور شعری احوال و آثار کی پُر وضاحت تصویر کشی کرتے ہوئے اُن حالات و کوائف کا بھی احاطہ کرتے ہیں جن سے منیر کو ریاست باندہ۔فرخ آباد۔الہ آباد۔کانپور اور رامپور وغیرہ میں دوچار ہونا پڑا۔منیر شکوہ آباد میں ۱۰۔اکتوبر ۱۸۱۸ء کو پیدا ہوئے۔آگرہ اور لکھنو سے اُن کا قریبی تعلق رہا ان کے والد سید احمد حسین نقوی سودا کے تلامذہ میں شامل تھے اور وہ خود بذریعہ

مراسلت شیخ امام بخش ناسخ کی شاگردی میں رہے ایک جگہ کہتے ہیں کہ:

حضرتِ ناسخ کی اصلاح اس غزل پر ہے منیر آج رتبہ میری فکر پست کا بالا ہوا

ہمیں ایک بار پھر یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے کہ پروفیسر تبسم اپنے ممدوح کی جس ''قوتِ ایجاد و اختراع اور قدرتِ زبان'' کی توصیف و مداحی کا حق ادا کر رہے ہیں ان کے شعر میں اصلاح کی 'ح' حشو کی 'ح' بن کر خارج از وزن ہو رہی ہے اس میں بھی کہیں ناشر کی ''قوتِ ایجاد و اختراع'' کو تو دخل نہیں! یعنی:

''ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں''

۱۸۵۷ء میں منیر شکوہ آبادی ریاست باندہ میں نواب علی بہادر کے ملازم تھے۔ جنگِ آزادی کے ہنگامے میں عملی طور پر شریک رہے۔ گرفتار ہوئے مقدمہ چلا۔ کالے پانی کی سزا بھگتنا پڑی۔ باندہ ہی کے دورانِ قیام انہوں نے اپنا دیوانِ اول ''منتخب العالم'' مرتب کیا۔ نواب علی بہادر نے جن کے کلام کی اصلاح منیر کیا کرتے تھے اس دیوان کی درج ذیل تاریخ کہی:

استاد کے دیوان کی ہے مدح محال برجِ معنی کا نیرِ اعظم لکھ

تھی فکر علی کو نامِ تاریخی کی ہاتف نے کہا، منتخب العالم لکھ

قطعہ کا دوسرا مصرعہ خارج از بحر ہے۔ لگتا ہے استاد کی اصلاح سے محروم رہ گیا۔ بہر حال پروفیسر تبسم اپنی تحقیق میں مزید ایک ایسے پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو تاریخ میں منیر کی رسوائی کا سبب بن گیا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''جن دنوں منیر فرخ آباد میں تھے (۱۸۵۹ء۔۱۸۶۰ء) ایک طوائف نواب جان کا قتل ہو گیا۔ قاتل مصطفےٰ بیگ نامی ایک مکار شخص تھا۔ اس نے دیکھا کہ حکومت منشی منیر کی طرف سے بدظن ہے تو اس نے کچھ ایسے جھوٹے شواہد بہم پہنچائے کہ منیر کو قتل کے الزام میں موت کی سزا ہو جائے اور وہ صاف بچ کر نکل جائے''

آگے چل کر وہ مزید لکھتے ہیں:

''منیر کو کالے پانی کی سزا کیوں ملی یہ الجھن دراصل خود منیر کے اپنے بیان سے پیدا ہوئی ہے

وہ قطعہ تاریخ مصائب قید وحالاتِ زنداں میں لکھتے ہیں۔

پر کہوں کیا کاوش اہل نفاق	تھے وہ خوں ریزی میں بڑھ کے تیر سے
مصطفےٰ بیگ ایک صاحب ان میں ہیں	کج روی میں بڑھ کے چرخ پیر سے
کر کے خون ناحق نواب جان	مجھ کو بھی پھنسوا دیا تحریر سے

چنانچہ اس ضمن میں صاحبِ تصنیف کا خیال ہے کہ منیر پر طوائف نواب جان کے قتل کا الزام ان کی کردار کشی کے مترادف ہے وہ انگریزوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''دراصل یہ اسی کردار کشی کا حصہ تھا جو انہوں نے ہمارے حریت پسندوں کے سلسلہ میں روا رکھا۔ افسوس تو یہ ہے کہ بعض تذکرہ نگار اصل حقائق جانے بغیر اسی رو میں بہہ گئے ہیں یہ مقالہ داخلی اور خارجی شہادتوں کی روشنی میں اس داغ کو دھونے کی ایک حقیری کوشش ہے''

لہٰذا انہوں نے اپنے زیر نظر مقالے میں اس الزام پر مبنی شواہد پیش کرنے کی سعی کی ہے اور ادبی مورخین و ناقدین جن میں حسن افضل بدر، ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی، ضیا احمد بدایونی اور پروفیسر حامد حسن قادری شامل ہیں ان کی آراء پیش کی ہیں لیکن پروفیسر توصیف تبسم خود جو نتیجہ اخذ فرماتے ہیں وہ یہ ہے:

''یہ قتل کن حالات میں رونما ہوا۔ مصطفےٰ بیگ کون تھا۔ مصطفےٰ بیگ اور منیر کے روابط کی نوعیت کیا تھی ان امور کے بارے میں کچھ وثوق سے کہنا دشوار ہے۔''

گویا صاحبِ تصنیف کے لیے بھی اس الزام کی قطعی تردید ممکن نہیں خصوصاً اس صورت میں کہ وہ ایک جگہ بیان کر چکے ہیں کہ منیر ایک حسین طوائف کی محبت میں گرفتار تھے جس کے ۱۸۴۸ء میں انتقال سے انہیں شدید صدمہ پہنچا تھا اور یہ کہ منیر افیون خوری کے بھی عادی تھے چنانچہ اس تناظر میں ہم خود بھی محسوس کرتے ہیں کہ منیر کو مکمل طور پر بری الذمہ قرار دینے سے قبل مزید ٹھوس شواہد کی ضرورت ہے خاص طور پر جبکہ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ۔ علامہ کیفی چڑیا کوٹی ڈاکٹر زہرہ بیگم یاسمین اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جیسے محققین ادب منیر کی سزا کا سبب نواب جان ہی کے قتل کو قرار دے چکے ہیں یہ الگ بات ہے کہ کوئی الزام نہ ہونے

کے باوجود سفاک انگریز حکمرانوں کے نزدیک منیر شکوہ آبادی کا صرف مسلمان ہونا ہی اُن کے گردن زدنی قرار دیے جانے کے لیے کافی تھا۔

مفتی بحق منصور بنوشت عجب فتوئی　　　　کافی ست پے قتلش ایں جرم کہ سر دارد　(جگر)

کتاب کا دوسرا اہم پہلو مصنف کے الفاظ میں "ان (منیر) کی شاعری کا ایک خاص رخ جس کو حبسیہ کہنا مناسب ہوگا خاص توجہ چاہتا ہے کیونکہ اس میدان میں ان کو جو اولیت حاصل ہے اس میں اور کوئی دوسرا شاعران کا مدِ مقابل نہیں ہے"۔ ڈاکٹر توصیف کا یہ خراج تحسین واقعی زبردست بلکہ غیر معمولی ہے۔ "حبسیہ" کے لفظ نے ہمیں چونکا دیا ہے کیونکہ یہ لفظ مقالے میں ہر جگہ اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے اس کے جواز و توضیح میں صاحب کتاب لکھتے ہیں:

"حبس سے حبسیہ کا لفظ مشتق ہے جس کا مطلب گھٹن یا انقباض ہے جس کا متضاد 'انشراح' ہے جس کے معنی کشادہ ہونے یا کھلنے کے ہیں۔ حبس یا گھٹن جسمانی بھی ہو سکتی ہے اور ذہنی بھی شاعری میں جو گھٹن کی کیفیت انشراح یا کشادگی سے دوچار ہوتی ہے اس کی نوعیت جسمانی سے زیادہ نفسی اور ذہنی ہے۔
ذہنی حبس کی ایک شدید صورت احساس تنہائی ہے جس کو روحانی جلا وطنی (Nostalgia) کہنا زیادہ مناسب ہوگا"

اس کے بعد صاحب تصنیف اس بحث کو تین خانوں میں منتقل کر دیتے ہیں یعنی (۱) قید تنہائی کا نظریۂ جبر (۲) صوفیاء کا نظریۂ فراق اور (۳) قید و تنہائی کا رومانی نظریہ اور فرماتے ہیں کہ "اگر ذہنی حبس کی ان ممکنہ صورتوں کو پیش نظر رکھا جائے تو حبسیہ شاعری کا دائرہ اس قدر وسیع ہو جاتا ہے کہ کم و بیش ساری شاعری اس میں سما سکتی ہے۔ یہاں حبسیہ شاعری سے مراد ایسی شاعری ہے جو جسمانی قید کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔"

ہمیں افسوس ہے کہ فاضل مصنف کے اس نقطہ نظر سے ہم خود کو متفق نہیں پاتے کیونکہ جو اولین تاثر حبس یا حبسیہ کے لفظ سے ذہن قبول کرتا ہے اس میں موسم کا حوالہ ناگزیر ہے۔ جیسا کہ جوش نے کہا:

اب بوئے گل نہ بادِ صبا مانگتے ہیں لوگ　　　　وہ حبس ہے کہ لُو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

ایسی شاعری کے لیے جس کی وجہ تخلیق زنداں ہوا سے ہمیشہ ہی زندانی شاعری کہا گیا ہے چنانچہ حبسیہ' جیسی وضع اصلاح کے باوجود فاضل مصنف نے بھی زندانی شاعری کی اصطلاح جگہ جگہ استعمال کی ہے ہمیں خوشی ہے کہ فاضل مصنف زندانی شاعری کے لیے حبسیہ شاعری کی تہمت اختراع سے بچ گئے ہیں کیونکہ غلام حسن پنجاب یونیورسٹی کو پیش کیے جانے والے اپنے مقالے کا عنوان 'اردو کی حبسیہ شاعری' قرار دے چکے ہیں جس سے پہلے اور بعد اس متہم بذات اصطلاح کا وجود کہیں نظر نہیں آتا۔

پروفیسر ڈاکٹر توصیف تبسم نے ابتدائی زندانی شاعری کے موضوع پر سیر حاصل اور نہایت پُر مغز گفتگو کی ہے جو نہایت اہم حوالوں سے مزین ہے ان کے مطابق دنیا کی بعض بہترین کتابیں قید خانوں ہی میں لکھی گئی ہیں مثلاً فارسی شعراء میں مسعود سعد سلمان اور خاقانی کا زندانی کلام۔ ملک الشعراء بہار۔ عشقی۔ ابوالقاسم لاہوتی اور فرخی یزدی وغیرہ کے علاوہ یورپ کے قدیم و جدید اہلِ قلم میں سکاٹ لینڈ کے شاہ جیمز اول۔ اطاوی شاعر ٹاسر۔ جان بنین۔ سر والٹ سکاٹ۔ روس کے مشہور ناول نگار دستوو سکی۔ فرانسیسی شاعر۔ مفکر اور ڈرامہ نگار ژاں پال سارترے۔ برصغیر میں حضرت مجدد الف ثانی۔ مولانا فضل حق خیر آبادی جن کے دورِ اسیری میں منیر شکوہ آبادی بھی جزائر انڈمان ہی میں تھے نیز مولانا مودودی وغیرہ۔ ڈاکٹر توصیف واجد علی شاہ اختر والئی اودھ۔ مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر اور منیر شکوہ آبادی کو زندانی شاعری کے نمائندہ شعراء میں شمار کرتے ہیں البتہ ان کے خیال میں ۱۸۵۷ء سے پہلے کے زندانی شعراء کا تعین مشکل ہے تاہم پہلا نام آصف الدولہ کے جانشین وزیر علی خاں وزیری کا ہے ایک قدیم شاعر میر جہانگیر لکھنوی نے قید میں انتقال کیا۔ سلطان ٹیپو کے حقیقی پوتے بشیر الدین توفیق جو دکن میں ویلور کے قلع میں نظر بند رہے۔ اکبر شاہ ثانی کے فرزند مرزا جہانگیر نے قید و بند کی حالت میں انتقال کیا۔ ۱۸۴۷ء میں مرزا غالب پر بھی اسیری کی بلا نازل ہوئی اور ان کا یہ شعر:

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا　　　　موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

غالب نے اپنی اسیری کے دوران ۱۸۴ اشعار کا ایک ترکیب بند بھی لکھا جو ان کی بہترین

نظموں میں شمار ہوتا ہے زندانی شعراء میں واجد علی شاہ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کا پورا کلام محفوظ ہے۔ بہادر شاہ ظفر اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ جنہیں ۱۸۵۷ء میں سزا تو سات سال کی سنائی گئی تھی لیکن دو تین ہفتے بعد ہی رہائی مل گئی۔ غالب نے بھی یہ کہہ کر اپنی جان چھڑا لی تھی کہ:

''حضور میں آدھا مسلمان ہوں کیونکہ شراب تو پیتا ہوں مگر سور نہیں کھاتا''

ڈاکٹر توصیف تبسم نے بہت بعد تک زندانی شاعری کا جائزہ لیا ہے جس سے ان کے موضوع کو مزید وسعت ملی ہے ان کے خیال میں زنداں کے ماحول کی عکاسی زیادہ فن کارانہ انداز میں گوپی ناتھ امن کی نظموں ''جیل میں بسنت'' اور ''کوئل'' ظہیر کاشمیری کی نظم ''شبِ زنداں'' اور فیض احمد فیض کے مجموعہ ہائے کلام ''زنداں نامہ'' اور ''دستِ صبا'' کی بعض نظموں میں دکھائی دیتی ہے۔

ہماری خواہش تھی کہ توصیف تبسم صاحب منیر شکوہ آبادی پر پی۔ایچ۔ڈی کا اپنا پورا مقالہ ہی زیور طباعت سے آراستہ کرتے لیکن اچھا ہوا ورنہ سرکار کا ادارہ نہ جانے اور کیا کیا گل کھلاتا۔ آخر میں منیر مرحوم کا ایک خوبصورت شعر:

غربت میں کس سے چشمِ کرم کی امید ہو　　　آنکھیں چرا رہا ہے زمانہ غریب سے

کتاب　　خواب سرا

مصنف　　پروفیسر صدیق شاہد

مبصر　　سید منصور عاقل

ناشر　　بیت الحکمت۔ لاہور

قیمت　　ایک سو پچاس روپے

''خواب سرا'' کیا ہے غزل کی دلگداز و دلپذیر جہتوں کا ایسا ''تعبیر کدہ'' ہے جسے شاعر نے لہو ترنگ احساس سے رنگ اور شمع خیالات سے نور عطا کیا ہے غزلیات پر مشتمل پروفیسر صدیق شاہد کا یہ شعری مجموعہ نہ صرف ان کے تصور شعر کا آئینہ دار ہے بلکہ ان کے فکر و فن کے ارتقاء کا سنگِ میل

بھی۔ ''تقدیم'' کے زیرِ عنوان وہ اس مجموعہ کلام کا تعارف کراتے ہیں۔

''خواب سرا میرا چوتھا غزلیہ مجموعہ ہے اس سے پہلے ''صحرا میں سمندر'' (۱۹۸۵ء) ''رنجِ سفر'' (۱۹۹۰ء) اور ''اک سخن اور'' (۱۹۹۴ء) شائع ہو چکے ہیں۔ ۲۰۰۱ء میں ایک نعتیہ مجموعہ ''باریابی'' بھی زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔ مرا زیادہ تر رجحان غزل کی طرف ہے کہ مجھے اسی قتالۂ سخن نے ہمیشہ اپنا اسیر بنائے رکھا''

چنانچہ غزل کی اسی ''قتالۂ سخن'' کے ہاتھوں جو جامِ شہادت وہ نوش فرماتے ہیں اس میں کلاسیکی غزل کا پیکانِ سفاک پیوستۂ جاں نظر آتا ہے جس کا اعتراف کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں ''کہ میرا تعلق کلاسیکی روایت کے حامل غزل سراؤں سے ہے'' اور اختتام کلام اس شعر پر کرتے ہیں کہ:

ما حالِ خویش بے سرو بے پا نوشتہ ایم   روزِ فراق را شب یلدا نوشتہ ایم

صدیق شاہد کے قبل ازیں شائع ہونے والے مجموعہ ہائے کلام تو ہماری نظر سے نہیں گزرے البتہ زیرِ تبصرہ مجموعہ ترکیب و تشکیل اور ہیئت و آہنگ کے اعتبار سے جہاں فکر و فن کے کلاسیکی وقار کا غماز ہے وہیں موضوعاتی ارتقا کے حوالے سے ''تنگنائے غزل'' کو فکر کی وسعتوں سے ہمکنار کرتا دکھائی دیتا ہے شاعر اپنے مخصوص نقطۂ نظر ہی پر قانع و قادر نہیں بلکہ اسلوب کی شگفتگی و تازہ کاری کو بھی درخورِ اعتنا سمجھتا ہے جس کا اظہار ''خواب سرا'' کا نشانِ امتیاز ہے۔

شوقِ آوارہ یونہی خاک بسر جائیگا   چاند چپکے سے کسی گھر میں اتر جائے گا
وقت ہر زخم کا مرہم ہے پہ لازم تو نہیں   زخم جو اُس نے دیا ہے کبھی بھر جائے گا
شوقِ دیدار میں اُس سروِ رواں کے شاہد   موسمِ گل مرے آنگن میں ٹھہر جائے گا

مضمون آفرینی جو کلاسیکی غزل کی روایت ہی نہیں بلکہ پہچان بھی ہے وہ صدیق شاہد کی جدید فکر کے تنوعاتی قالب میں ڈھلتی نظر آتی ہے لیکن نفسِ مضمون کی پاکیزگی و طہارت ہمیشہ ان کے پیشِ نظر رہتی ہے چنانچہ یہ التزام اُن کے کلام کو نجابت فن کا مقام و مرتبہ عطا کرتا ہے جو کلاسیکی غزل کی بعض اخلاقی ناہمواریوں اور جدید رنگِ شاعری کی بے اعتدالیوں سے مبرا ہے ملاحظہ ہو:

سرشک بار رہی چشم انتظار بہت　　　مگر دہکتا رہا دل کا ریگ زار بہت
تو مثلِ قطرہ نیساں تو زندگی کی نوید　　　میں دشتِ خشک ہوں اور تیرا انتظار بہت

آنسو کمزوری کی پہچان ہوا کرتے ہیں　　　فرطِ غم میں اُنہیں آنکھوں میں چھپائے رکھا
کونسا دن تھا کہ جب سنگِ حریفاں نہ لگا　　　ہم نے آئینہ دل ڈھال بنائے رکھا

شبنم کی لطافت ہے کہ تو نکہتِ گُل ہے　　　جس رنگ میں تو ہے تجھے پہچان گئے ہیں

شبنم کی لطافت اور نکہت گل جیسے استعارے صدیق شاہد کے تصورِ محبوب کی علامت ہیں جوان کے کلام میں جابجا ملتے ہیں یہی علامتیں جب تشبیہ کا روپ دھارتی ہیں تو اسلوب مجلی و مصفی ہی نہیں، بلکہ دلنشیں بھی ہو جاتا ہے:

فصیلِ شعر پر روشن اگر ہوں حسن کی شمعیں　　　تو ایک اک لفظ شاہد روشنی کا استعارہ ہو

ایسے کچھ لوگ بھی ہوتے ہیں کہ جب یاد آئیں　　　وادئ جاں میں نئی شمعیں جلا دیتے ہیں

ایک انگریز شاعر کے بقول ''ہمارے شیریں ترین نغمات وہ ہیں جو انتہائی غم و اندوہ کے ترجمان ہیں''
"Our sweetest songs are those that tell us of the saddest thonghts"

چنانچہ ''خواب سرا'' کے اشعار میں بھی یہ سحر آگیں کیفیات موجود ہیں لیکن اس اختصاص کیساتھ کہ حزنیہ مضمون کہیں بھی قنوطی جذبوں کو محیط نہیں ہونے دیتا بلکہ رجائیتِ فکر زیرِ تبصرہ مجموعے کی واضح خوبی ہے مثلاً

یہ آرزو کا سفر گرچہ رائیگاں بھی ہے　　　اسی میں جادۂ فتح و ظفر نہاں بھی ہے
شبِ سیاہ تری ظلمتیں روا کب تک　　　ترے عقب میں کوئی روزِ ضوفشاں بھی ہے
یہیں کہیں ہیں ہوائیں لطیف موسم کی　　　ضعیف تر ہی سہی مجھ کو یہ گماں بھی ہے

نہ دیکھا جامہ خود رفتگی اتار کے بھی　　　چلی گئیں تری یادیں مجھے پکار کے بھی
یہ زندگی ہے اسے تلخ و ترش ہونا ہے　　　صعوبتوں کے ذرا دیکھ دن گزار کے بھی

حبابِ زیست نہ دستِ قضا سے ٹوٹ سکا حیات باقی رہی قبر میں اتار کے بھی

صدیق شاہد کا ذہنی خاکہ جو ان کے کلام سے ابھرتا ہے اس میں داخلی کرب بھی ہے اور حسنِ اعتماد بھی کہ یہی اسلوبِ حیات ان کی فکر شعر میں ڈھل گیا ہے وہ شکست و ریخت کے عمل سے دوچار ہوتے ہیں لیکن بیک وقت عزم واستقامت سے مزاحمت بھی کرتے ہیں۔ یہی نکتہ ان کی شاعری کا محور ہے۔

تزویر کے ہاتھوں جو میں زنجیر ہوا ہوں قرطاسِ پذیرائی پہ تحریر ہوا ہوں

زمیں سے اُٹھ نہ سکا میں کہ خاک زادہ تھا میں رہروں کے قدم سے بھی پائمال ہوا

جاں کی زنجیر سے باندھی ہے تری یاد کی ڈور اب مری ٹوٹتی سانسوں کا یہ سرمایہ ہے

حیات ولفظ کے سنجوگ کا ہے نام ادب یہ ایسا سچ ہے کہ تسلیم کرلیا جائے

کتاب گنبدِ خضریٰ کے سائے میں

مصنف محمد اخلاق قریشی سعیدی

مبصر سید منصور عاقل

ناشر الحمد پبلیکشنز۔ رانا چیمبرز۔ لیک روڈ۔ لاہور

قیمت دوسو روپے

ارادت وعقیدت جب والہانہ جذبات میں ڈھل جاتے ہیں تو لفظ ومعنی کے محتاج نہیں رہتے بلکہ محسوسات کے عالمِ بیکراں میں ابلاغ کی راہیں خود بخود تراش لیتے ہیں لہذا نقد ونظر کا کوئی معیار یا اُسلوب نفس موضوع تک تو رسائی حاصل کرسکتا ہے لیکن ان نزاکتوں اور لطافتوں کا احاطہ کرنے سے قاصر رہتا ہے جو صرف باطنی تجزیہ یا تحلیل نفسی (Introspection) ہی کے عمل کے ذریعہ ممکن ہے ہمیں یہ احساس زیرِ نظر کتاب کے سرسری مطالعہ ہی سے ہوگیا جو مصنف کے رب العالمین اور رحمت اللعالمینؐ سے بے پناہ تعلق ومحبت کی تفسیر ہے محمد اخلاق قریشی کے قلم سے بیساختہ سرزد ہونے والے ذیل کے یہ دو

نثر پارے ملاحظہ ہوں۔

ا۔ ''مکہ مکرمہ شہر جلال ہے جہاں اللہ تبارک وتعالیٰ کے جاہ وجلال کو محسوس کیا جاتا ہے مگر بیان نہیں کیا جاسکتا بے ساختہ آنسو بہہ نکلتے ہیں زبان پر حمد وثنا جاری ہو جاتی ہے دل سجدہ ریز ہونے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔ نہ اس میں گھاس اُگتی ہے نہ اس میں پھول کھلتے ہیں مگر اِس سرزمین سے آسمان بھی جھک کے ملتے ہیں''

۲۔ ''مدینہ منورہ شہرِ جمال ہے جہاں آپ کی شفقت، محبت اور اپنائیت محسوس کی جاتی ہے یوں لگتا ہے کہ جیسے عاصی تھک ہار کر گوشہ عافیت میں آگیا ہے۔''

کتاب جو حرمین شریفین کا زیارت نامہ اور حجاز مقدسہ کا سفر نامہ ہے اہل بینش کے لیے عہد نبویؐ کی ایسی نظر افروز جھلکیاں بھی اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے جو روح کو بالیدگی اور ذہن کو رخشندگی عطا کرتی ہیں اس سے قبل بھی مصنف ''رحمت کی برکھا'' کے زیر عنوان عمرہ کا ایک سفر نامہ شائع کر چکے ہیں جو ہماری نظر سے نہیں گزرا لیکن ہمیں یقین ہے کہ بین السطور جس شیفتگی اور سپردگی کا احساس زیر نظر کتاب سے ہوتا ہے وہی پیشرو تصنیف کا بھی طرۂ امتیاز ہوگا زیر تبصرہ تصنیف کے تقریظ نگاروں میں پروفیسر ڈاکٹر سید عارف اور قاضی محمد غوث شامل ہیں جنہوں نے مصنف کے تکریم دین اور حبِ رسولؐ کے جذبات کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے خصوصاً موخرالذکر کے یہ الفاظ:

> ''محترم محمد اخلاق قریشی صاحب ان بندگانِ خدا میں سے ہیں جن کی زبان ہر وقت ذکر و درود سے تر و تازہ رہتی ہے اور دل ہر لمحے خانہ خدا و بارگاہِ مصطفےٰ کے لیے دھڑکتا ہے''

محمد اخلاق قریشی محکمہ حسابات سے مدۃ العمر تک وابستہ رہے ہیں اور فیضانِ خداوندی دیکھیے کہ وہ سرشاری جو انہیں حُبِ رسول کی شکل میں ودیعت ہوئی وہ بے حساب ہے سچ ہے کہ:

> ایں سعادت بزورِ بازو نیست   تانہ بخشد خدائے بخشندہ

کتاب جو کم وبیش پونے تین سو صفحات پر مشتمل دس ابواب کا ارمغانِ جمیل ہے صاحب تحریر کے اخلاص وصداقت کا آئینہ ہے تحریر ہر نوع کے تصنع وتکلف سے ماورا اور تزئین ونمائش کی کسی بھی کوشش

سے بے نیاز کہ یہی محمد اخلاق قریشی کا توشۂ عقیدت ہے جس کا اظہار انہوں نے کتاب کے آغاز میں اس شعر کے ذریعہ کیا ہے۔

میرے بچوں کو وراثت میں ملے حُبِ رسولؐ　　　یہ اثاثہ بعد میرے بھی تو گھر میں چاہیئے

کتاب　:　گورپیچ (افسانے)

مصنف　:　آغا گل

مبصر　:　محمود اختر سعید

ناشر　:　کلاسیک ۴۲۔دی مال، لاہور

ضخامت　:　۱۳۴صفحات　　قیمت ۹۰ روپے

آغا گل، پیشہ کے اعتبار سے ایک بیوروکریٹ ہیں۔اور ان کا تعلق بھی بلوچستان کے ایک دور افتادہ قصبہ ہرنائی سے ہے، معاشرتی زندگی کے اس سیاق وسباق میں ان کا یوں کوچۂ ادب میں در آنا باعث تعجب ہے۔لیکن بقول کسے ''جرأت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے''۔ان کا تعلق بھی بیوروکریٹ کے اس گروہ سے ہے، جنہوں نے اپنی سنگلاخ ذمہ داریوں کے باوصف قلم وقرطاس سے اپنا رشتہ قائم رکھا ہمارے ادب میں مسعود مفتی، قدرت اللہ شہاب، مرتضیٰ برلاس، مختار مسعود اور مصطفیٰ زیدی جیسے اہل قلم کا تعلق بھی ایسے ہی گروہ سے ہے۔

زیر نظر کتاب آغا گل کا افسانوی مجموعہ ہے۔جو ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا تھا۔اور اب نئے رنگ روپ میں دوسری بار شائع ہوا ہے۔جس میں کل بارہ افسانے ہیں۔جن کے موضوعات بقول راجا رسالو۔

''اس کی کہانیوں میں آپ بیتی، علاقائی تاریخ، علاقے کی تہذیب، سرداروں، استحصالی گروہوں کے ظلم وستم، سرکاری اہلکاروں کی ناانصافیاں، معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیاں، بھوک ننگ، کون سی بات ہے جو اس نے اپنی کہانیوں کے ذریعے عام لوگوں تک نہیں پہنچائی، غیر ملکی ادب کے مطالعہ نے اس کی سوچوں میں وسعت پیدا کردی

ہے۔جس کی جھلک اس کی تخلیق کردہ کہانیوں میں جابجا دکھائی دیتی ہے“

آغا گل کی افسانہ نگاری پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر خیال امروہوی کہتے ہیں:

”آغا گل کی نوک قلم انسان کے ان متعفن کرداروں کا پوسٹ مارٹم بھی کرتی ہے، جسے پیشہ ور طبیب و ڈاکٹر تشخیص نہیں کر سکتے۔ ان کی تحریروں کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان پرست ہیں اور معاشرے کے ہر حیوانی عمل کو دانشورانہ انداز سے نہایت دلکش اسلوب کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔“

ان کے افسانوں کی ورق گردانی کرتے ہوئے دو تین باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں کہ موصوف ادب برائے ادب کی بجائے ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ اس لئے ان کے قلم کی زد میں خوشیاں اور غم، محرومیاں، نا آسودہ خواہشات، ظلم و ناانصافی جیسے گفتنی، ناگفتنی مسائل آتے ہیں۔ دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ تحریر میں جا بے جا غیر مانوس اور بلوچی زبان کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ جن کے معنی تلاش کرنے کیلئے قاری کو دوران مطالعہ بار بار کتاب کے آخر میں دی گئی فرہنگ سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ بہر حال ان کے سبھی افسانے بہت خوب ہیں۔ ان میں روپے کا جن، کباڑی بازار اور دھوپ کی چادر جیسے گرانقدر افسانے بھی شامل ہیں۔ امید ہے قارئین کو اس افسانوی مجموعہ سے زندگی کی حقیقتوں کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے اور پرکھنے کی استعداد ملے گی۔

کتاب : نسب نامہ سادات ڈاسنہ ضلع میرٹھ

مصنف : سیّد ناصر الدین

ناشر : منزل پبلی کیشنز، اسلام آباد

ضخامت : ۱۶۴ صفحات قیمت: ۲۰۰ روپے

زیر نظر کتاب سیّد ناصر الدین کی محنت شاقہ کا ثمر ہے۔ فی زمانہ نسب نامے اور شجرے لکھنے کی

روایت نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔اس لئے کہ ایسے اَدَق موضوع پر محنت کے باوجود حاصل حصول کچھ بھی نہیں ہوتا' جبکہ زمانہ موجود میں مالی منفعت زیادہ سے زیادہ پیشِ نظر رہتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ مشہور قلمکار بھی اس کوچہ میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کرتے۔اسلاف اور اکابر کی سوانح اور سلسلہ ہائے نسب کو محفوظ رکھنے کی ہمت وہی لوگ کرتے ہیں جو اپنے آباؤاجداد اور عزیز واقارب کے نام نامی اور قابل ذکر وراثتی سرمایہ کو اپنی آئندہ نسل کو منتقل کرنے کا جذبہ اپنے اندر پاتے ہیں بعض لوگ اپنی خاندانی وجاہت اور جاہ وجلال کی دھاک قائم رکھنے کے لئے اپنے نسب ناموں کا ریکارڈ محفوظ رکھتے ہیں۔یا پھر اہل تاج و تخت کو ان کی ضرورت پیش آتی ہے ۔۔صوفیائے کرام کے عقیدت منداور پیروکار اپنے اپنے سلسلہ ہائے طریقت کے شجروں کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔علاوہ ازیں اہل ہنر اور فنکاروں کے ہاں بھی اپنے اساتذہ کرام سے اپنے نسبتی سلسلوں کو جوڑنے کا رواج عام ہے۔خصوصاً اہل شعر ونغمہ ایسے نسب ناموں کو باعثِ صد افتخار جانتے ہیں۔

زمانہء جاریہ میں ایسے نسب ناموں کی اہمیت کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے۔تقسیمِ برصغیر کے بعد اکثر اہلِ ثروت اور باعزت گھرانے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئے۔پہلے تو ایک خاندان تین جگہ تقسیم ہوا' جن کے اقرباء بھارت' بنگلہ دیش اور پاکستان میں اپنوں سے بچھڑ کر رہ گئے۔بعدازاں پاکستان اور بنگلہ دیش کے ہر شہر و ہر قصبہ میں آب ودانہ کی تلاش میں ٹوٹی تسبیح کے دانوں کی طرح اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ایسے میں ناصرالدین صاحب نے اپنی امکان بھر کدّ وکاوش سے ان بکھرے دانوں کو بارِ دیگر ایک رشتہ میں پرونے کی کوشش کی ہے تاکہ عزیز واقارب میں اپنی رشتہ داری کی پہچان قائم رہے۔

اُمید ہے کہ موصوف نے ایک مورِ بے مایہ کی طرح معلومات کے اِن ذرّوں کو تلاشِ بسیار کے بعد جس پُرخلوص جذبہ اور لگن سے یکجا سمیٹا ہے' اسے اہل علم کے ہاں سراہا جائے گا۔

کتاب : سات قدیم عشق

مصنفہ : شاہدہ لطیف

مبصر : محمود اختر سعید

ناشر : علم وعرفان پبلشرز۔لاہور

ضخامت : ۵۲۸صفحات قیمت:۳۵۰روپے

زیرِنظر کتاب کی مصنفہ شاہدہ لطیف حلقہ شعروادب کے معروف ناموں میں سے ایک نام ہے شعروادب ہو یا حالات حاضرہ، صحافت ہو یا داستاں سرائی، یہ سب میدان ان کے قلم کی روانی کے لئے غیر مانوس نہیں ہیں۔ موصوفہ چار عدد شعری مجموعوں (۱) معجزہ، (۲) میں پاکستانی ہوں، (۳) معرکہ کشمیر، (۴) برف کی شہزادی، کی خالق ہیں، علاوہ ازیں جب ان کی ''پاکستان میں فوج کا کردار اور امریکہ'' اسلام اور عالمی امن' جیسی کتابیں شائع ہوئیں، تو ان کی فکرونظر کے افق اور وسعت مطالعہ کو سراہا گیا۔ اور اب ۷ قدیم عشق لکھ کر انہوں نے اپنے ہمہ صفت موصوف ہونے کا ایک اور ثبوت فراہم کیا ہے۔ کہنے کو تو یہ صرف سات شہزادیوں کی رومانی داستانیں ہیں۔ لیکن ان رومانی داستانوں کو بیان کرنے کیلئے تاریخ کی بہت سی کتابوں کو کھنگالنا پڑا ہوگا، کیونکہ تاریخی واقعات کو حقائق سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ وگرنہ تاریخ، تاریخ نہیں رہتی۔ علاوہ ازیں مصنفہ نے ان رومانی کرداروں کو مکالماتی لب ولہجہ دے کر زندہ کردار بنا کر پیش کیا ہے۔ جو باہم بات چیت کرتے ہیں۔ ان کی آپس کی گفتگو قاری کو یوں ساتھ لے کر چلتی ہے، جیسے وہ خود ان کرداروں کو اپنی کھلی آنکھوں سے چلتا پھرتا دیکھتا اور اپنے کانوں سے ان کی گفتگو سنتا ہے۔ اسی دلچسپی کی بنا پر جس کہانی کو پڑھنا شروع کیا جائے، اسے ایک ہی نشست میں پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔ مصنفہ نے ہر کہانی میں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کو رومانی اور جمالیاتی لب ولہجہ میں گوندھ کر بیان کیا ہے۔ یوں قاری کو محض خشک تاریخی واقعات میں الجھانے سے اجتناب کیا ہے۔ مصنفہ کی یہ کاوش ہمیں افسانوی ادب کے اس ابتدائی دور کی یاد دلاتی ہے، جس میں عبدالحلیم شرر اور مولانا صادق حسین سردھنوی کے قلم سے اسلامی تاریخی ناول لکھے جا رہے تھے۔ الغرض مصنفہ کی زیرِنظر تصنیف ہمارے افسانوی ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ جسے دیدہ زیب گیٹ اپ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

کتاب : سرمدؒ ایک سمندر (رباعیات سرمدؒ کا منظوم اردو ترجمہ)

مترجم : محمد انور معین زبیری مجدّدی

مبصر : ڈاکٹر الیاس عشقی☆

ناشر : الکتاب گرافکس پل شوالہ ملتان

قیمت : ۲۵۰ روپے

اردو شاعری میں منظوم ترجمے کی روایت ہمیشہ سے رہی ہے اس کا ڈول اردو کے دکنی دور میں ہی ڈال دیا گیا تھا اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ پہلا منظوم ترجمہ رباعیات عمر خیام کا تھا میں نے اس کے چند نمونے طالب علمی کے زمانے میں دیکھے تھے اس ترجمے کے معیار کے متعلق اب کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اُس وقت یہ کون کہہ سکتا تھا کہ اردو میں سب سے زیادہ منظوم ترجمے رباعیات عمر خیام کے ہونگے۔ منظوم ترجموں کا سلسلہ کبھی رکا نہیں۔ تازہ ترین منظوم ترجمہ ستمبر ۲۰۰۶ء میں ہوا ہے جو "سرمدؒ ایک سمندر" کے نام سے ملتان کے محمد انور معین زبیری مجدّدی نے کیا ہے اور اس میں سرمد شہید کی تمام رباعیات جن کی تعداد تین سو اکیس ہے شامل ہیں۔ رباعیات سرمد ایک عرصے سے نایاب ہیں کہیں کہیں ان کا وہ ایڈیشن مل جاتا ہے جو ابوالکلام آزاد کے مقدمے کے ساتھ چھپا تھا۔ اس ترجمے کی بنیاد اسی ایڈیشن پر ہے۔ اس زمانے میں اس کے مل جانے کو سرمد کا کرشمہ سمجھا جائے یا ابوالکلام آزاد کی مقبولیت کا نتیجہ۔

جیسا کہ عرض کیا گیا سب سے زیادہ منظوم ترجمے عمر خیام کی رباعیات کے ہوئے ہیں کوئی چالیس کے قریب منظوم اردو ترجمے میں پڑھ چکا ہوں جن میں سے تقریباً بیس کے نمونے میں ڈاکٹر مہر عبدالحق مرحوم کے منظوم سرائیکی ترجمے "مئے گلفام" کے مقدمے میں پیش کر چکا ہوں۔

☆ قضا و قدر کا اپنا ایک نظام الاوقات ہے جس سے انسان قطعی بے خبر! ڈاکٹر الیاس عشقی کو مرحوم لکھتے ہوئے قلم کانپ رہا ہے۔ یہ روح فرسا خبر زیرِ نظر شمارہ کی اشاعت میں بوجوہ تاخیر کے باعث اس حاشیہ کا سبب بنی۔ 'حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا' (ادارہ)

پچھلے پچاس سال میں مختلف زبانوں میں دس بارہ منظوم ترجمے ہوئے ہیں لیکن اردو میں دو ترجمے اچھے دیکھنے میں آئے ہیں جن میں سے ایک ملتان کے میرے دوست پروفیسر جابر علی سید نے کیا تھا انہوں نے اپنے ترجمے کی بیاض مجھے بھیجی تھی جو میں نے چند ترجمے نقل کر کے ان کو واپس بھیج دی تھی۔ دوسرا ترجمہ اردو کے مشہور اور بزرگ شاعر صبا اکبرآبادی کا کیا ہوا ہے، انہوں نے خیام کے نام سے جو بھی کہیں نقل ہوئی ہیں، ان رباعیات کو جمع کر کے چند سو رباعیات کا منظوم ترجمہ کیا ہے اور کافی رباعیات کی نقول مجھے بھیجیں جو میرے پاس محفوظ ہیں۔ صبا اکبرآبادی ایک باکمال مترجم تھے انہوں نے خیام کے علاوہ غالب کی رباعیات کا بھی اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ کئی اور فارسی شعراء کی رباعیات اور کلام کو اردو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ ان کا خیام کی رباعیات کا منظوم ترجمہ اردو کے اچھے ترجموں میں بھی قابل ترجیح ہے۔

رباعیاتِ سرمد کا تازہ ترجمہ دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ دو اور منظوم ترجمے قابل ذکر ہیں۔ ایک رباعیاتِ سرمد کا منظوم ترجمہ جو "جوہرِ سخن" کے نام سے منشی تراب علی صولت لکھنوی تلمیذ ملک الکلام قوی مرزا ہوی نے کیا ہے اور دوسرا بابا طاہر کے کلام کا منظوم ترجمہ جو میرے مرحوم دوست حضور احمد سلیم نے خانۂ فرہنگ ایران حیدرآباد کی ترغیب سے کیا تھا اور ایک خوبصورت کتاب کی صورت میں شائع کیا تھا۔

معین زبیری مجدّدی کا ترجمہ جو حال ہی میں ملا ہے اس کے مطالعے کے بعد بلا تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ رطب و یابس سے پاک ہے اور اس میں تین سو سے زیادہ رباعیات کے ترجمے کو ایک معیار پر قائم رکھا گیا ہے جو مترجم کی دونوں زبانوں پر قدرت، ترجمے کے سلیقے اور شاعری کے اعلیٰ ذوق کا پتہ دیتا ہے۔

معین زبیری مجدّدی کا خاندانی تعلق ہندوستان کے مشہور اور مردم خیز شہر مارہرہ سے ہے، جہاں ان کے بزرگ علمی و ادبی ذوق اور سلسلۂ قادریہ سے اپنے تعلق کی وجہ سے احترام سے دیکھے جاتے تھے معین زبیری مجدّدی نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں اس طرح علم و ادب اور تصوف ان کی گھٹی میں پڑے تھے۔ انہوں نے ہوش سنبھالا تو ان کے بزرگ سلسلۂ نقشبندی مجدّدی کے ایک مشہور شیخ طریقت عارف کامل اور صاحب ارشاد سید نورالحسن مجدّدی کے حلقہ ارادت میں داخل تھے اور ان پر اپنے مرشد کی خاص توجہ تھی، معین زبیری نے بھی ان کے دست حق پرست پر بیعت کی اور وہ بھی اپنے مرشد کی توجہ سے

فیض یاب ہوئے انہیں کی تعلیم وتربیت میں انہوں نے فارسی سیکھی اور اس زبان کے کلاسیکی ادب کا مطالعہ کیا اور رباعیات عمر خیام کے منظوم ترجموں پر مسلسل مضامین اخبار میں لکھتے رہے۔ تصوف سے ان کا تعلق اپنے مرشد کی خاص توجہ سے ان کی زندگی میں اس طرح داخل ہوا کہ اب شریعت ہو یا طریقت ان کی پہچان بن گیا ہے اور وہ ایک سالک خوش اوقات ہیں۔

منظوم ترجمے کے لئے سرمد شہید کی رباعیات کا انتخاب بھی ان کے ذوق شعر وتصوف کی وجہ سے ہوا ہے انہوں نے اپنی کتاب ''سرمد ایک سمندر'' کی ابتداء میں چار مضامین رکھے ہیں جن میں سے ایک ان کے دوست کا لکھا ہوا ہے جس میں ان کی ذات کے بارے میں معلومات ہیں۔ تین اور مختصر مضامین ادب کے فضلا کے قلم سے نکلے ہیں جن میں ان کے ترجموں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ کتاب میں ابوالکلام آزاد کے مقدمے کو بھی شامل کیا گیا ہے اس لئے کہ سرمد شہید اور داراشکوہ کے سلسلے میں انہوں نے اورنگ زیب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے ہمارے مترجم کو اس سے اتفاق نہیں ہے انہوں نے اورنگزیب کو ایک سعید اور فرمانبردار بیٹا سمجھا ہے اور اس کی پیروی ایک ماہر اور محنتی وکیل کی طرح کی ہے بڑی محنت سے اپنے موقف کے مطابق تاریخی شواہد جمع کئے ہیں اور انہیں بڑے سلیقے اور منطقی استدلال کے ساتھ پیش کیا ہے حالانکہ یہ تمام باتیں پہلے کہی جا چکی ہیں۔ اجماع امت اور مسلمان مورخین کا فیصلہ پہلے ہی اورنگزیب کے حق میں ہے ان کے طویل مضمون کو اعادہ یا یاددہانی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اپنے مقصد سے ان کے خلوص اور وکالت کی کامیاب کوشش سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اب ہم رباعیات سرمد کے منظوم ترجموں کی طرف آتے ہیں۔ معین زبیری مجددی نے رباعیات سرمد کا ترجمہ رباعی کی بحر میں نہیں کیا ہے اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ صولت لکھنوی کا ترجمہ بھی اسی بحر میں ہے جو معین زبیری مجدّدی نے اختیار کیا ہے۔ صولت کے جو دو ترجمے میرے پاس محفوظ رہ گئے ہیں ان سے معین زبیری مجدّدی کے ترجموں کا مقابلہ دونوں ترجموں کے متعلق دلچسپ رہے گا صولت نے ایک مشہور رباعی کا ترجمہ کیا ہے۔

آں کس کہ ترا کار جہانبانی داد ۔۔۔ مارا ہمہ اسباب پریشانی داد

پوشاند لباس ہر کرا عیبے دید ۔۔۔ بے عیباں را لباس عریانی داد

ترجمہ صولت:

جس نے تجھے بخشا ہے یہ تاج جہانبانی ۔۔۔ اس نے ہی دیا مجھ کو سامانِ پریشانی

پہنایا لباس ان کو پُرعیب جنھیں پایا ۔۔۔ بے عیب جنھیں دیکھا بخشی انھیں عریانی

معین زبیری مجددی کا ترجمہ دیکھیے تو ایک دلچسپ اور عجیب انکشاف ہوگا: ☆

جس نے تجھے بخشا ہے یہ تاج جہانبانی ۔۔۔ اس نے بھی دیا مجھ کو سامانِ پریشانی

پہنایا لباس ان کو پُرعیب جنھیں پایا ۔۔۔ بے عیب جنھیں دیکھا بخشی انھیں عریانی

ایسے مکمل توارد کی مثال جس میں سرِ مو کا فرق بھی نہیں ہے کم دیکھنے میں آئے گا۔ لیکن اردو اور دوسری ایسی زبانوں میں جن میں توارد کی روایت' قافیوں کی بہتات اور ان کے بول چال کی زبان کے مطابق استعمال کا رواج ہے ایسا توارد ممکن ہے اس بحر میں جو بھی زبان اور روزمرہ کے مطابق لفظی ترجمہ کرنا چاہے گا اسے اس رباعی کا اس بحر میں یہی انداز نظر آئے گا صولت کے ترجموں کے ساتھ مجھے رباعی کی بحر میں اور ترجمے بھی ملے تھے اور میں نے لکھ لئے تھے افسوس کہ شاعر کا نام معلوم نہیں۔ یہ ترجمہ بھی دیکھ لیجیے:

رباعی: جس نے تجھکو یہ شان سلطانی دی ۔۔۔ اس نے ہی مجھکو یہ پریشانی دی

ہر صاحبِ عیب کو پہنایا ملبوس ۔۔۔ بے عیب ہی کو خلعت عریانی دی

صولت کا دوسرا ترجمہ دیکھیے: سرمد کی مشہور رباعی ہے:

سرمد غم عشق بوالہوس را نہ دہند ۔۔۔ سوزِ دل پروانہ مگس را نہ دہند

عمرے باید کہ یار آید بہ کنار ۔۔۔ ایں دولت سرمد ہمہ کس را نہ دہند

☆ یہ انکشاف واقعی دلچسپ اور عجیب ہے کہ ایک مصرع کا توارد تو دیکھنے میں آیا ہے لیکن ایسی کوئی مثال حافظے میں نہیں کہ علی الترتیب چار مصرعوں کا توارد ممکن ہوا ہو۔ (ادارہ)

صولت کا ترجمہ یہ ہے:

کب اہل ہوس کو غم جانانہ ملا　　مکھی کو نہ سوزِ دل پروانہ ملا
اک عمر ہے لازم پئے وصل دلدار　　اس دولت سرمدی کا حصہ نہ ملا

چوتھے مصرے میں یہ بات بری طرح کھٹکتی ہے کہ دولت سرمدی کا حصہ کس کو نہیں ملا۔ اس کا ظاہر ہونا ضروری تھا کیونکہ کلام کا قرینہ یہی ہے۔ اس رباعی کا ایک اور ترجمہ صولت کے ترجمے کے ساتھ ملا ہے۔ دیکھئے:

بے شک غم عشق بوالہوس کو نہ دیا　　سوزِ دل پروانہ مگس کو نہ دیا
آغوش میں آئے یار عمریں گذریں　　اس گنج ابد سے کسی کو حصہ نہ دیا

یہ مثالیں اہل ذوق کی ضیافت طبع کے لئے پیش کی گئیں۔ معین زبیری مجدّدی کے منظوم ترجموں پر ہمارے ساتھ غور کیجئے۔ ہم نے کہا تھا کہ ترجمے ایک معیار پر قائم ہیں۔ اس دعوے کے ثبوت کے لئے ہم منظوم ترجموں کا انتخاب نہیں کرینگے۔ ہر بار کتاب کہیں سے کھول کر جو رباعی نظر آئے گی اس کے ترجمے کو دیکھیں گے۔ ملاحظہ ہو:

از جرم فزوں یافتہ ام فضلِ ترا　　ایں شد سبب حقیقت جرمِ مرا
ہر چند کرم بیش گنہ بیشتر است　　دیدم ہمہ جا، آزمودم ہمہ را

ترجمہ:　ہر جرم سے پایا ہے فزوں فضل ترا　　باعث یہ فزونیٔ معاصی کا ہوا
افزوں ہیں اگر گنہ کرم افزوں تر　　دیکھا ہر طرح خوب سب کو جانچا

صرف رباعی کا مفہوم ہی ادا نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ صحت اور مناسب الفاظ نے زبان کی روانی اور ترجمے کو لفظ و معنی کے اعتبار سے اس طرح ادا کیا ہے جس کے لئے پرانے لوگ کہا کرتے تھے کہ 'عبارتے کہ بہ معنی برابری دارد'۔ کچھ صفحات الٹ کر دیکھا تو اس رباعی پر نظر رکی۔☆

اے دل، ہوا و ہوس آزار مکش　　ایں بارِ گراں بدوش زنہار مکش
عمرت نبود بقدرِ طولِ عملت　　از بہر دو روز رنج بسیار مکش

☆　رباعی کے فارسی متن میں قیاس چاہتا ہے کہ ''ہوس'' کی جگہ ''حرص'' کا لفظ استعمال ہوا ہوگا اور طولِ عملت کی جگہ ''طولِ املت'' ترجمہ میں یہ سقم نظر نہیں آتا۔ (ادارہ)

ترجمہ:۔ مول لینا نہ کبھی حرص و ہوا کا آزار بوجھ بھاری ہے نہ رکھ دوش پہ اس کو زنہار

عمر کب اتنی ہے جتنا ہے ترا طولِ امل رنج دو دن کیلئے سہتا ہے کیوں اے دل زار

اسے ترجمہ کیوں کہتے ہیں یہ تو بالکل طبع زاد معلوم ہوتا ہے۔ یہ ترجمے کی اعلیٰ ترین قسم ہے۔

ایک اور رباعی دیکھئے:

ہر چند کہ کم لطف و دل آزار توئی بیش از ہمہ غمخوار و وفادار توئی

در عالم امتحاں چو گشتم دیدم ہر جا کہ بود خستہ دلے یار توئی

ترجمہ: ہر چند کہ کم لطف و دل آزار ہے تو پھر سب سے زیادہ اپنا غمخوار ہے تو

یہ عالمِ امتحاں میں دیکھا میں نے ہر ایک کا بے کسی میں بس یار ہے تو

اس کے بعد کافی صفحات پیچھے پلٹ کر دیکھا تو یہ رباعی نقل کی:

از فضلِ خدا ہمیشہ راحت دارم با نانِ جویں قانع و ہمت دارم

نے بیم ز دنیا و نہ اندیشہ دیں در گوشہء میخانہ فراغت دارم

ترجمہ:۔ ہمیشہ فضلِ خدا سے نصیب راحت ہے ہوں جو کی روٹی پہ قانع عجیب ہمت ہے

نہ مجھ کو خطرۂ دنیا نہ دین کا کچھ ڈر ہے ایک گوشہء میخانہ اور فراغت ہے

اس سے بہتر ترجمہ ذہن میں نہیں آتا۔ رواں اور بے ساختہ! ایسے الفاظ ترجمے کے لئے ناگزیر ہیں اچھے ترجمے کے لئے اور کیا چاہئے۔

اس کے بعد ''چ'' کی ردیف پر نظر پڑی اس میں عام طور سے مشکل قوافی اور ردیفیں مشکلات پیدا کرتی ہیں لیکن یہ رباعی ان تکلفات سے پاک ہے۔

ایں شہر و دیار و کوہ و صحرا ہمہ ہیچ دیدیم تمام زشت و زیبا ہمہ ہیچ

خود را بخدا اگزار و بگزر ز ہمہ ایں خواہش و فکرِ دین و دنیا ہمہ ہیچ

ترجمہ:۔ ہیں شہر و دیار و کوہ و صحرا سب ہیچ دیکھا تو جہاں میں زشت و زیبا سب ہیچ

اللہ کا ہو رہ تو کسی سے کیا کام ہے خواہش و فکرِ دین و دنیا سب ہیچ

رباعی کا ترجمہ ہے مگر طبع زاد معلوم ہوتا ہے۔ اس سلسلے کو پہلی رباعی کے ترجمے سے شروع کیا تھا تو اب آخری رباعی دیکھ لینے میں کیا ہرج ہے۔

فارغ ز ہوا و حرص یکدم نشدی   از فکرِ مآلِ کار واز غم نشدی
ہر گاؤ خرے کہ ہست در فکرِ وجود   کم تر تو ز سگ شدی و آدم نشدی

ترجمہ:۔ تو حرص و ہوا سے پاک اک دم نہ ہوا   کچھ تجھ کو مآلِ کار کا غم نہ ہوا
ہے فکرِ وجود میں ہر اک گاؤ خر   بدتر ہوا تو سگ سے اور آدم نہ ہوا

ہم نے دیکھ لیا کہ ترجمہ اپنے قائم کیے ہوئے معیار سے کم نہیں ہوتا اور دوسری رباعیات میں یہ معیار مترجم کی مہارت کو ظاہر کرتا ہے۔ آخر میں ہم صرف دو مشہور رباعیات کے ترجمے دیکھتے ہیں۔

سرمد اگرش وفاست خود می آید   گر آمدنش رواست خود می آید
بیہودہ چرا ایپے اوی گردی   بنشیں اگر او خداست خود می آید

ترجمہ: اس میں ہے اگر وفا تو خود آئے گا   آنا ہے اگر روا تو خود آئے گا
اس کے لئے کیوں پھرتا ہے مارا مارا   تو بیٹھ وہ ہے خدا تو خود آئے گا

جس آسانی سے اس رباعی کا ترجمہ کیا ہے اس کی داد نہ دینا دیانت کے خلاف ہوگا۔ یہ مشہور رباعی منظوم ترجمے کے اعتبار سے اس سلسلے کی آخری رباعی ہے۔

سرمد در دیں عجب شکستی کردی   ایماں فدائے چشم مستی کردی
با عجز و نیاز جملہ نقدِ خودرا   رفتی و نثارِ بت، پرستی کردی

ترجمہ:۔ سرمد کیا تو نے دیں میں رخنہ پیدا   ایماں کس چشم مست کو دے ڈالا
جو کچھ تھا زرِ نقد وہ باعجز و نیاز   سب کر دیا تو نے بت پرستی پہ فدا

اس سے زیادہ اس ترجمے کے لئے اور کیا کہا جائے کہ سچا کھرا اور لفظ و معنی کے اعتبار سے اصل سے وفادار اور خوبصورت ہے۔

کتاب : فرقانِ عظیم

مترجم : پروفیسر حسین سحر

مبصر : پروفیسر حسن عسکری کاظمی

''فرقانِ عظیم'' قرآن کریم کے مطالب و مفاہیم کی اردو میں منظوم ترجمانی کی زیارت کرتے ہوئے نگاہوں نے حرف حرف کے بوسے لئے۔ اس زاویہ نظر سے کہ اردو شاعری میں نظم معریٰ کے پہلو بہ پہلو آزاد نظم بھی صنفِ شاعری کہلائی اور اس میں کامیاب تجربہ کرنے والوں کی فہرست میں معتبر اسمائے گرامی کی ایک کہکشاں جگمگا رہی ہے لیکن کسی شاعر نے آزاد نظم جیسی صنف سخن کو قرآن پاک کا منظوم ترجمہ کرنے کی خاطر منتخب نہیں کیا تھا، یہ کارِ خیر پاکستان کے معروف دانشور اور قادر الکلام شاعر جناب حسین سحر نے انجام دیا جو دینی شغف رکھنے والوں کے علاوہ عام قاری اور شعر و ادب کا ذوق رکھنے والوں کے لئے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں، قرآن پاک کے اردو تراجم و تفاسیر سے متعلق کتابیات پر نظر ڈالیں تو ستر بہتر سے زائد کتابیں پاکستان کی لائبریریوں میں موجود ہیں۔ ان میں منظوم ترجمے بھی آپ کی نظر سے گزریں گے جن میں آغا شاعر قزلباش دہلوی کا منظوم اردو ترجمہ افصح الکلام خاص شہرت رکھتا ہے اسی طرح جناب عبدالعزیز خالد کا منظوم ترجمہ فرقانِ جاوید اور عہد موجود میں آپ رواں کے نام سے منظوم اردو ترجمہ سید شمیم رجز نے شائع کیا۔ ان سب منظوم ترجموں میں قوافی اور ردیف کا التزام رکھتے ہوئے شعراء کو سخت مشکلات پیش آئیں۔ بیشتر ترجموں کی زبان روزمرہ اور محاورہ کے معیار سے مبرا ہے، پڑھتے ہوئے الفاظ و معانی میں ربط پیدا کرنا قاری کے لئے دشوار ہو جاتا ہے، پروفیسر حسین نے اس کے برعکس نظم آزاد کی ہیئت میں اور ایک ہی بحر میں پورے قرآن کا ترجمہ کیا، ان کے بقول پابند صورت میں شعری حدود و قیود کے باعث مفہوم کو آزادی کے ساتھ ادا نہیں کیا جا سکتا جب کہ آزاد نظم میں یہ پابندی نہیں اور پھر قرآن کا عام اسلوب بھی چونکہ نظم آزاد سے زیادہ قریب ہے اس لئے اسی کو اپنایا گیا ہے۔

قرآن پاک ۱۱۴ سورتوں پر مشتمل ہے، ہر سورت کے لئے دائیں طرف آیات مرتب کی گئیں

اور بائیں طرف منظوم ترجمہ ترتیب دیا گیا۔ یہ التزام شروع سے آخر تک فرقانِ عظیم کے حسن و جمال کو معراج کمال پر رکھے ہوئے ہے، بائیں حصے میں ترجمہ معانی و مفہوم کا آئینہ بن کر پڑھنے والے کے تجسس میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ پوری سورت کی تفہیم اتنی آسان ہو جاتی ہے کہ ہر لفظ کا مطلب کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ حسین سحر نے آیت کے تسلسل کو برقرار رکھنے کی خاطر قوسین کا استعمال کیا اس سے بہتر اسلوب اظہار ممکن نہیں کہ نظم آزاد رکھتے ہوئے روحِ معانی کو ٹھیس نہ پہنچے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ "ان تمام مساعی کا محرک اس عظیم آسمانی کتاب کے آفاقی پیغام کو زیادہ سے زیادہ سمجھنا اور سمجھانا ہے۔ چونکہ قرآن بالعموم تمام عالم انسانیت اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے رہنمائے حیات کا درجہ رکھتا ہے اس لئے ہر دور میں قرآن فہمی کی ضرورت بھی محسوس کی گئی میری یہ کاوش بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے"

پورے قرآنِ پاک کا منظوم ترجمہ کرنا ہمت اور حوصلے اور تائید ایزدی کے بغیر ممکن نہیں۔ حسین سحر کا تدریسی تجربہ تیس سال سے زائد مدت پر محیط ہے۔ اس مدت میں ان کا مطالعہ اور ریاضت ان کے کام آ گئے لیکن یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ ملازمت سے فارغ ہو کر وہ ریاض (سعودی عرب) میں اپنے بیٹوں کے پاس رہے جہاں انہیں دینی کتب کھنگالنے کے مواقع میسر آئے، ارض حرمین شریفین میں قیام رحمتوں اور برکتوں کے حصول کا وسیلہ قرار پایا، انہوں نے مولانا شبلی کی طرح اپنا بیشتر وقت کتب خانوں میں بسر کیا، مطالعہ و مشاہدہ اور تصنیف و تالیف کے لئے ایسے مواقع کسی کو کم میسر آتے ہیں۔ ریاض میں جہاں علمی اور ادبی سرگرمیاں عروج پر رہتی ہیں۔ وہاں بیش قیمت کتابوں کا ذخیرہ بھی ادب سے شغف رکھنے والوں کے لئے مصروفیت کا بہانہ بن جاتا ہے چنانچہ پروفیسر حسین سحر کو اپنے زمانہ قیام میں یک سوئی کے ساتھ پڑھنے اور کتابوں کی ورق گردانی کے علاوہ غور و فکر کرنے کی مہلت ہوئی۔

پروفیسر حسین سحر کی شخصیت میں کمال جاذبیت اور ان کی ہنر مندی میں ایسی کشش ہے کہ باید و شاید۔ ان کی طبیعت میں سوز و ساز رکھ رکھاؤ اور گفتگو میں علمیت کا اعتراف نہ کرنا بخیلی کہلائے گا، ملتان میں اور بھی بہت سے باکمال لوگ موجود ہیں ان میں ڈاکٹر عاصی کرنالی اسی سلسلہ صدق و صفا کی روشن مثال ہیں، شاعری، تنقید اور تحقیق میں ان دونوں صاحبان علم کا نام لینے سے پہلے چشم تصور کا باوضو ہونا

ضروری ہے۔اور اب کہ جناب حسین سحر نے وہ کارنامہ سرانجام دیا کہ ان کے تحفہء عظیم.....فرقان عظیم کا مطالعہ کرنا تلاوت کرنے کے مترادف ہے انہوں نے اس آزاد نظم کی صورت میں ہر سورت کا ترجمہ کرنے سے پہلے توفیق خداوندی کی دعا مانگی ہوگی، اس ترجمے کا معیار اتنا محکم اور سہل ممتنع کے مصداق ہے کہ اس سے بہتر کا تصور ممکن نہیں، زبان سلیس، بامحاورہ، عام فہم اور رواں ہے، دوسرے یہ کہ منفرد انداز اظہار اور ترجمے کے لئے مخصوص ہیئت اور بحر کا ملحوظ رکھنا اور تمام سورتوں میں اسی مترنم بحر کا التزام پیش نظر رکھنا ان کے ذوق سلیم کا منہ بولتا ثبوت ہے، انہوں نے تمام مروجہ اور مقبول ترجموں کے علاوہ ہر مکتب فکر کے شعری تراجم سے استفادہ کیا ہے، اتحاد بین المسلمین کے عظیم تر مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے یہ سعی مشکور بھی کی کہ فقہی اور مسلکی اختلاف کو کم کرنے پر توجہ کی جائے، وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔

نظم آزاد کی تعریف یہ ہے کہ آغاز سے انجام تک کسی ایک بحر میں مطالب بیان کرتے ہوئے مخصوص آہنگ اور زیروبم کا تسلسل فہم وادراک کے دریچے واکرتا قاری کے ذہن کو تازگی بخشنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے نظم آزاد میں آورد کی بجائے فطری بہاؤ اور صوری حسن و جمال ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔ بظاہر یہ تخلیقی عمل آسان لگتا ہے لیکن الفاظ کے انتخاب میں احتیاط ضروری ہوتی ہے۔ مترادف الفاظ میں سے کسی ایک لفظ کا چناؤ شاعر کے ذوق نظر کی آزمائش اور فکری بصیرت کا مرحلہ جاں گداز ہوتا ہے۔ حسین سحر نے قرآن پاک کی آیات بینات کے ترجمے میں منظوم ترجمانی کے پیش نظر وسعتِ مطالعہ اور تقابلی مشاہدہ سے کام لیا۔ ہوسکتا ہے کہ بعض جگہ ترجمہ کرتے ہوئے وہ خود تذبذب میں مبتلا ہوئے ہوں اور بقول حالی

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں   اب دیکھیئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

اس صورت حال میں انہیں بہتر سے بہتر کی تلاش میں نئی لائنیں ترتیب دینے کی ضرورت پڑی ہوگی اور فرقانِ عظیم کی عظمت کا خیال انہیں معانی ومفہوم کی وضاحت میں ترمیم کی طرف مبذول کرنا پڑا ہوگا اور یوں آغاز سے انجام تک دیکھیں ''کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک'' کے مصداق کتنے مراحل طے کرنا پڑے ہوں گے۔

آخر میں حسین سحر کے نظم آزاد کی ہیئت میں ایک مختصر سورہ کا ترجمہ پیش کرنا اور اس مختصر تبصرے

میں شامل کرنے کا خیال آنالازمی سی بات ہے، چنانچہ سورۂ والتین ۹۵ کا منظوم ترجمہ نذر قارئین ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم ٥

خدا کے نام سے جو مہربان سے حد، نہایت رحم والا ہے

والتین والزیتون ٥وطور سینین ٥ وھذ البلدالامین ٥لقد خلقنا
الانسان فی احسن تقویم ٥ثم رددنا اسفل سفلین ٥ الا الذین امنو
ا وعملوا الصلحت فلھم اجر غیر ممنون ٥فما یکذبک بعد
بالدین ٥الیس اللہ باحکم الحکمین ٥

قسم انجیر کی، زیتون کی (۱) اور طور سینا کی (۲) قسم اس امن والے شہر (مکہ) کی
(۳) کہ ہم نے بہتریں صورت انساں کو کیا پیدا (۴) پھر اس کو (کر کے بوڑھا
) پست سے بھی پست حالت کی طرف لوٹا دیا ہم نے (۵) مگر جو لائے ایماں اور
جنہوں نے نیکیاں کیں اجر ہے بے انتہا ان کا (۶) پھر اس کے بعد (اے
مرسل) بھلا کون آپ کو جھٹلائے گا روز جزا کے سلسلے میں؟ (۷) کیا نہیں اللہ سارے
حاکموں کا حاکمِ اعلیٰ؟ (۸)

پروفیسر حسین سحر نے یہ آزاد نظم کی دل آویز ہیئت اختیار کر کے جو منظوم ترجمہ کیا یقیناً بارگاہ خداوندی میں شرف قبولیت حاصل کر چکا ہے، ہم اس خیر عمل کے بجالانے پر دل کی گہرائی سے ان کو ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ دنیا اور آخرت میں ان کو اجر عظیم اور اللہ تعالیٰ ان کے نیک فرزندوں کو رزق بے بہا مرحمت فرمائے کہ اس کار خیر کے جملہ مصارف انہوں نے بخوشی برداشت کیے۔

ڈاکٹر غلام شبیر رانا

محسن بھوپالی☆ : برس گیا بہ خراباتِ آرزو ترا غم

محسن بھوپالی (عبد الرحمٰن) چل بسے۔ ۲۹ ستمبر ۱۹۳۲ء کو بھوپال سے طلوع ہونے والا یہ آفتاب علم ۱۶ جنوری ۲۰۰۷ء کی شام کراچی میں غروب ہو گیا بزم ادب ان کے بعد موت تک سوگوار رہے گی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

محسن بھوپالی کا پیشہ انجینئرنگ تھا مگر انہوں نے اردو شاعری میں اپنی فنی مہارت کا لوہا منوایا۔ انہوں نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا اور قائداعظمؒ کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے نوجوانوں کو جدوجہد آزادی میں حصہ لینے پر آمادہ کیا۔ محسن بھوپالی حریت فکر کے مجاہد تھے۔ وہ تیشۂ حرف سے فصیل جبر کو منہدم کرنے کے آرزومند تھے۔ زر کی اسیری قبول کرنے والوں، استحصالی عناصر، ظالموں اور درندوں پر وہ لعنت بھیجتے تھے۔ محراب مصلحت میں سرنگوں ہونے والے موقع پرست منافقوں کے خلاف انہوں نے کھل کر لکھا۔ آزادی کے بعد وطن عزیز میں عوام کو آزادی کے ثمرات سے محروم کر دیا گیا۔ استحصالی عناصر نے تمام وسائل پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ محسن بھوپالی نے اس الم ناک صورت حال پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

تلقین اعتماد وہ فرما رہے ہیں آج ۔۔۔ راہ طلب میں خود جو کبھی معتبر نہ تھے
نیرنگی سیاست دوراں تو دیکھیے ۔۔۔ منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

استحصالی عناصر نے مذموم مقاصد کے تحت اقربا پروری کا سلسلہ شروع کر دیا۔ قومی وسائل اندھے کی ریوڑیوں کی طرح اپنوں میں بے دریغ تقسیم کیے جانے لگے۔ چور محل میں پروان چڑھنے والے

☆ ہم فاضل مضمون نگار کے ازحد ممنون ہیں کہ انہوں نے محسن بھوپالی جیسے ذہین و زیرک فن کار اور حساس و خوددار شاعر کے سانحۂ رحلت پر اپنے تعزیتی تاثرات بروقت بھجوا دیئے اور ہمیں موقع ملا کہ زیرِ نظر شمارہ کی تدوین میں بوجوہ تاخیر کے سبب شریک اشاعت کر سکیں۔ (ادارہ)

سانپ کے نیچے کے بچھو چور دروازے سے مسند ارشاد پر چڑھ دوڑے ایک ایسی فضا پیدا ہوگئی جس میں حلال وحرام کی تمیز ختم ہوگئی۔ ظلم، استبداد اور جبر کے باعث مظلوم انسانیت مصائب وآلام کے کوہِ گراں کے نیچے دب کر سسکنے لگی، ذاتی مفادات کو قومی مفادات پر ترجیح ملنے لگی۔ انسانیت کی توہین، تذلیل اور بے توقیری عام ہوتی چلی گئی۔ زندگی کی اقدار عالیہ کی پامالی معمول بن گئی ہر طرف وحشی درندے دندناتے پھرتے تھے۔ شیخ چلی جیسے احمق شیخ الجامعہ بن بیٹھے۔ یہ ایک ایسا سانحہ تھا جس نے ذہن وذکاوت کو کچل ڈالا۔ محسن بھوپالی نے اس المیے پر اپنے قلبی دکھ اور کرب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

جاہل کو اگر جہل کا انعام دیا جائے   اس حادثۂ وقت کو کیا نام دیا جائے
مے خانے کی توہین ہے رندوں کی ہتک ہے   کم ظرف کے ہاتھوں میں اگر جام دیا جائے

محسن بھوپالی نے اپنے فنی تجربوں سے اردو شاعری کو نئے امکانات سے آشنا کیا ایک رجحان ساز ادیب کی حیثیت سے انہوں نے اپنے ترقی پسندانہ خیالات کا برملا اظہار کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ معاشرے میں انسان کو زندہ رہنے کا حق ملنا چاہئے۔ جبر واستبداد کے ماحول میں تو پرندے بھی اپنے آشیانوں میں سسک سسک کر دم توڑ دیتے ہیں۔ زندگی کے تضادات اور جبر کے مسموم اثرات کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

کوششیں بے سود ہو کر رہ گئیں   مشعلیں بے دُود ہو کر رہ گئیں
رہبروں کے دائرے بڑھتے گئے   منزلیں مفقود ہو کر رہ گئیں

دیوار چمن لاکھ اٹھاتے رہو لیکن   خوشبو کو بکھرنے سے نہ تم روک سکو گے
فطرت کے بھی بس میں نہیں فطرت کا بدلنا   سورج کو ابھرنے سے نہ تم روک سکو گے

باغباں کی نگہ لطف وکرم بدلی ہے   غنچہ وگل کو تبسم کی سزا ملتی ہے
رہزنی بھیس میں رہبر کے پھرا کرتی ہے   دیکھتے ہو کہ قضا سر پہ کھڑی ہنستی ہے
زندگی نوحہ بہ لب گریہ کناں پھرتی ہے   اپنے پہلو میں لیے سوز نہاں پھرتی ہے

شاعری کی صنف نظمانے محسن بھوپالی کی طرز خاص ہے، جس کے آغاز کا سہرا انہی کے سر ہے۔ 'نظمانے'

اپنی اصلیت کے لحاظ سے منظوم افسانے ہیں ان کا واحد تاثر روح میں اتر جاتا ہے۔ محسن بھوپالی کو اندازہ تھا کہ معاشرہ جس پستی کی طرف جا رہا ہے اس سے نکلنا محال ہے۔ ان کے نظمیے آج بھی تازیانہ عبرت ہیں۔

دریا کا جب کس بل ٹوٹا

ساحل کی آنکھوں نے دیکھا

ہار گیا تھا

ممتا سے سیلاب

مُردہ ہاتھ میں بچہ یوں تھا

جیسے کِھلا گلاب

محسن بھوپالی نے ہائیکو نگاری پر بھی توجہ کی۔ ان کی سولہ (۱۶) وقیع تصانیف سے اردو ادب کی ثروت میں اضافہ ہوا۔ ''منظر پتلی میں'' ان کے ہائیکو کا مجموعہ ہے ان کے ہائیکو گہرے تاثر کے حامل ہیں۔

لمبا چوڑا الان

نو دو لیتے کے گھر میں

چھوٹا دستر خوان

گرمی کا یہ روپ

ماتھے پر تو رم جھم ہے

اور گالوں پر دھوپ

محسن بھوپالی نے پیار، محبت، وفا اور خلوص کے باب میں اپنا منفرد انداز پیش کیا ہے۔ وہ وفا کے سلسلے میں کسی مجبوری کو تسلیم نہیں کرتے۔

چاہت میں کیا دنیاداری عشق میں کیسی مجبوری ۔۔۔ لوگوں کا کیا سمجھانے دو ان کی اپنی مجبوری

جب تک ہنستا گاتا موسم اپنا ہے سب اپنے ہیں ۔۔۔ وقت پڑے تو یاد آتی ہے کیسی کیسی مجبوری

محسن بھوپالی اب ہمارے درمیان نہیں رہے مگر ان کا کلام تا ابد قارئین کے اذہان کی تطہیر و تنویر کا اہتمام کرتا رہے گا۔

کھلی کتاب کی مانند تھا جو میرے لئے ۔۔۔ وہ کہہ رہا تھا تمہیں بے نقاب کر دوں گا

انور خلیل

دائرۂ علم و ادب

سن ساٹھ کی دہائی میں بنی باغ ضیاء الدین میموریل کالج، کراچی کے اہم علمی اور ادبی مراکز میں شمار ہوتا تھا۔ اس ادارے کو یہ حیثیت کالج کے بانی پرنسپل پروفیسر خواجہ آشکار حسین کی کوششوں سے حاصل ہوئی۔ خواجہ صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ممتاز طلباء میں سے تھے اور وضع قطع اور کردار و گفتار میں اُس تہذیب و تمدن کا لائقِ تقلید نمونہ تھے جسے ہندوستانی مسلمانوں کی پہچان سمجھنا چاہئے۔ اسی تہذیب و تمدن کی آبیاری کیلئے یہ منفرد تعلیمی ادارہ قائم کیا گیا تھا۔ ہندوستان میں سیاسی بیداری اور تحریک آزادی کیلئے جن تعلیمی اداروں نے بنیادی کردار ادا کیا ان میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔

ہندوستان کی جن صوبائی اسمبلیوں نے ہندوستان کے سیاسی مستقبل پر مہر لگائی ان کا انتخاب ۱۹۴۶ء میں عمل میں آیا تھا۔ ان انتخابات میں آل انڈیا نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ ایک دوسرے کے مقابل تھیں۔ مسلم لیگ کا مطالبہ تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کیلئے ایک علیحدہ مملکت قائم کی جائے جبکہ کانگریس اس مطالبے کی مخالف تھی، اور چاہتی تھی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ ان تاریخی انتخابات میں ہر جگہ مسلم لیگ کا مقبول نعرہ تھا ''لے کے رہیں گے پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان۔''

آل انڈیا مسلم لیگ نے پورے ہندوستان میں بھرپور انتخابی مہم چلائی اور خصوصاً مسلم اکثریت والے صوبوں میں اپنے امیدواروں کی کامیابی کیلئے دن رات محنت کی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء نے اس انتخابی مہم میں مسلم لیگی امیدواروں کے انتخابی کارکنوں کی طرح زبردست خدمات انجام دیں۔ ہر صوبے میں انتخابی مہم کیلئے علی گڑھ یونیورسٹی کے رضاکار دستے بھیجے گئے۔ صوبہ پنجاب میں جہاں کانگریس کی حامی یونینسٹ پارٹی کی حکومت تھی، آل انڈیا مسلم لیگ کو ایک زبردست انتخابی معرکہ درپیش

تھا۔ اس معرکے میں مسلم لیگ کی مدد کرنے کیلئے علی گڑھ یونیورسٹی نے طلباء کے خصوصی دستے بھیجے۔ ان دستوں میں سے ایک میں خواجہ آشکار حسین ایک سرگرم رکن کے طور پر شامل تھے۔ پاکستان بننے کے بعد خواجہ صاحب کراچی آ گئے' یہاں پہلے کچھ عرصہ تک اس وقت کے سب سے بڑے اردو اخبار روزنامہ ''انجام'' سے منسلک رہے پھر شعبہ تدریس میں آ گئے۔ سن انیس سو ساٹھ کی دہائی میں جب وہ اردو کالج' کراچی میں شعبہ فلسفہ ونفسیات کے صدر تھے' بنی باغ کالج کی بنیاد رکھی گئی اور خواجہ صاحب کو اس نئے کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ چند برس میں ہی انہوں نے بنی باغ کالج کو کراچی کا ایک صفِ اول کا ادارہ بنا دیا جو تعلیم وتدریس کی خدمات بھی انجام دیتا تھا اور علمی وادبی سرگرمیوں کا مرکز بھی تھا۔

اس زمانے میں کراچی میں صرف حلقہ ارباب ذوق کی ہفتہ وار نشستیں ہوتی تھیں اکثر لکھنے والوں کی کافی تعداد ان نشستوں میں دلچسپی لیتی تھی۔ خواجہ صاحب نے جو خود بھی شاعر تھے اور وفاؔ تخلص کرتے تھے محسوس کیا کہ کراچی میں ایک اور مرکز بھی ایسی سرگرمیوں کیلئے ہونا چاہئے چنانچہ ''دائرہ علم و ادب'' کے نام سے ہفتہ وار تنقیدی نشستوں کا آغاز کر دیا گیا۔ یہ نشستیں پرنسپل کے کمرے کے برابر ایک چھوٹے سے لان میں ہوتی تھیں اور ان میں اس زمانے کے نمایاں لکھنے والے شریک ہوتے تھے۔

حلقہ ارباب ذوق کی طرح دائرہ علم وادب میں بھی حفظ مراتب کے باوجود گفتگو بلاتکلف ہوتی تھی اور تنقید کرتے وقت تہذیب وشائستگی کے سوا کوئی اور لحاظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ گفتگو میں طرح داری کا عنصر ہر نشست میں در آنا معمول تھا۔ تیکھے جملے بھی سننے کو ملتے تھے اور ان نشستوں کے مزاج سے ناواقفیت کی بنا پر کوئی صاحب کسی واقف کار کی مدح سرائی کرنے لگتے تو اس کی پکڑ بھی خوبصورتی سے کی جاتی۔ بطور مثال ایک واقعہ درج کرتا ہوں۔

سید ذوالفقار علی بخاری کمال کے جملہ باز تھے اور کوئی بائیں ہاتھ پر آ جاتا تو بخشتے نہیں تھے۔ ایک نشست میں وہ صدارت کر رہے تھے۔ کراچی شہر کے ایک ''استاد'' شاعر نے تنقید کیلئے غزل پیش کی تو شاعر صاحب کی لب کشائی سے پہلے ہی کچھ آوازیں ''واہ واہ'' کی بلند ہوئیں۔ بخاری صاحب نے چونک کر نظر گھمائی تو دیکھا کہ کچھ اجنبی نوجوان مودب انداز میں بیٹھے ہیں اور استاد کی طرف اس طرح ہمہ تن

متوجہ ہیں کہ مصرعہ اٹھانے میں تاخیر کے مرتکب نہ ہو جائیں۔

قصہ یہ تھا کہ قبیلۂ استاداں سے تعلق رکھنے والے ان شاعر صاحب نے دائرہ علم وادب کی شہرت سن کر درخواست کی کہ وہ غزل تنقید کیلئے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ حسبِ درخواست کسی آئندہ نشست کے پروگرام میں ان کا نام غزل برائے تنقید کے زمرے میں شامل کر لیا گیا۔ پروگرام والے دن وہ تشریف لائے تو ان کے ساتھ چند ''شاگرد'' بھی آئے۔ یہ سب ملیر یا لانڈھی جیسے دور دراز علاقوں کے تھے۔ استاد شاعر نے بھی کسی تنقیدی نشست میں شاید کبھی شرکت نہیں کی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ ان کی باری آئی تو نشست کی صدارت کیلئے قرعہ فال ذوالفقار علی بخاری صاحب کے نام نکلا۔ بخاری صاحب نے ذرا نظر جما کے شاعر صاحب کو دیکھا اور کہا ''حضرت، بسم اللہ۔ ایک ایک کر کے شعر تنقید کیلئے پیش کرتے جایئے۔''

مطلع پیش ہوا تو شاگردوں نے ''واہ واہ'' کے ساتھ شعر کی تعریف شروع کر دی اور محاسنِ شعری بیان کرنے لگے۔ باقی حاضرین خاموش رہے۔ شاعر صاحب ایک ایک کر کے شعر پڑھتے گئے اور شاگرد 'ضائع' بدائع گنواتے رہے۔ جب غزل کے سات شعر ہو چکے تو بخاری صاحب نے ہاتھ اٹھا کر شاعر کو مزید شعر پڑھنے سے روک دیا اور فرمایا کہ ایک نشست میں سات سے زیادہ شعر پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ غزل کے مجموعی تاثر پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے بخاری نے کہا کہ ''آج کی نشست میں غزل کے شعری محاسن بیان کرنے کیلئے تمام ضائع بدائع کا حوالہ دیا گیا لیکن حیرت ہے کہ اس کلام کی سب سے نمایاں صنعت کا آپ میں سے کسی نے نام نہیں لیا۔۔۔'' یہاں تک کہہ کے بخاری صاحب اچانک خاموش ہو گئے۔ حاضرین خصوصاً شاعر صاحب اور شاگرد بڑے اشتیاق کے ساتھ منتظر تھے کہ دیکھئے بخاری صاحب کس نادر صنعت کا ذکر کرتے ہیں، لیکن بخاری صاحب یوں بے خبر جیسے مزید کچھ کہنا ہی نہیں۔ وہ نشست ختم ہونے کا اعلان کرنے ہی والے تھے کہ ایک شاگرد نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ اور حضرت! وہ صنعت جس کا آپ نے ذکر کیا اس صنعت کو کیا کہتے ہیں؟ بخاری صاحب نے ایک لمبی ''جی'' کے ساتھ سوال کرنے والے کی طرف نظر گھمائی تو انہوں نے ذرا توقف کے ساتھ سوال دہرایا۔

''جی! وہ اس صنعت کو کیا کہتے ہیں؟''

''صنعتِ تضیع اوقات!!''

بخاری صاحب نے یوں جما جما کر کہا جیسے مصرع کی تقطیع کر رہے ہوں۔

دائرہ علم وادب میں اس طرح کا حادثہ اگرچہ ایک آدھ بار ہی ہوا لیکن ہر نشست میں شگفتگی برسانے اور مسکراہٹیں بکھیرنے والے مواقع آتے رہتے تھے۔ کبھی کوئی موضوع ایسا بھی چھڑ جاتا کہ گہری سنجیدگی یا افسردگی کا سا سماں پیدا ہو جاتا۔ لیکن دائرہ علم وادب کی تنقیدی نشستوں کی جان وہ گرما گرمی بلکہ گرمجوشی ہوتی تھی جو شعر وادب کے وقیع معاملات ومسائل پر بحث میں پیدا ہو جاتی تھی۔ تنقید اکثر سخت ہوتی اور رعایت برتنے کا خیال بھی شاذ و نادر ہی کسی کو آتا تھا۔ بات جو بھی کرتا کھری اور کھرے انداز میں۔ اس کے باوجود گفتگو ہمیشہ شخصی اور انفرادی سطح سے بلند رہتی۔ یہی وجہ تھی کہ نہ سننے والا برا مانتا نہ کہنے والا گردن اکڑاتا۔

دائرہ علم وادب کے پہلے سیکرٹری کی حیثیت سے ہفتہ وار نشستوں کی کارروائی کا کچھ ریکارڈ میرے پاس محفوظ ہے۔ کچھ ریکارڈ جوہر حسین سے مجھے ملا تھا لیکن ان نشستوں کا کافی ریکارڈ بنی باغ کالج کے پرنسپل خواجہ آشکار حسین کے دفتر میں بھی تھا جو معلوم نہیں اب کہاں ہے۔ ہے بھی یا نہیں۔ ''الاقرباء'' کے قارئین کیلئے دائرہ علم وادب کی ایک نشست کی توثیق شدہ کارروائی ذیل میں درج ہے۔ دائرہ علم و ادب کی ہفتہ وار نشست مورخہ ۲۳ ستمبر ۱۹۶۶ء کو پہلے نذیر ناجی اور پھر سید محمد تقی کی صدارت میں ہوئی۔ شمیم نوید نے اپنی غزل تنقید کیلئے پیش کی۔ مطلع تھا:

جسے آزارِ جاں سمجھا بھی ہم نے — نہ جانے کیوں اسے چاہا بھی ہم نے

انعام دانش: جناب صدر پہلے مصرع کا ''بھی'' زائد معلوم ہوتا ہے۔

سرشار صدیقی: جناب صدر غالباً فاضل معترض نے شعر کو نثر کر کے پڑھا ہے اس لئے ''بھی'' زائد نظر آتا ہے اس شعر میں ''بھی'' حشو وزوائد میں سے نہیں معلوم ہوتا۔

رؤف شیرازی: روایتی انداز کا اچھا شعر ہے۔

خالد علیگ: دونوں مصرعوں کے قافیوں کو ملحوظ رکھا جائے تو ''بھی'' کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے۔

انعام دانش: میرے اعتراض پر غور ہی نہیں کیا گیا۔ جناب صدر نے دوسرا شعر پڑھنے کیلئے کہا۔

سنا ہے شہر میں ایسا بھی ہم نے　　　کوئی خوشبو نہیں اب اس گلی میں

خالد علیگ: دونوں مصرعوں میں عجیب سی دوری محسوس ہوتی ہے۔ دوسرا مصرعہ پہلے مصرع کو نہیں پہنچتا۔

سرشار: دونوں مصرعوں میں کوئی دوری نہیں۔

خواجہ آشکار حسین: اس شعر میں کوئی قابل ذکر بات نہیں ہے۔

پہلے مصرعہ میں جو کچھ کہا گیا ہے دوسرے مصرعہ میں ''سنا ہے'' کا ٹکڑا اس کی شدت کو بالکل ختم کر دیتا ہے۔

عبیداللہ علیم: اس شعر میں ایک کمزور پہلو یہ ہے کہ جس خوشبو کا شاعر ذکر کر رہا ہے اس سے پورا شہر متاثر نظر آتا ہے، حالانکہ یہاں خوشبو سے مراد محبوب ہے اور وہ بازاری ہو جاتا ہے۔ اگلا شعر تھا:

اسے دیکھا ہے اب تنہا بھی ہم نے　　　جو تنہا تھا مگر اک انجمن تھا

سرشار صدیقی: پہلے تنہا تھا اور انجمن تھا اور اب بھی تنہا دیکھا ہے یہ کیا بات ہوئی؟

امید ڈبائیوی: ہو سکتا ہے اس شعر میں شاعر خود سے مخاطب ہو۔

نذیر ناجی: اس شعر میں شاعر خود ہی سے مخاطب ہے اور اس کمی کو بیان کر رہا ہے جو اب اسے انجمن نہیں بننے دیتی۔

سرشار صدیقی: اس شعر میں تنہائی صرف تنہائی رہتی ہے اور اجتماعی تنہائی میں منتقل نہیں ہوتی جبکہ دوسرے مصرع کا تقاضا یہی ہے کہ تنہائی اجتماعی تنہائی ہو۔

عبیداللہ علیم: داخلی اور خارجی تنہائی کی بات ہے۔ جب شاعر خارجی پھیلاؤ سے کٹ جاتا ہے تو تنہا ہو جاتا ہے چاہے داخلی پھیلاؤ کتنا ہی وسیع ہو۔

خواجہ آشکار حسین: دونوں مصرعوں میں تنہا مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ پہلا تنہا منفرد کے معنوں میں ہے اور دوسرا تنہائی کے معنوں میں۔ یہ تنہائی وہ ہے جہاں منفرد شخص داخل سے بھی کٹ جاتا ہے۔ اس کے بعد کا شعر تھا:

وہیں دیکھا ہے اک سایہ بھی ہم نے　　　جہاں ہر روز جاتا ہے یہ سورج

انور خلیل: مہمل شعر ہے۔

عبیداللہ علیم: شاعر سورج اور سائے کے الفاظ استعمال کرنا چاہتا تھا اور بس۔

سید محمد تقی: سورج کو اگر سماجی خوشحالی کی علامت سمجھا جائے تو شاید اس شعر کا کوئی سماجی مفہوم نکل سکے۔

خالد علیگ: جناب صدر کروچے (Croce) نے کہا تھا کہ کوئی آدمی مہمل نہیں کہہ سکتا۔

عبیداللہ علیم: یہ شعر کروچے کے بیان کی تردید کیلئے کہا گیا ہے۔

اگلا شعر تھا:

انہی آنکھوں میں جو بے نور ہیں اب　　اُتارا تھا کوئی چہرہ بھی ہم نے

شعر پسند کیا گیا۔ اس کے بعد کا شعر تھا۔

سجایا تھا وہ گھر کیا کیا کہ جس میں　　بسا رکھا ہے اب صحرا بھی ہم نے

سرشار صدیقی: اس شعر میں ''بھی'' نہ صرف زائد ہے بلکہ شعر کے مفہوم کو نقصان بھی پہنچا رہا ہے۔ شاعر صرف صحرا کہنا چاہتا ہے۔

انور خلیل: جناب صدر اس شعر میں ''بھی'' بڑا بھرپور ہے اور مفہوم کی طرف رہنمائی کیلئے انتہائی ضروری ہے۔ شاعر یہ المیہ بیان کر رہا ہے کہ جس گھر کو اس نے کیا کیا سجایا تھا اور صحرا کو الگ رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن مجبوری یہ کہ اب صحرا بھی اس میں بسانا پڑا ہے۔ یعنی سجاوٹ کی جو چیزیں پہلے رکھی گئی تھیں اب ان کے ساتھ صحرا بھی ہے۔

خواجہ انتظار حسین: درست ہے جناب والا ''بھی'' زائد نہیں معلوم ہوتا۔

سید محمد احمد سعید: ''بھی'' شعر کے مفہوم کو نقصان پہنچاتا ہے۔

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ جس گھر کو اس نے سجا رکھا تھا اب اس میں صحرا بسا ہوا ہے یعنی وہ ویران ہو گیا ہے۔ یہاں ''بھی'' کی کیا ضرورت ہے۔

عبیداللہ علیم: شعر میں ایک تہذیب سے دوسری تہذیب کا سفر تھا۔ مقطع پڑھا گیا:

وہیں سے آج پیاسے لوٹ آئے　　بہایا تھا جہاں دریا بھی ہم نے

عبید اللہ علیم: یہ شعر بھی مطلع کی نسل کا ہے۔

خالد علیگ: دوسرے مصرعہ میں ''بہایا تھا'' کی جگہ 'بہائے تھے' ہوتا تو شعر کا ذم اور واضح ہو جاتا۔

غزل کے مجموعی تاثر کے بارے میں صدر صاحب نے کہا کہ شاعر کے ہاں اشاریت کا رجحان بہت ہے اور یہ ترقی کی علامت ہے۔ خالد علیگ کے خیال میں اشاریت غیر محتاط تھی اور عبید اللہ کے نزدیک سرے سے اشاریت تھی ہی نہیں۔ غزل پر گفتگو ختم ہونے کے بعد امید ڈبائی نے اپنا مضمون پڑھا۔۔آپ بیتی اور خواجہ حسن نظامی۔

حکیم اسرار احمد کریوی نے مضمون پر گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ ہم مسلمانوں کی عادت ہے کہ مر جانے والوں کی تعریف کرتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کا مرتبہ آپ بیتی لکھنے والے کی حیثیت سے اتنا بلند نہیں ہے جتنا صاحب مضمون نے ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ خواجہ صاحب کی آپ بیتی میں صداقت نہیں ہے وہ بہت بڑے فنکار تھے اور ان کے قول و فعل میں بڑا فرق تھا۔ ان کا طرز نگارش بنیادی اور قابل تقلید ضرور ہے لیکن ان کی آپ بیتی میں پروپیگنڈے کا عنصر غالب ہے۔ اردو ادب میں پروپیگنڈہ کی تکنیک کو خواجہ صاحب نے بہت مستحکم کیا۔ خواجہ صاحب کے معاملے میں صاحب مضمون کو جو حسن ظن ہے وہ مناسب نہیں ان کی ادبی حیثیت سے انکار نہیں لیکن پھر بھی ان کی آپ بیتی میں صداقت نہیں ہے۔ سر رضا علی کا ''اعمال نامہ'' جو ان کی آپ بیتی ہے کامیاب آپ بیتی کی مثال کے طور پیش کیا جا سکتا ہے۔ آپ بیتی میں ضروری ہوتا ہے کہ لکھنے والا صرف واقعات بیان کرے اور نتیجہ پڑھنے والے پر چھوڑ دے۔ خواجہ صاحب نے اس کے برعکس اپنی خامیاں گنوادی ہیں اور ان کے بیان کو کمزور رکھ کے بد دیانتی کا ثبوت دیا ہے۔ البتہ خواجہ صاحب کا اندازِ بیان بڑا شگفتہ ہے۔

خالد علیگ نے حکیم صاحب کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے گاندھی جی کی آپ بیتی کا حوالہ دیا۔ انہوں نے کہا کہ خواجہ صاحب کی آپ بیتی پر مضمون لکھنے سے پہلے اگر ان کی دوسری تحریریں مثلاً ''منادی'' کے وہ صفحات جن میں ان کا روزنامچہ چھپتا تھا پڑھ لی جائیں تو خواجہ صاحب کا پورا خاکہ سامنے آجاتا۔

خواجہ آشکار حسین: مقالہ نگار نے حسن نظامی کی بہت زیادہ تعریف نہیں کی ہے بلکہ ان کی کمزوریوں کو بھی

بیان کر دیا ہے۔

انور خلیل: حکیم اسرار احمد کا اعتراض برقرار رہتا ہے کیونکہ مقالہ نگار نے حسن نظامی کی کوتاہیاں بیان کرنے میں وہی پیرائیہ بیان اختیار کیا ہے جو خود حسن نظامی نے اپنی کمزوریوں کے بیان میں اپنایا تھا اس طرح مجموعی تاثر تحسین ہی کا رہتا ہے اور پڑھنے یا سننے والا خواجہ صاحب کی مصنوعی شخصیت کے طلسم میں اور زیادہ گرفتار ہو جاتا ہے۔

سید محمد احمد سعید: مقالہ نگار نے ''حیات جاوید'' اور ''شبلی نامے'' کے حوالے سے سوانح نگاری کی کمزوریوں کا ذکر کیا ہے۔ غالباً مضمون نگار کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ان کمزوریوں کی وجہ سے سوانح نگاری اپنا منصب پورا نہیں کرتی اس لئے آپ بیتی یہ کام کر سکتی ہے اور خواجہ حسن نظامی نے کامیاب آپ بیتی لکھی ہے لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی آپ بیتی میں خامیاں دبا کر بیان کی گئی ہیں اس طرح آپ بیتی ضرورت کے اس معیار پر پوری نہیں اترتی جو مضمون نگاری' سوانح نگاری کے ضمن میں موجود ہے۔ گویا اس مقالے میں جو مقدمہ قائم کیا گیا ہے اور جو نتیجہ نکالا گیا ہے ان میں آپس میں کوئی ربط نہیں ہے۔

سرشار صدیقی: مقالہ نگار نے آپ بیتی میں بیان کی گئی خوبیوں کا ذکر نہیں کیا۔

سید محمد تقی: آپ بیتی کی قدر اس معیار پر جانچنی چاہئے کہ اس میں یہ بات واضح طور سے معلوم ہوتی ہے کہ نہیں کہ فرد نے معاشرے کو کس نقطہ پر لیا اور کس مقام پر چھوڑا۔ اس معیار پر بہت کم آپ بیتیاں پوری اترتی ہیں۔

سید محمد احمد سعید: اس معیار پر صرف بڑے اور باشعور افراد کی آپ بیتیاں پرکھی جا سکتی ہیں۔ چھوٹے لوگوں کی آپ بیتی اس معیار پر پوری نہیں اتر سکتی۔

شاہد منصور نے حاضرین کو یاد دلایا کہ وہ آپ بیتی کی وجہ تخلیق کو بھی پیش نظر رکھیں کیونکہ خود خواجہ حسن نظامی نے ایک وجہ یہ بتائی تھی کہ وہ اپنے مریدوں کو اپنی ذات سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔

سید محمد تقی: مضمون نگار کا انداز بیان شگفتہ اور صاف ہے۔ یہ کوشش اس حیثیت سے کامیاب ہے کہ ایک خشک موضوع پر ایسا شگفتہ مضمون لکھا گیا۔

عبید اللہ علیم: صاحب صدر آپ کے اس ایک جملے نے تین گھنٹے کی بحث پر پانی پھیر دیا۔

اس کے بعد آئندہ کا پروگرام سنا کر نشست برخواست کر دی گئی۔

ان حضرات نے شرکت کی: عبید اللہ علیم، جوہر حسین، رؤف شیرازی، محمد ظہیر، راشد علی، شیخ نوید، اکرام حسین، خالد علیگ، نذیر ناجی، شاہد منصور، سید محمد احمد سعید، وسیم فاضل، ساقی جاوید، حکیم اسرار احمد، سلیم قیصر، شاہد انوری، انعام نادر، رحمان کیانی، سرشار صدیقی، سید محمد تقی، خواجہ آشکار حسین، محمد انور خلیل، اور تین نام پڑھے نہ جا سکے کیونکہ وہ نام کی بجائے دستخط تھے۔

توثیقی دستخط

(ذوالفقار علی بخاری) ۳۰ ستمبر ۱۹۶۶ء

مکتبہ اتحاد المصنفین کی مطبوعات

نام کتاب	موضوع	مصنف/مولف	سال اشاعت	قیمت
دبستانِ قابل	سوانح۔ انتخاب کلام (مرتبہ منصور عاقل)	قابل گلاؤٹھوی	۲۰۰۰ء	۵۰۰ روپے
گلاؤٹھی	تاریخ (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں استعمار کے خلاف ساداتِ گلاؤٹھی کا مزاحمتی کردار) شخصیت۔ فکر و فن	منصور عاقل	۱۹۹۸ء	۲۵۰ روپے
حرفِ محرمانہ	شخصیت۔ فکر و فن (حدیث خود نوشت و حدیث دیگراں)	منصور عاقل	۱۹۹۵ء	۲۰۰ روپے
گہوارۂ سخن	شعری مجموعہ	منصور عاقل	۱۹۹۳ء	۲۰۰ روپے
برگِ سبز	مکتبِ داغ کے نورتن سید عبدالوحید فدا گلاؤٹھوی کے فکر و فن پر تنقیدی جائزے	منصور عاقل	۱۹۹۲ء	۲۰۰ روپے

ملنے کا پتہ: مکان نمبر ۶۹۔اے، سٹریٹ نمبر ۲۵، سیکٹر ایف ۱۰/۴، اسلام آباد

پروفیسر صدیق شاہد

خلیفہ صاحب

تقریباً چالیس سال اُدھر کی بات ہے جب میں فیصل آباد (تب لائل پور) سے آ کر گورنمنٹ انٹر میڈیٹ کالج گلبرگ لاہور میں نیا نیا لیکچرار اردو تعینات ہوا تھا۔ باغ بانپورہ لاہور میں میرے سسرالی رشتہ دار رہتے تھے۔ میں نے کالج سے دوری کے باوجود ان کے نواح میں مکان تلاش کرنے کی کوشش کی تا کہ میرے اہل خانہ تنہائی کی گھٹن محسوس نہ کریں۔ اتفاق سے ایک مختصر سا مکان مل گیا۔ اس زمانے میں میری ازدواجی زندگی کی کل کائنات بیگم اور ایک دو سالہ بچی تھی۔ حق نواز روڈ باغبانپورہ پر جو مکان ملا وہ مٹھائی کی ایک دکان کی بالائی منزل پر واقع ایک کمرے، برآمدے اور چند مربع فٹ صحن پر مشتمل تھا مگر ہماری گزر بسر کے لئے کافی تھا۔ کالج سے آ کر میں زیادہ تر وقت اہل خانہ یا اپنے عزیزوں کے ہاں گزارتا۔ راستے میں حکیم محمد ابراہیم صاحب پٹی والوں کا مطب پڑتا تھا۔ ان کے آس پاس سب دکانیں تھیں۔ دکان داروں کا مزاج آپ جانتے ہیں زیادہ تر صرف کاروباری ہوتا ہے۔ نوکری پیشہ لوگوں کے مشاغل اور دلچسپیوں سے انہیں شاذ و نادر ہی واسطہ ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے ان دکانداروں میں سے کسی کے ساتھ راہ و رسم بڑھانے کی قطعاً کوشش نہ کی۔ لے دے کے حکیم صاحب کا مطب تھا جہاں نشست و برخاست کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا کہ چند گھڑیاں گپ شپ میں گزاری جا سکیں مگر یہ کام بھی آسان نہ تھا کیونکہ حکیم صاحب بظاہر مردم بیزار سے لگتے تھے۔ ان کے یہاں مریض تو کجا کوئی اور آدمی بھی دیکھنے کو کم ہی پایا جاتا تھا۔ میں سوچا کرتا کہ یہ کیسے حکیم ہیں کہ دکان پر تو بڑی باقاعدگی سے بیٹھتے ہیں مگر مریض کا نام نہیں۔ دوا کوٹنے پیسنے کی نوبت بھی کم ہی آتی ہے۔ لکڑی کے چند خانے ضرور موجود تھے جن میں برسوں کی پرانی گلی سڑی بوٹیاں اور مرکبات بھرے ہوئے تھے۔ دکان ہی میں اپنے ہاتھ سے سالن تیار کرتے اور بازار سے دو چپاتیاں لے کر آتشِ شکم سرد کر لیتے۔ ویسے عیال دار تھے مگر اہلِ خانہ سے زیادہ مانوس معلوم نہ ہوتے۔ گھر والوں سے ان کی کشیدگی کا علم نہ ہو سکا۔ البتہ اتنا کھلا کہ ایک پرائیویٹ زنانہ سکول کھول رکھا ہے۔ صبح کو وہاں کا چکر لگا آتے اور رات گئے تک دکان پر بیٹھے رہتے۔ ممکن ہے اہلِ خانہ سے کشیدگی میں اس سکول کا بھی کچھ دخل ہو۔

حکیم صاحب کو اس حال میں دیکھتے کئی ہفتے گزر گئے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ میں نے ان کی دکان پر ایک بزرگ کو بیٹھے پایا۔ ناک نقشہ تیکھا، رنگت سفید، سر پر درویشانہ لمبے بال جو کپڑے کی سفید ٹوپی سے باہر نکلے پڑے تھے۔ منہ میں پان، پچہتر برس کے لگ بھگ عمر، نہایت اجلے کپڑے پہنے بیٹھے تھے۔ میں انہیں دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ پھر تو میں نے ہر سہ پہر کو انہیں حکیم صاحب کے ہاں بیٹھے پایا۔ ایک روز اتفاق سے سرِ راہ مل گئے۔ میں نے ادب سے اُنہیں سلام کیا، انہوں نے مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ میں نے شوق سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد کہنے لگے "آپ کیا کام کرتے ہیں؟" میں نے کہا کہ کالج میں پڑھاتا ہوں۔ فرمایا آپ حکیم صاحب کے پاس مٹھائی کی دکان کے اوپر رہتے ہیں، ہمارے پاس سے گزرتے ہیں، کبھی ہمارے پاس بھی بیٹھ جایا کریں۔ یہ الفاظ اس اپنائیت سے کہے کہ میں نے ان کے ہاں جانے کا وعدہ کرلیا اور کہا کہ جب فرصت ہوئی حاضر ہو جایا کروں گا۔ لیکن حکیم صاحب سے تعارف آپ کرائیں گے، وہ کچھ اور طرح کے آدمی ہیں۔ ان کا مزاج خشک ہے کم از کم لوگ ان کے بارے میں یہی رائے رکھتے ہیں۔ ہر وقت لئے دیے رہتے ہیں کوئی ان کے پاس کیوں جائے۔

خلیفہ صاحب جن کا تعلق فیصل آباد سے تھا، فرمانے لگے "اپنا حکیم برا آدمی نہیں آپ آئیں تو سہی" میں تو پہلے ہی کسی پڑھے لکھے آدمی کو ترس رہا تھا۔ اگلے روز چھٹی تھی۔ صبح ہی حکیم صاحب کی دکان پر چلا گیا۔ وہ بزرگ (خلیفہ صاحب) وہاں پہلے ہی تشریف فرما تھے۔ مجھے دیکھتے ہی فرمانے لگے "آیئے تشریف لایئے"۔ میں بچ بچا کر حکیم صاحب کی قبر نما تنگ دکان میں بیٹھنے کے لئے کوئی فٹ بھر جگہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ میں اس زمانے میں کوئی تیس ایک سال کی عمر کا تھا اور حکیم صاحب پچاس برس کی سرحد عبور کر چکے تھے لہٰذا انہوں نے بھی میرے ساتھ بزرگانہ سلوک کیا۔ چائے سے میری تواضع کی اور باتوں باتوں میں ہمارا آپس میں تعارف مکمل ہو گیا۔ اب پتا چلا کہ ان بزرگ کا نام تو عبدالغفور ہے مگر خلیفہ صاحب کے لقب سے مشہور ہیں۔ وطنِ مالوف لدھیانہ (بھارت) تھا اور قیامِ پاکستان کے وقت لائل پور (حال فیصل آباد) آکر آباد ہو گئے تھے۔ وہاں ان کے بڑے صاحبزادے عبدالحمید پوسٹ آفس میں انسپکٹر تھے۔

خلیفہ صاحب قیام پاکستان سے کچھ پہلے اکھاڑے میں اترتے رہے۔ خود کہتے تھے کہ جوانی میں کشتی گیری کا شوق تھا۔ عمر ڈھلنے لگی تو کشتی گیری چھوڑ دی اور پیٹ کا دھندا چلانے کے لئے سوت کا کاروبار شروع کر دیا۔ اولاد جوان ہوئی تو سب کام چھوڑ کر آزاد ہو گئے۔ وہ بہت حد تک ان پڑھ تھے مگر صحبت یافتہ

ہونے کے سبب بعض پڑھے لکھے لوگوں کی طرح پڑھے لکھے اور ذہین و فطین لگتے تھے۔ حیرت تو یہ ہے کہ شعر فہمی کا ملکہ بہت اچھا تھا۔ شاعر بھی غالب منتخب کر رکھا تھا۔ یوں بعض اور شعراء کے شعر بھی انہیں یاد تھے۔ عمدہ شعر پر داد دیتے تھے۔ شعر سناتے وقت کہیں کہیں کسی لفظ کی تقدیم و تاخیر ہو جاتی تھی لیکن یہ چنداں قابل گرفت بات نہ تھی اس سے زیادہ کی ان سے توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ بنیادی طور پر ان پڑھ ہی تو تھے۔ شعر فہمی کا حکیم صاحب کو بھی چسکا تھا۔ دونوں آپس میں شعروں کا تبادلہ کرتے رہتے تھے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ حکیم صاحب ان کے پورے مدمقابل تھے کیوں کہ ان کے شعروں کی چول بھی اکثر ڈھیلی ہوتی تھی۔ جب مجھے ان کے ہاں اٹھتے بیٹھتے کچھ دن گزر گئے تو میں نے بھی دخل دینا شروع کر دیا۔ لیکن جب اپنے شعر سناتا تو خلیفہ صاحب ذرا بچ کر داد دیتے وہ بھی شاید میرا دل رکھنے کے لئے۔ میں اس صورتِ حال پر بہت جز بز ہوتا۔ اب سوچتا ہوں کہ وہ ٹھیک ہی تھے کیوں کہ میں اس زمانے میں ابھی منزلِ شاعری کی طرف قدم بڑھا رہا تھا اور وہ مختلف صحبتوں اور مشاعروں کی راہ سے ہوتے ہوئے شاعری کی اچھی خاصی شُد بُد کو چھونے لگے تھے۔ ان کے حافظے میں بڑے عمدہ اشعار محفوظ تھے۔ ایک روز میں نے پوچھا کہ خلیفہ صاحب آپ نے یہ کام کہاں سے سیکھا؟ پوچھا کون سا؟ میں نے کہا یہی شعر فہمی والا، کہنے لگے لدھیانہ میں اُردو مشاعروں میں جا بیٹھتا تھا۔ فیصل آباد میں ہر جمعہ کے روز تیسرے پہر لکڑ منڈی میں پنجابی مشاعرہ ہوتا ہے۔ میں جب فیصل آباد ہوتا ہوں نماز جمعہ سے فارغ ہو کر وہاں چلا جاتا ہوں۔ یہ عمل کئی سال سے جاری ہے۔ اُردو کی شُد بُد حزیںؔ لدھیانوی کے پاس اٹھنے بیٹھنے سے ہوئی ہے۔ یہ جملہ حزیںؔ لدھیانوی کی عزت افزائی کے لئے کہا ورنہ وہ خود خلیفہ صاحب کا دم بھرتے تھے۔ یہ جدا بات ہے۔ کہ حزیںؔ مرحوم اپنے زمانے کے ممتاز نوجوان شاعر تھے اور ان کا کلام اُردو کے منفرد پرچے فنون میں چھپتا تھا۔

خلیفہ صاحب سیلانی آدمی تھے۔ مُدت ہوئی ان کی بیگم کا انتقال ہو چکا تھا۔ اولاد جوان اور شادی شدہ تھی۔ یہ اب ہر طرح سے فارغ البال تھے۔ بڑے صاحبزادے عبدالحمید کے پاس بس نام کا قیام ہوتا تھا ورنہ کوئٹہ، وزیر آباد، ملتان، لاہور سب ان کی جولانیوں کے میدان تھے۔ نہ جانے کن کن کے پاس جا ٹھہرتے تھے۔ شخصیت کی دلآویزی نے نیاز مندوں کی فوج پیدا کر رکھی تھی۔ جہاں جاتے ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے۔ یہ عجیب بات ہے کہ کسی جگہ سے رخصت ہوتے تو چپکے سے نکل آتے۔ تقاضوں کے خطوں سے ان کی جیب بھری رہتی تھی۔ جہاں ٹھہرتے دنوں نہیں، ہفتوں اور مہینوں کے قیام پر مجبور کئے جاتے۔ میزبان کو اس وقت خبر ہوتی

جب وہ کسی اور شہر میں طلوع ہو چکے ہوتے۔ میں نے ایک روز پوچھا کہ خلیفہ صاحب، یہ کیا عادت ہے فرمانے لگے: رخصت کی اجازت مانگوں تو ملتی نہیں، صاحب خانہ کا دل الگ بُرا ہوتا ہے۔ میں درویش آدمی ہوں، درویش کا کوئی گھر نہیں ہوتا، کسی جگہ دل کیوں لگاؤں؟

حلقۂ تعارف وسیع تھا' خود کماتے بھی نہیں تھے مگر پھر بھی چھوٹوں پر تھوڑے بہت پیسہ سے شفقت فرماتے رہتے تھے۔ کوئی تہوار ہوتا تو ہاتھ کھول دیتے، کسی کو دو روپے، کسی کو چار روپے غرض درجہ بدرجہ کچھ نہ کچھ دینے کی کوشش کرتے۔ خود میری بیگم کو بہو کی طرح پیار کرتے۔ گھر میں تشریف لاتے تو اس کی مانگ چومتے خیر خریت پوچھتے اور یہ جادہ جا۔

لاہور سے میرا تبادلہ شیخوپورہ ہوا تو ملاقاتیں کم ہو گئیں کیونکہ حکیم صاحب کے مطب والی صحبتیں میں لاہور ہی چھوڑ آیا تھا۔ خلیفہ صاحب عمر رسیدہ تو تھے ہی میں نے سنا بیمار رہنے لگے ہیں۔ میرے تقاضے سے ایک مرتبہ عید کے قریب قدم رنجہ فرمایا۔ حکیم صاحب ہمراہ تھے۔ انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر باورچی خانے میں تشریف لائے۔ بیگم اس وقت ناشتہ کی تیاری میں مصروف تھیں۔ انہیں بیس روپے (یہ ۱۹۸۰ء کی بات ہے جب بیس روپے قدر میں اتنے کم بھی نہ تھے) دینا چاہے۔ انہوں نے کہا خلیفہ صاحب! آپ کیا کرتے ہیں، آج کل تو آپ کماتے بھی نہیں۔ ان پیسوں کو اپنی جیب میں رکھئے۔ کہنے لگے میرا اللہ مجھے دیتا رہتا ہے اگر تم یہ پان سات روپے نہ لوگی تو اپنا ہی نقصان کروگی۔ اس نے گھبرا کر پیسے اٹھا لئے۔ بعد ازاں کہنے لگے، یہ چوڑیوں کے لئے ہیں، کیا عید پر پہنو گی نہیں؟

بچوں سے بہت پیار تھا۔ ایک مرتبہ میرے یہاں آئے۔ چھوٹا لڑکا منیب سو رہا تھا۔ سوتے میں اس کا منہ چوما اور میرے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد کھانے کا وقت ہو گیا۔ منیب اب جاگ چکا تھا۔ کھانے پر بیٹھے تو منیب کو بھی ساتھ بٹھا لیا۔ اس کی عمر کوئی دو اڑھائی برس کی ہوگی۔ میں نے کہا یہ آپ کے کپڑے گندے کرے گا اور کھانا بھی نہیں کھانے دے گا۔ کہنے لگے تم اپنے کپڑے سنبھال کر رکھو۔ غرض بچے کو گود میں بٹھا کر کھانا کھایا، ساتھ ہی اس کے منہ میں چھوٹے چھوٹے لقمے دیتے رہے۔ جب بچے نے دو چار لقموں کے بعد ایک لقمہ اگل دیا تو خلیفہ صاحب نے اسے اُٹھا کر اپنے منہ میں ڈال لیا۔ میں نے ناپسندیدگی کی آنکھ سے دیکھا تو پہچان کر کہنے لگے تم ان باتوں کو کیا جانو تم تو پروفیسر صاحب ہو۔ میں اس طنز کی تاب نہ لا سکا تاہم خاموش رہا۔ کئی مرتبہ میں نے اپنی بے شعوری کے ہاتھوں مجبور ہو کر خلیفہ صاحب اور حکیم صاحب کی باتوں میں

خواہ مخواہ دخل دینے کی کوشش کی تو پذیرائی نہ ہوئی۔ ایک موقعہ پر تو میں نے تنگ آ کر کہہ بھی دیا کہ میں اب کوئی بچہ نہیں ہوں، میری بات بھی سنیں اور سمجھیں، شاید کام کی ہو۔ خلیفہ صاحب کہنے لگے "ہاں ہاں، آپ تو دادا جان ہیں آپ کی بات کیوں نہ سنیں گے"۔ میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ بات کم کرتے تھے مگر وہ باون تولے پاؤ رتی کی ہوتی تھی۔ رائے قطعی اور دو حرفی ہوتی جس کو بعض اوقات میرے لئے سمجھنا دشوار ہوتا۔

سیر و سیاحت کا شوق بہت پرانا تھا۔ آخر عمر میں اہلِ باطن اصحاب اور باکمال بزرگوں کے مزاروں پر بہت جایا کرتے تھے۔ مجھے خود حضرت بلھے شاہؒ اور وارث شاہؒ کے مزاروں پر ان کی معیت میں جانے کا اتفاق ہوا۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا ذکر بہت عقیدت سے کرتے تھے۔ کہا کرتے کہ برصغیر ہندو پاک نے ان جیسا خطیب پیدا نہیں کیا۔ ان کے ساتھ اپنی صحبتوں کا ذکر مزے لے لے کر کیا کرتے تھے۔

خوش خوراک تھے مگر کم کھاتے تھے۔ حکیم صاحب کئی مرتبہ ان کی موجودگی میں دوپہر کا کھانا تناول کرتے وہ بار بار صلاح کرتے تھے مگر خلیفہ صاحب نے کھانے میں کبھی ہاتھ نہ ڈالا۔ ہاتھ کیسے ڈالتے حکیم صاحب نے اس قابل ہی نہ چھوڑا تھا۔ موصوف نمک مرچ بہت تیز کھاتے تھے۔ کوئی کھائے تو آنکھوں سے پانی بہنے لگے۔ خلیفہ صاحب کہیں اوائل تعارف ہی میں ایک آدھ لقمہ لے کر ہمیشہ کے لئے تائب ہو چکے تھے۔ دراصل حکیم صاحب کے مزاج کی کئی گرہیں دیر بعد کھلیں اور میں نے سوچا کہ لوگ سچ ہی کہا کرتے تھے کہ وہ اپنی پسند اور ناپسند میں اہلِ بازار سے بالکل مختلف ہیں۔ معاصرانہ چشمک کے باعث لاہور کے ایک اچھے بھلے معروف شفاء الملک طبیب کو قضاء الملک کہا کرتے تھے۔ اور تو اور میں ایک اہلِ سنت والجماعت مسلک کی مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے جاتا تو اس پر مجھے چھیڑتے کہ پروفیسر صاحب جمعہ خراب کر آئے ہو۔ اگر میں ان کی مسجد میں جاتا تو شاید میرا جمعہ خراب نہ ہوتا۔ وہ مسلکاً اہلِ حدیث تھے۔

خلیفہ صاحب سفید براق لباس پر فدا تھے۔ ان کا اپنا رنگ بھی خوب نکھرا ہوا تھا اور لباس میں چہرے کی رنگت بھی کھلتی تھی۔ تہ بند اور قصوری جوتی کا شوق تھا۔ عمر بھر شلوار نہیں پہنی صرف تہ بند کو سنبھال سکتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنے چھوٹے صاحبزادے کے سسرالی رشتہ داروں کے ہاں کوئٹہ گئے۔ شادی کا ہنگام تھا۔ بیٹے نے ضد کر کے شلوار پہنا دی کہ لوگ دھوتی میں دیکھ کر کیا کہیں گے۔ اس تقاضے سے شلوار پہن تو لی مگر یہ اسے ہاتھ میں تھام تھام کر چلتے ہیں کہ کہیں گر نہ جائے۔ غالباً دھوتی کا پیچ زیادہ مضبوط سمجھتے تھے۔ اسی دوران میں انہیں پیشاب لگا۔ طہارت خانے میں گئے۔ اتفاق سے ازار بند کھسک گیا۔ بیٹے کو گالیاں دینے لگے کہ کم بخت نے

کس الجھن میں ڈال دیا۔ اس نے سنا تو دھوتی لے آیا اور انہیں شلوار سے نجات دلائی۔ اس واقعہ کا ذکر بڑی معصومیت سے کیا کرتے تھے۔

شب زندہ دار تھے۔ نماز تہجد کے بعد کلام پاک کی تلاوت معمول بنا رکھا تھا' اس میں ناغہ نہ ہوتا۔ سفر ہو یا حضر لبوں پر وظیفہ جاری رہتا تھا۔ معلوم نہیں کیا پڑھتے تھے۔ باتیں کرتے وقت ذرا وقفہ ملتا تو پھر ہونٹ ہلنے لگتے تھے۔ تمام ریاضت و اتقاء کے باوجود کسی خاص مسلک سے منسلک معلوم نہ ہوتے تھے۔ مجھے کبیر پنتھی لگتے تھے کیونکہ میں نے انہیں ہر مذہب و ملت کے لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے دیکھا۔ رند نہ تھے مگر اوضاع و اطوار رندانہ معلوم ہوتے تھے۔ طبیعت میں آزاد خیالی کی لہر بہت تیز تھی۔ شاید تنہائی میں توبہ تلا کر لیتے ہوں۔

آخری سالوں میں ان سے ملاقاتیں بہت کم رہ گئیں۔ میں شیخوپورہ چلا آیا اور وہ زیادہ تر بیمار رہنے لگے۔ کمزوری بڑھی تو اپنے صاحبزادوں کے ہاں رہنے لگے۔ گھومنا پھرنا ترک کر دیا۔ مجھے مہینوں خبر نہ لگتی کہ آپ کس صاحبزادے کے ہاں فروکش ہیں۔

فروری ۱۹۸۱ء کی آخری تاریخوں میں لاہور سے حکیم صاحب نے اچانک اطلاع دی کہ خلیفہ صاحب کا راولپنڈی میں انتقال ہو گیا۔ میت لاہور لائی گئی اور انہیں درس میاں وڈھا (باغبانپورہ) کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ اطلاع ملتے ہی میں بھاگم بھاگ لاہور پہنچا۔ حکیم صاحب کو ساتھ لیا اور مرحوم کے منجھلے صاحبزادے میاں عبدالرحمٰن کے ہاں چلا گیا۔ دعائے مغفرت کے بعد ہم خلیفہ صاحب مرحوم کی قبر پر گئے۔ وہ متاعِ عزیز چار روز پیشتر آسودۂ خاک ہو چکی تھی۔ قبر پر چند کملائے ہوئے پھول پڑے تھے۔ زبان پر بے اختیار یہ شعر جاری ہو گیا۔

موت سے کس کو رُستگاری ہے آج وہ کل ہماری باری ہے

میں نے قبر پر فاتحہ پڑھی اور بجھے ہوئے دل اور بھاری قدموں کے ساتھ واپس چل دیا۔ راستے میں بھائی عبدالرحمٰن خلیفہ صاحب کے آخری سانسوں کا احوال کہتے رہے۔ انہوں نے بتایا کہ ایک مرتبہ خلیفہ صاحب نے تاکید کی تھی ''اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو ہر فجر کی نماز کے بعد ایک مرتبہ سورۃ الحمد اور تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر اس کا ثواب بہ طفیل محمد مصطفیٰ ﷺ مجھے بھیج دیا کرنا، مجھے پہنچ جایا کرے گا''۔ اللہ اللہ! بیٹے کو نماز کی تاکید کس انداز سے کر گئے۔

اب کہاں ایسے لوگ آئیں گے لاکھوں ڈھونڈیں کہیں نہ پائیں گے

شمیم صبائی متھراوی

جگر مُرادآبادی ایک نظر میں

نام:۔ شیخ محمد علی سکندر

تخلص:۔ جگر

ولدیت:۔ جگر کے والد مولوی علی نظر بھی شاعر تھے۔ انہیں خواجہ وزیر لکھنوی دل سے شرف تلمذ حاصل تھا۔

تاریخ و مقام پیدائش:۔ روش صدیقی کے مطابق جگر ۱۸۹۰ء میں مرادآباد میں پیدا ہوئے مگر ڈاکٹر خورشید خاور کے خیال میں جگر کی پیدائش بنارس (یوپی) میں ہوئی۔

خاندان: جگر کا تعلق ایک مولوی خاندان سے تھا۔ ان کا سلسلۂ نسب ۳۵ واسطوں کے بعد امیر المومنین حضرت شیخ ابوبکر صدیقؓ سے جا ملتا ہے۔

تعلیم:۔ جگر کی مکتبی تعلیم انٹر سے آگے نہ بڑھ سکی مگر ۲۳ دسمبر ۱۹۵۹ کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ان کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

تلمذ: جگر نے مرزا داغ دہلوی حیات بخش رسا رامپوری اور امیر اللہ تسلیم لکھنوی کو وقتاً فوقتاً کلام دکھایا

ازدواجی زندگی:۔ جگر کی ازدواجی زندگی کے بارے میں لوگوں نے کیا کچھ نہیں کہا مگر جگر نے اپنی اور اصغر گونڈوی کی شادی کا واقعہ قمر مرادآبادی سے خود بیان کیا، وہ قمر صاحب کے الفاظ میں کچھ یوں ہے۔

> ''مین پوری کی رہنے والی دو بہنیں تھیں۔ بڑی بہن سے اصغر صاحب نے نکاح کیا اور چھوٹی بہن سے جگر صاحب نے اصغر صاحب نے اس رشتہ کو استوار رکھا لیکن جگر تھوڑے دنوں میں اپنی لاابالی طبیعت کی بناء پر بے نیاز ہو گئے۔ ایک عرصہ دراز تک بیوی کی کوئی خیر خبر نہیں لی۔ آخر اصغر صاحب

نے ان پر زور دیا کہ وہ اسے آزاد کردیں۔ چنانچہ جگر نے اسے طلاق دے دی۔ چند ہی دنوں کے بعد نسیم کے اندر ایسے امراض پیدا ہو گئے کہ اگر اس کی شادی نہ کی جاتی تو اس کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ۔ چنانچہ اصغر صاحب نے یہ ایثار کیا کہ بڑی بہن کو طلاق دیکر چھوٹی بہن (مطلقہ جگر) سے نکاح کرلیا اور بڑی بہن کو سالی کی حیثیت سے اپنے پاس رکھ لیا"

"اب وہ وقت آیا کہ اصغر صاحب کا انتقال ہو گیا اور جگر کے دل میں اپنی پرانی بیوی کی محبت نے کروٹیں لینا شروع کر دیں ۔ چنانچہ جگر نے اپنی مطلقہ بیوی سے دوبارہ نکاح کرنے کی خواہش ظاہر کی ۔ وہ آمادہ ہو گئی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جگر صاحب شراب چھوڑ دیں جگر نے شراب چھوڑ دینے کا وعدہ کرلیا اور اپنی بیوی سے ہم کنار ہو گئے"

مگر اس مشہور واقعہ کے برعکس حضرت اطہر ضیائی نے جگر کی ترک مے نوشی کا سبب مستند حوالہ سے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی مجلس علم و معرفت کو ٹھہرایا ہے اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع کو اس امر کا گواہ بنایا ہے۔

تجارتی ایجنٹ:۔ حضرت اصغر گونڈوی کا چشموں کا کاروبار تھا۔ جگر ۲۰ سال کی عمر میں یعنی ۱۹۱۰ء کے قریب اصغر گونڈوی کے تجارتی ایجنٹ بنے اور سوٹ کیس میں چشمے بھر کر شہر شہر گھومنے نکل کھڑے ہوئے ۔ جگر کا بھی ذریعہ معاش جگہ جگہ گھومنے، مشاعرہ پڑھنے اور داد لوٹنے کا سبب بن گیا۔

حج:۔ شراب سے تائب ہونے کے بعد جگر نے ۱۹۴۵ میں حج بیت اللہ شریف کا شرف بھی حاصل کیا۔

رئیس المتغزلین:۔ جگر کے ایک دوست خیال مراد آبادی نے سب سے پہلے ان کو رئیس المتغزلین لکھا اور اس خطاب کے ساتھ پہلی مرتبہ ان کی غزل جون ۱۹۲۶ء میں قوس قزح لاہور میں شائع ہوئی ۔

سریلے شاعر:۔ شاہد احمد دہلوی مرحوم نے ایک بار مجھے بتایا کہ جگر سریلے شاعر تھے ۔ جگر صاحب کا

پڑھنا ترنم تھا۔ گانا نہیں۔

تہذیب وشائستگی:۔ جگر مشاعرے میں آتے تو تہذیب وشائستگی کا نمونہ بن کر بیٹھتے۔ اچھے شعر کی داد جی کھول کر دیتے اپنے ہم عصروں کا کلام توجہ سے سنتے، نو مشقوں اور نوجوانوں میں جہاں جوہر نظر میں آجاتا۔ اس کا دل بڑھاتے۔ اس سلسلہ میں اپنا ایک واقعہ سناتا ہوں۔

کراچی میں جنوری ۱۹۵۶ء میں بزم سیماب نے علامہ سیماب اکبر آبادی کی پانچویں برسی پر ایک طرحی مشاعرہ کا اعلان کیا۔ بزم سیماب کے معتمد اور علامہ سیماب کے سب سے بڑے صاحب زادے منظر صدیقی صاحب نے مجھ سے کہا کہ جگر صاحب آرہے ہیں۔ غزل کہہ لو۔ میں اس وقت اپنی زندگی کے غم ناک ترین حالات سے گزر رہا تھا، اور غزل کہنے کا قطعاً موڈ نہ تھا۔ میرے بھائی اور استاد گرامی مولانا صبا متھراوی نے فرمایا کہ غم غلط کرنے کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ غزل کہی جائے چنانچہ بزرگوں کے حکم کی تعمیل میں مجھے پانچ شعر کی ایک غزل کہنی پڑی۔ اس مشاعرہ کیلئے فانی بدایونی کا مصرع ''اک تو ہی ناخدا نہیں ظالم۔ خدا بھی ہے'' تجویز کیا گیا تھا۔ یہ مشاعرہ کراچی میں بندر روڈ پر واقع لائٹ ہاؤس سینما کے سامنے والی گلی میں حکیم ''نین الشفاء'' کے مطلب میں بالائی منزل پر منعقد ہوا۔ جگر صاحب صدارت کے لئے تشریف لائے۔ کراچی میں مقیم تمام بڑے بڑے شعراء اس میں شریک ہوئے۔ حکومت پاکستان کے دفاتر ہفتہ واری تعطیل کے لئے اتوار کو بند ہوتے تھے۔ چنانچہ اس مشاعرہ کا آغاز اتوار ۲۹ جنوری ۱۹۵۶ء کو دو بجے دن اس خاکسار کی غزل سے ہوا۔ جب میں نے غزل کا دوسرا شعر پڑھا تو جگر صاحب نے نہ صرف داد دی بلکہ میری پیٹھ بھی تھپتھپائی جس کا لمس ۵۰ سال گزر جانے کے بعد میں آج بھی محسوس کرتا ہوں۔ وہ شعر جس پر جگر صاحب نے بیساختہ داد دی یہ تھا۔

ٹوٹے ہوئے دلوں میں جنم لے گی کیا خوشی
اب تک کسی کھنڈر میں چراغاں ہوا بھی ہے

مراسلات

خالد یوسف۔ آکسفورڈ (انگلینڈ)

اکتوبر۔ دسمبر کا 'الاقرباء' نظر نواز ہوا۔ حسبِ معمول عمدہ اور معیاری نگارشات سے معمور ہے۔ اداریہ 'غزالاں تم تو واقف ہو۔۔۔' میں احمد ندیم قاسمی مرحوم کے فن اور شخصیت کو شایانِ شان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ محمد شفیع عارف دہلوی نے غالب کی شاعرانہ عظمت و آفاقیت، لکھ کر اس عظیم فنکار کے فن اور شخصیت پر بے حد فکر افروز روشنی ڈالی ہے۔ سید انتخاب علی کمال نے اپنے مضمون میں فنِ تاریخ گوئی جیسی زوال پذیر صنفِ سخن پر بشکل فہرست کتب وافر معلومات فراہم کی ہیں۔ ڈاکٹر شاہد اقبال کامران کا مضمون ''پاکستان میں اقبال پر مطالعہ و تحقیق کے مسائل و عوامل''، اقبال پر تحقیق کے نئے در یچے کھول رہا ہے۔ ڈاکٹر طاہر مسعود کا مضمون ''کیا کہانی کا فن رو بہ زوال ہے؟'' افسانہ نگاری میں علامتی اور تجریدی رویوں کو بے مقصد اور گمراہ کن قرار دیتے ہوئے کہانی پن کا مثبت انداز میں دفاع کر رہا ہے۔ نوید ظفر کا مضمون، نندنا، تاریخی اہمیت کا حامل ہے اور البیرونی کی ہیئت میں مہارت پر عمدہ روشنی ڈالتا ہے۔ ترنم صدیقی نے اپنے مضمون، ملیشیا کی حیرت انگیز ترقی کی مختصر داستان، میں حکومتِ پاکستان کو یہ بڑی کارآمد تجویز پیش کی ہے کہ اعلیٰ ملازمتوں کے سرکاری افسران کو برطانیہ تربیت کے لیے بھیجنے کے بجائے ملائیشیا بھیجا جائے۔ ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی کا انشائیہ 'عوام' دلچسپ اور خیال افروز ہے۔

سید صفدر حسین جعفری کی نظم 'کشمیر' دلآویز ہے اور حب الوطنی کے پرخلوص جذبات سے لبریز۔

ڈاکٹر خیال امروہوی کے قطعات بصیرت افروز ہیں اور صابر عظیم آبادی کی رباعیات بھی عمدہ ہیں۔

غزلوں میں حصیر نوری کی پوری غزل بیحد مرصع ہے اور یہ شعر بالخصوص۔

جن سے ہو جاتی تھی چہروں کی صداقت روشن وہ دیئے انجمن کذب میں جلتے کیسے

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل اشعار بھی خوبصورت ہیں۔

قدم قدم پہ کھلانے ہیں سرخ پھول اگر تو خارزار جنوں طے بھی پا پیادہ کریں
(منشا ہاشمی)

وفا کی راہ میں کٹنے کی ہو جن میں تڑپ اختر   ہزاروں میں فقط دو چار سر ایسے نکلتے ہیں

(سہیل اختر)

قہقہوں میں جو اکثر خود کو بھول جاتے ہیں   پھر وہ مسکرانے کو عمر بھر ترستے ہیں

(نوید سروش)

محمد اویس جعفری کی غزل کے چھٹے شعر میں لفظ 'شہر' کو بوزن 'قہر' باندھا گیا ہے حالانکہ صحیح تلفظ بوزن 'بحر' ہے۔☆

ڈاکٹر انور سدید کی غزل کے مطلع میں لفظ 'بطن' کو بوزن 'وطن' باندھا گیا ہے حالانکہ درست تلفظ بوزن 'وزن' ہے۔☆☆ اقبال کا شعر ہے۔

آفتاب تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا   آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

بشیر حسین ناظم۔ اسلام آباد

الاقرباء۔ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶ء زینت انامل وزین نظر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ الاقربا اپنے شاعروں، ادیبوں، مقالہ نگاروں، انشائیہ پردازوں، حمادو نا عت حضرات کی علمی وادبی کاوشوں سے علوم و معارف حدیثہ وجدیدہ کے شوائق کے نزدیک تر ہوتا جارہا ہے اور یہ جملہ ترقیاں آپ کے زیرادارت ہو رہی ہیں۔ ڈاکٹر شاہد اقبال کامران کا مضمون تحقیق کی شعشعانی تصویر ہے۔ آپ کے اداریے نہ صرف خود جاندار و دلکشا ہیں بلکہ قاری کی جان میں جان انداز ہیں۔ ڈاکٹر معز الدین صاحب کا شادانی مرحوم کی

☆ یہ سہو محمد اویس جعفری صاحب کا نہیں بلکہ اس کا ذمہ دار ادارہ ہے کہ نہ جانے پروف ریڈنگ کی کس ساعتِ سفاک میں لفظی ترتیب وتشکیل تبدیل ہو گئی۔ اصل شعر اس طرح ہے:

اک ساعتِ گم گشتہ میں گم گشتگیٔ دل   گلیوں میں کسی شہر کے دیوانہ ہو جیسے

ہم اپنے قارئین اور بالخصوص جعفری صاحب سے معذرت خواہ ہیں۔ (ادارہ)

☆☆ یہاں بھی اس حد تک ہم ذمہ واری قبول کرتے ہیں کہ مدیریت ونظارت کے دوران محترم شاعر کی توجہ اس سہو کی جانب مبذول کرانا چاہیے تھی جیسا کہ ہم ممکن حد تک کرتے ہیں یا از روئے "استحقاقِ مُدیر" لفظی ردوبدل سے تصحیح کر لیتے ہیں حالانکہ "بطنِ سپہ" کو بحر یا وزن میں رکھتے ہوئے "سپہ کے بطن" نظم کیا جا سکتا تھا (ادارہ)

تحقیق پر دلکشا مضمون ہے۔ سید انتخاب علی کمال صاحب نے نہایت ہی پڑوہش وسعی بلیغہ سے فن تاریخ گوئی پر کثیر معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ وہ تحسین وتوصیف کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی کا انشائیہ بعنوان ''عوام'' اس قدر جدیر ستائش ہے کہ جی چاہتا ہے اس کی امکان بھر توصیف کرتا چلا جاؤں۔ ماشاء اللہ کیا حقائق باہرہ ہیں لیکن لفظ مخنی ہے منہی نہیں۔

ڈاکٹر انور سدید صاحب کا حضرت علامہ قابل گلاؤٹھوی پر مضمون نہایت ہی عمدہ اور قابلِ تعریف ہے۔ کتاب (کتابت) کی غلطیاں اگر چہ پاکستان میں چھپنے والے جرائد ورسائل سے کم ہیں لیکن اس کمی میں بھی کمی ہونی چاہئے خاص کر قرآنی الفاظ کو صحیح لکھنا نہایت ضروری ہے۔ محمود رحیم صاحب نے لاتقنطو بغیر ''ا'' کے لکھ کر بھیج دیا جو اسی طرح چھپ گیا۔ یہ لاتقنطوا ہے۔ محترم عبدالعزیز خالد کی نعت میں قرآن کریم کی آیت غلط لکھی گئی ہے جس سے مصرع میں جھول پڑ گیا ہے روح القدس کو بھی روح القدوس لکھا گیا ہے۔ مسلمہ کو مسلمہ لکھا گیا ہے۔ جمیل یوسف کی نعت ''صلی اللہ علیہ وسلم'' خطابیہ ہے اس لیے صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے صلی اللہ علیک وسلم چاہئے تھا۔ ثمر بانو ہاشمی صاحبہ نے حضرت سیدہ زہرا ''سلام اللہ علیہ'' لکھا ہے جو سلام اللہ علیہا چاہئے تھا۔ حسنین نہیں ہے حسنین یعنی HASANAIN ہے اس کی جگہ سبطین لکھ دیا جاتا تو وزن قائم رہتا احتیاط لازم ہے۔ محترم کرامت بخاری کی غزلیں بڑی نوکدار ہیں۔ زہیر کنجاہی صاحب کو لال کرتی کا مطلب معلوم نہیں۔ اس ضمن میں ماہر لسانیات ڈاکٹر ایس ڈبلیو فیلن نے اپنی معروف اردو انگریزی ڈکشنری میں لال کرتی کی وضاحت یوں کی ہے کہ لال کرتی سرخ کوٹ کو کہتے ہیں لیکن اصطلاحی لحاظ سے اس کا معنی یہ ہے "The European infantry lines in an Indian Contonment" خواجہ حافظ شیرازی اور غالب کی غزل پر فارسی نعت ارسال خدمت ہے۔☆

☆☆ محترم ناظم ایک فصیح وبلیغ ناثر بھی ہیں ہمیں افسوس ہے کہ ''پروف ریڈنگ'' میں معاونت کے لیے ان کی مخلصانہ پیش کش سے بوجوہ استفادہ نہ کر سکے ہو سکتا ہے ہماری یہ کوتاہی ان کے لیے بھی باعثِ رحمت ہو کہ ''سمجھ کے رکھیو قدم دشتِ خار میں مجنوں'' کی تنبیہ کے باوجود اگر وہ بھی ہماری طرح 'لہولہان' ہو جاتے تو ہمیں بہت دکھ ہوتا۔ (ادارہ)

پروفیسر حسن عسکری کاظمی۔ لاہور

الاقرباء کی صوری اور معنوی خوبصورتی اور مختلف النوع نگارشات پر نظر نہیں ٹھہرتی، آپ کا ذوق انتخاب اور قلمی معاونین کی کہکشاں ہر صفحہ قرطاس کے حسن و جمال میں اضافے کا باعث اور قاری کیلئے جہانِ معانی کا نظارۂ دل کشا بنے ہوئے ہیں۔ الاقرباء میں تحقیقی مضامین کا معیار کسی اور مجلّے میں کم ہی دکھائی دیتا ہے' اسی طرح نثر میں تنقید اور تبصرہ پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم مالا مال ہو رہے ہیں۔ اختلاف رائے کا اپنا مزہ ہے اور خطوط پر مشتمل اوراق کی اپنی جاذبیت ہے۔

منظومات کے حوالے سے بھی ایک بات کہی جاسکتی ہے کہ آپ نے معیار کو پیش نظر رکھا ہے، غزل اور نظم میں موضوعات اور مسائل کو جس سلیقے سے ہمارے عہد کے شعراء نگاہ میں رکھے ہوئے ہیں اور جس طرح فنی تقاضوں کے علاوہ شعور کی سطح بلند رکھنے میں محتاط نظر آتے ہیں اسے دیکھتے ہوئے ہم اس تخلیقی سفر کو بامقصد قرار دے سکتے ہیں، اپنے اندر کے موسموں کو متعارف کرانے کی خواہش کا پیدا ہونا فطرت شناس دل کا تقاضا ہے۔

پروفیسر صدیق شاہد۔ شیخوپورہ

الاقرباء اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۶ء موصول ہوا۔ ارسالگی کا شکریہ، پڑھ رہا ہوں اور لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ میں دیانتداری سے کہتا ہوں کہ ملک میں ایسے باوقار رسائل بہ اعتبار مواد اور گیٹ اپ کم ہی ہیں۔ اس پرچے کو پڑھ کر خیال وفکر کے کئی گوشے روشن ہوتے ہیں۔ اللہ اس کی عمر دراز کرے۔ اہلِ ذوق کو آپ کی اس پیشکش کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

پروفیسر ڈاکٹر کیف شاہجہاں پوری۔ لاہور

آپ کا موقر جریدہ سہ ماہی ''الاقرباء'' اکتوبر، دسمبر ۲۰۰۶ء دیکھا، پڑھا، اس بار سرورق کو غالبؔ، حالیؔ اور شادانیؔ کی تصاویر سے سجا کر اسے بھی خالص ادبی بنا دیا۔ اداریہ ''غزالاں تم تو واقف ہو۔۔'' ہمیشہ کی طرح سادہ و رواں ہے۔ مقالات میں پہلا مقالہ ''غالب کی شاعرانہ عظمت و آفاقیت''

محترم جناب محمد شفیع عارف ''ڈاکٹر جناب عندلیب شادانی بہ حیثیت محقق'' چند خامیوں کے باوجود لاجواب کہا جاسکتا ہے۔ چوتھا مقالہ ''فنِ تاریخ گوئی پر یک صد مطبوعات و مخطوطات کا اشاریہ'' ہوسکتا ہے بعض قارئین کے لئے خشک ہو مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس مقالے کی تیاری کیلئے مقالہ نگار محترم جناب سید انتخاب علی کمال نے جو محنت شاقہ کی ہے اس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ موصوف کی محنت اور وقتوں کا اندازہ کوئی محقق ہی لگا سکتا ہے۔ فنِ تاریخ گوئی کی ایک سو کتابوں تک رسائی کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ جس کو جناب کمال صاحب نے بڑی خوبی سے انجام دیا ہے۔ بے شک اس میں چاشنی نہیں ہوسکتی تھی جبکہ اسی موضوع پر ممتاز محقق ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے چالیس سے زائد کتب کا جائزہ پیش کر کے ۱۹۸۲ء سے ۲۰۰۴ء تک اسی کو بار بار شائع فرمایا اور محترم قمر رُعینی نے پچیس کتابوں کی مختصر فہرست اکتوبر / دسمبر ۲۰۰۴ء سہ ماہی ''الاقرباء'' کے اوراق پر پیش کی اور فخریہ لکھا: ''میری تحقیق کے مطابق اس فن پر اب تک ۲۰ سے زیادہ کتابیں مطبوعہ و غیر مطبوعہ ہیں۔ میرا خیال ہے فنِ تاریخ گوئی پر لکھی جانے والی کتابوں میں سے اب تک غالباً تاریخ گوئی سے متعلق اتنے حوالے نہیں مل سکیں گے۔ الحمدللہ! اس ناچیز کو توفیق ارزانی فرمائی۔'' (اقتباس تحریر جناب قمر رُعینی۔ اکتوبر/ دسمبر ۲۰۰۴ء سہ ماہی ''الاقرباء'' اسلام آباد)

محترم جناب سید انتخاب علی کمال کا مرتب کردہ سو کتابوں کا یہ تازہ اشاریہ ان دونوں شخصیات کے لئے نئے زاویے بنا رہا ہے۔ سہ ماہی ''الاقرباء'' آپ کی سربراہی میں فن تاریخ گوئی پر تحقیقی مقالات شائع کر کے بلاشبہ فن تاریخ گوئی کے ''مردہ'' تن میں نئی روح پھونک رہا ہے۔ آپ، ادارہ الاقرباء اور مقالہ نگار محترم سید انتخاب علی کمال صاحب تینوں ہی یکساں مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اہل فنِ تاریخ میں تادیر آپ حضرات کا نام زندہ رہے گا۔

محترمہ جناب ڈاکٹر نسیم اے ہائنز، محترم جناب ڈاکٹر خیال امروہوی، محترم جناب سید رفیق عزیزی، محترم جناب کرامت بخاری، محترم جناب انور شعور، محترم جناب نورالزماں احمد اوج کی ادبی کاوشیں اپنی جگہ بلند معیار کی حامل ہیں۔ بیگم طیبہ آفتاب کے گھریلو چٹکلے خاصے مفید ہیں۔ انہیں آخری صفحات ہی میں جگہ کیوں دی جاتی ہے؟ جریدے کی پروف ریڈنگ پہلے سے بہتر ہے مگر ابھی اور توجہ درکار ہے۔

طاہر نقوی۔ کراچی

الاقرباء کا تازہ شمارہ اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۶ء موصول ہوا۔ بہت شکریہ۔ میں ممنون ہوں کہ آپ یاد رکھتے ہیں۔ زیر نظر شمارے میں افسانوں کی عدم شمولیت کھٹکتی ہے' البتہ غیر معیاری اور کمزور افسانوں سے بہتر بھی تھا۔ سالنامے کے لئے دو افسانے بھیج رہا ہوں۔ ان میں سے ایک سالنامے اور دوسرا کسی عام شمارے میں شامل کر لیجئے۔ اس شمارے میں ڈاکٹر طاہر مسعود کا مضمون ''کیا کہانی کا فن رو بہ زوال ہے؟'' اہم تخلیق ہے۔ نقد و نظر میں آپ نے دونوں کتابوں پر بھرپور اور جامع تبصرہ کیا ہے۔ بحیثیت نقاد آپ کی رائے متوازن اور تعمیری ہوتی ہے' البتہ میری کتاب پر آپ نے ایسا تبصرہ نہیں کرایا۔

انور خلیل۔ اسلام آباد

''الاقرباء'' کا تازہ شمارہ گزشتہ ہفتے موصول ہوا تو ایک بار پھر یہ سوال ذہن میں آیا کہ ایک ضخیم ادبی اور تحقیقی رسالہ پابندی وقت کے ساتھ شائع کرنا آپ کیلئے کیسے ممکن ہو جاتا ہے؟ آپ کی اپنی شخصیت' لیاقت اور محنت ہر شمارے میں نمایاں نظر آتی ہے لیکن ساتھ ہی ایک جھلک اس رحمت خاص کی بھی دکھائی دیتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنے صرف ان بندوں کو نوازتا ہے جو ہمہ وقت دوسروں کے فائدے کیلئے کام کرنے کے جذبے سے سرشار رہتے ہیں اور جن کی محنت کے پیچھے دوسروں کو فیض پہنچاتے رہنے کی نیت کارفرما رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ اپنی رحمتوں سے نوازتا رہے۔

آپ نے اعلان فرمایا ہے کہ آئندہ شمارہ سالنامہ ہوگا۔ اس شمارے کیلئے کراچی کے ایک ممتاز اور متحرک ادارے ''دائرۂ علم و ادب'' کی توثیق شدہ روداد ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے آپ کے قارئین پسند فرمائیں گے۔ دائرۂ علم و ادب کی ہفتہ وار تنقیدی نشستیں برسوں کراچی کے ادبی منظر نامے کا حصہ رہیں۔ ان نشستوں میں عروس البلاد کراچی کے معروف اہل علم و دانش اور اہل قلم شریک ہوتے تھے۔ چند نام حافظے سے یہاں لکھ رہا ہوں۔ ان میں بہت سوں سے آپ واقف ہونگے:

زیڈ اے بخاری' شان الحق حقی' ڈاکٹر احسن فاروقی' ڈاکٹر فرمان فتح پوری' سید محمد تقی' غلام عباس' کمانڈر انور' پروفیسر کرار حسین' حکیم اسرار احمد کریوی' نذیر ناجی' سرشار صدیقی' عبدالحمید کمال' سید

محمد احمد سعید' خالد علیگ' امید ڈبائیوی (امید فاضلی)' پروفیسر وسیم فاضلی' جون ایلیا' شاہد عشقی' عبید اللہ علیم' رضی اختر شوق' فائق بدایونی' نعیم آوری' افسر آذر' اسراؤ طارق' نسیم درانی' محمد اکرام' پروفیسر سرور سنبھلی' نسیم شاد' مجیب خیر آبادی' شمیم نوید' رحمان خاور' پروفیسر خواجہ آشکار حسین' بانی دائرہ شاید ہی کسی نشست سے غیر حاضر رہے ہوں۔ یہ سب نام کسی ترتیب سے نہیں لکھے۔ یاد آتے گئے اور لکھتا گیا۔ کئی نام چھوٹ گئے ہوں گے۔ ایک بات اور! جناب جوش ملیح آبادی نے اسلام کی بجائے انسانیت کو اپنا مذہب قرار دینے کا اعلان ''دائرہ علم و ادب'' کے ایک خصوصی اجلاس میں کیا تھا۔ انہوں نے اس موضوع پر ایک مقالہ پڑھا تھا جس کا عنوان تھا ''قشقہ کھینچا' دیر میں بیٹھا' کب کا ترک اسلام کیا''۔

دائرہ علم و ادب کی توثیق شدہ روداد اور تعارفی نوٹ منسلک کر رہا ہوں۔ یہ اس مسودے کا حصہ ہے جو پاکستانی ادب کی تعمیر و تشکیل میں کراچی کے حصہ اور یہاں کی ادبی سرگرمیوں کے موضوع پر زیر ترتیب ہے۔ اس منظر نامے کا زمانہ قیام پاکستان کے بعد کے پچیس' تیس سال پر محیط ہے۔ یہ کام اب تک مکمل ہو چکا ہوتا لیکن آپ جانتے ہیں خصوصاً گزشتہ دو ڈھائی برس مسلسل دل کی تکلیف میں گزرے۔ انجیو پلاسٹی کے مراحل سے گزرا۔ دو بار امریکہ جانا پڑا' الحمدللہ اب حالت بہت بہتر ہے۔ میرے کئی کام جو ادھورے پڑے ہیں انہیں پورا کرنا چاہتا ہوں۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اپنا کرم شامل حال رکھے اور مجھے اتنی مہلت دے کہ جو چیزیں جمع کر رکھی ہیں انہیں ترتیب دے کر زندگی بھر کا بوجھ اتار سکوں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور خوشی سے نوازتا رہے اور آپ ''الاقرباء'' کی بروقت اشاعت کا کارنامہ یونہی انجام دیتے رہیں۔

ڈاکٹر مظہر حامد۔ کراچی

اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۶ء کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ دلی مسرت ہوئی یاد فرمائی کا شکریہ۔ ڈاکٹر طاہر مسعود نے کہانی اور کہانی نویس پر جو نکات پیش کیے ہیں وہ فہم اور بصیرت کا اظہار ہے۔ کہانی کو کہانی ہی ہونا چاہیے کچھ اور نہیں بجا فرمایا۔ فنکار تو تہذیب و اخلاق کا پروردہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں معاشرتی، سماجی اور اخلاقی ناہمواریوں کو شدت سے محسوس کرتا ہے' زیادہ تر کہانیوں کا تانا بانا آس پاس اور

اردگرد سے لیا جاتا ہے' جبکہ ہونا یہ چاہیے کہ مطالعہ ومشاہدہ سے کہانی کے معیار کو بلند کیا جاسکتا ہے'' کیا کہانی کا فن روبہ زوال ہے'' چونکا دینے والا مضمون ہے۔

فن تاریخ گوئی پر سید انتخاب علی کمال نے جس عرق ریزی سے گوہر نایاب دریافت کیے ہیں ان کی یہ سعی تحقیقی ذوق کی آئینہ دار ہے۔ تاریخ گوئی پر ۱۰۰ کتابوں کو تلاش کرنا پھران پر تحقیقی نوٹ لکھنا بڑا کام ہے۔ ڈاکٹر شاہد اقبال کامران کا مضمون اقبال پر نہایت پر مغز ہے اور ایک اضافہ بھی۔

آغا گل۔ اسلام آباد

سہ ماہی 'الاقرباء' کا تحفہ موصول ہوا۔ ممنون ہوں کہ آپ یاد رکھتے ہیں۔ نہایت ہی علمی اور ادبی جریدہ ہے۔ ڈاکٹر طاہر مسعود نے ''کیا کہانی کا فن روبہ زوال ہے'' اخباری کالم کے انداز میں لکھا ہے۔ جیسا کہ ہم بچپن میں صبح کی سیر۔ میرا بہترین استاد قسم کے مضامین لکھا کرتے تھے بلکہ ہمیں یاد کرائے جاتے تھے۔

بات یہ ہے کہ کن افسانوں سے انہیں یہ تاثر ملا۔ عربی وغیرہ کے کن افسانوں' کہانیوں سے انہیں تاثر ملا کہ وہ اردو سے بہتر ہیں۔ ادب میں کبھی عمومی بیان (Generalised Statement) نہیں ہوا کرتا۔ اگر کوئی قلم کار بیک جنبش قلم محمد الیاس' ڈاکٹر انور سجاد' جمیل نسیم' عذرا اصغر' خالد فتح محمد' احمد ہمیش' غنی پرواز' فاروق سرور' یعقوب غرشین کی ادبی وعلمی کاوشوں کو رد کرتا ہے تو اس کے پاس جواز ہونا چاہیے۔ تقابلی مطالعہ بھی ضروری ہے۔ یہ مضمون یہ انداز الاقرباء کے مزاج سے میل نہیں کھاتا۔ میری گزارش ہے کہ آپ علمی مضامین شائع کیجئے۔ علاوہ ازیں فاضل مصنف کو دور (Period) ابھی لکھنا چاہیے تھا کہ ان کی رائے گرامی ۱۹۶۰ء کے افسانوں کے بارے میں ہے یا کہ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں لکھے جانے والے افسانوں' ناولوں کے بارے میں۔ اس مضمون سے مجھے دھچکہ لگا' کیونکہ الاقرباء کو میں نے ہمیشہ معیاری پایا۔

پروفیسر ڈاکٹر خیال امروہوی۔ لیہ (پنجاب)

نوجوانی میں والد مرحوم اور استاد اسرار احمد انصاری سے فارسی کتابیں پڑھی تھیں۔ (۱) اخلاق محسنی' (۲) اخلاق جلالی' (۳) اخلاق ناصری (آدھی) ابوالفضل' فلسفے میں روز حکمت' حاجی بابا اصفہانی'

منتخبات شعرائے فارسی ایران، عبدالقادر سروری، محی الدین قادری زور کی تنقیدیں۔ ان کتابوں کے اثرات تاحال زائل نہیں ہوئے۔ الاقرباء کی علمی تدوین، سرورق کی زیب و آرائش اغلاط سے پاک اشعار کے اوزان کی نگرانی، موضوعات کی علمی رفعت و ترفع شاعری میں سماجی اور جمالی نقطۂ نظر کی تخلیق آفرینی جی چاہتا ہے الاقرباء کے ہر شمارے کو صہبائے افکار کے جام و ساغر، رحیق و صبوحی کے کاسۂ حافظ شیرازی میں گھول کر پی لیا جائے۔

مشتاق شبنم۔ کراچی

الاقرباء نومبر۔ دسمبر ۲۰۰۶ء موصول ہوا۔ میں آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ الاقرباء کے مندرجات نظم و نثر سے استفادے کی صورت پیدا ہوئی۔ غالب و حالی کے ساتھ ڈاکٹر عندلیب شادانی کے متعلق بہت سی علمی و تحقیقی باتیں سامنے آئیں۔ ویسے انہیں عام طور پر ایک محترم اور بڑے غزل گو کی حیثیت سے جانا جاتا ہے اور بنگال میں (سابقہ مشرقی پاکستان) میں ان کی ادبی و شعری خدمات بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ یہی نہیں کہ انہوں نے صرف شاعری کی بلکہ انہوں نے بنگال کے اعلیٰ طبقے جن کی مادری زبان بنگالی تھی ان میں اردو زبان کی اسطرح ترویج و اشاعت کی کہ ان میں اردو کے اعلیٰ درجے کے شعراء پیدا ہوئے۔ ان کی عمر کا بیشتر حصہ ڈھاکہ میں گزرا اور وہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے سربراہ رہے اور بہت سے لوگوں کو اپنی نگرانی میں پی ایچ ڈی کروائی۔ اگر مجھے موقعہ ملا تو میں ان کی دوسری حیثیتوں کے بارے میں لکھوں گا۔

موجودہ شمارہ نثری اعتبار سے ہی اہم نہیں شعری ادب کے اعتبار سے بھی اہمیت و افادیت کا حامل ہے یوں تو تمام منظومات قابل قدر اور اہمیت کی حامل ہیں لیکن ڈاکٹر خیال امروہوی کے قطعات جمیل یوسف کی نظم اور ثریا بانو ہاشمی کی منقبت مجھے پسند آئی۔ غزلوں میں خالد یوسف، صابر عظیم آبادی، حسیر نوری، انور شعور، کرامت بخاری، مضطر اکبر آبادی، سہیل غازی پوری، ڈاکٹر انور سدید کی غزلیں اچھی لگیں۔ آپکا اداریہ بے حد اہم اور وقیع ہے۔ آپ نے احمد ندیم قاسمی کو جس قدر دل کی گہرائیوں سے خراج عقیدت پیش کیا یہ آپ ہی کا حصہ ہے آپ کے اداریے نے خاص طور سے متاثر کیا اور میرے [illegible] تاثر

نے ایک نظم کی صورت اختیار کرلی ہے جو سانیٹ کے فارم میں ڈھلی گئی۔ اسکے علاوہ دو غزلیں بھی آئندہ شما رے کے لئے ارسال کررہا ہوں۔

محبّ وطن فنکار

سانیٹ

(۱)

اداسیوں میں ہے لپٹی ہوئی فضائے بسیط
جہانِ شعرو ادب میں بپا ہے اک کہرام
کیا ہواؤں نے گُل یک بیک چراغِ شام
دل و دماغ کی دنیا پہ تیرگی ہے محیط

(۲)

غزل کی زلف پریشاں ہے چشم گریاں ہے
حروف نظم کی آنکھوں سے خوں ٹپکتا ہے
سطورِ نقد سے شعلہ سا اک لپکتا ہے
ہر ایک صنفِ ادب آج رنج ساماں ہے

(۳)

یہ سانحہ ہے کہ اک عہد ادب کا ختم ہوا
یہ واقعہ ہے کہ کتنا عظیم تھا وہ شخص
دکھوں کو سہتا تھا کرتا نہ تھا گلہ وہ شخص
ادب کی راہ کا وہ منفرد تھا راہنما

(۴)

دھنی قلم کا تھا انسان دوست تھا کردار
کہ وہ عظیم محبّ وطن تھا اک فنکار

زہیر کنجاہی۔ راولپنڈی

الاقرباء اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶ء مل گیا۔ میں ہمیشہ سب سے اول مکتوبات کا مطالعہ کرتا ہوں کیونکہ ان مکتوبات میں تحقیق وتنقید کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے اور یہ وصف صرف الاقرباء کو حاصل ہے کہ بے لاگ اور حقائق پر مبنی خطوط شائع کیے جاتے ہیں۔ اس سال اُردو زبان وادب کی ایک بڑی شخصیت سے ہم جدا ہو گئے جس کے تذکرہ کیلئے آپ نے اپنے اداریئے کو ''غزالاں تم تو واقف ہو'' کا عنوان بنایا۔ یہ پورا شعر ایسی ہی ایک یاسیت اور محرومی کے موقع پر کہا گیا تھا۔ جنگِ آزادی کا جب پہلا شہید بنگال کا مالک سراج الدولہ شہید ہو گیا تو اس کے دیوان راجا رام موزوں نے سراج الدولہ کی لاش پر کھڑا ہو کر فی البدیہہ کہا تھا۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

زیست و موت کے بارے میں جناب احمد ندیم قاسمی کا ایک لازوال شعر ان کی شاعری میں موجود ہے۔

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا　　　میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

محترم سید انتخاب علی کمال نے بڑا پر مغز اور جامع مضمون "فن تاریخ گوئی پر مطبوعات اور مخطوطات کا اشاریہ" تحریر کیا ہے جس کی داد دینا ضروری سمجھتا ہوں گویا اتنی معلومات جو صدیوں پر مشتمل ہوں انہیں یکجا کر دینا آسان کام نہیں ہے یہ کام بڑا محنت طلب ہے۔

ڈاکٹر شاہد کامران اپنے مقالہ "پاکستان میں اقبال پر مطالعہ و تحقیق کے مسائل و عوامل" میں ایک جگہ لکھتے ہیں: "بد قسمتی سے ہماری جامعات میں عالم زیادہ ہیں اور علم کم ہے" (ص ۸۵) دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ "یونیورسٹیوں میں اچھے اساتذہ اور اچھے تحقیقی رہنماؤں کا قحط ہے۔" (ص ۸۶) ان کی تحریر کردہ یہ دونوں باتیں ہمارے لئے اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے لئے عبرت کا مقام پیش کرتی ہیں۔ اپنے اسی مقالہ میں جب آخر میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی پر پہنچتے ہیں تو تضاد سے کام لیتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ "اب علامہ اقبال یونیورسٹی میں بھی ایم فل یا پی ایچ ڈی کی سطح پر تحقیق کرنے کے لئے اسکالرز کو صدر شعبہ کی نظر کرم کی بجائے اپنی ذاتی قابلیت پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔" آگے چل کر دوسری جگہ لکھتے ہیں "ایم فل اقبالیات کے ضمن میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے تحقیقی مقالے اپنے معیار اور مقدار کے اعتبار سے نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اپنے روز افزوں تجربات کی روشنی میں عملِ تحقیق اور موضوعات تحقیق کے انتخاب میں وسعت اور بہتری لانے کی کوشش کر رہی ہے۔" اصل بات یہ ہے کہ دونوں بیانات میں تضاد پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ دونوں بیانات کا مطلب ایک ہی ہے۔ ہاں اگر یہ لکھا جاتا کہ وسعت اور بہتری پیدا کی گئی ہے تو پھر تضاد کی صورت ہو سکتی تھی۔ بہر حال ڈاکٹر شاہد کامران نے اپنے مقالہ میں زیادہ تر حقائق پر مبنی خیالات کو در طۂ تحریر میں لانے کی سعی کی ہے۔

مسز نازیہ فہیم الدین۔ لاہور

سہ ماہی رسالہ ''الاقرباء'' کی گرویدہ ہوں۔ الاقرباء ادب کا سبد گُل ہے جس سے قارئین کے قلب و ذہن معطر ہوتے ہیں تازہ شمارے کے اداریے میں احمد ندیم قاسمی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اندازِ تحریر دل نشیں ہے۔

محمد شفیع عارف دہلوی نے ''غالب کی شاعرانہ عظمت و آفاقیت'' پر مقالہ لکھ کر غالب کی شوخی و ظرافت، جدت طرازی، خیال آفرینی اور معنی آفرینی پر ایک سحر انگیز تحریر قارئین کو دی ہے۔ ڈاکٹر غلام شبیر رانا نے مولانا الطاف حسین حالی کی تنقید پر عمدہ مقالہ لکھا ہے۔ ڈاکٹر محمد معزالدین کا ''ڈاکٹر عندلیب شادانی بہ حیثیت محقق'' بہت پر مغز مقالہ ہے۔

محترم جناب سید انتخاب علی کمال کا ''فنِ تاریخ گوئی پر یک صد مطبوعات و مخطوطات کا اشاریہ'' تحقیقی مقالہ فنِ تاریخ گوئی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک نادر اور بیش بہا عطیہ ہے یہ مقالہ فنِ تاریخ گوئی پر سید انتخاب علی کمال کے عمیق مطالعے اور ژرف نگاہی کا ثبوت ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ موصوف فنِ تاریخ گوئی میں ''ہمزہ'' اور ''تائے مدورہ'' کے اعداد کی ژولیدگی پر بھی بھرپور اور مدلل مقالہ لکھیں تاکہ ان دونوں کی پیچیدگی دور ہو جائے۔ ''کیا کہانی کا فن رو بہ زوال ہے۔'' ڈاکٹر مسعود طاہر نے خوب لکھا ہے ڈاکٹر شاہد کامران نے پاکستان میں اقبال پر مطالعہ و تحقیق کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے قابل گلاؤٹھوی پر ڈاکٹر انور سدید نے بھی اچھا مقالہ لکھا ہے غزلیات میں کئی شعراء کی غزلیں بہت عمدہ ہیں شہلا حسن زیدی نے مولانا شبیر احمد عثمانی پر اچھی تحریر مرتب کی ہے۔

کرامت بخاری۔ لاہور

آپ کا ''الاقرباء'' جب بھی نظر نواز ہوتا ہے، ایک طمانیت کا احساس ہوتا ہے، ایک آدھ ہفتہ آسودہ گزرتا ہے، نئی تخلیقات نئی سوچ نئی فکر، نیا مشاہدہ اور ادب کی رفتار کا اندازہ ہوتا ہے۔ برادر محترم مشکور حسین یاد صاحب کی تازہ کاری اور مختلف ردعمل بھی خوب ہوتے ہیں، زندگی انہی خوبصورت لمحات واقعات، اور تصورات کا نام ہے۔

سید انتخاب علی کمال۔ کراچی

راقم الحروف کا طویل مقالہ "فنِ تاریخ گوئی پر یکصد مطبوعات و مخطوطات کا اشاریہ" کی اکتوبر/دسمبر ۲۰۰۶ء کے شمارے میں اشاعت کا بہت شکریہ۔ میرا تو خیال تھا کہ مقالے کی طوالت، اشاعت میں رکاوٹ ہوگی۔ لیکن اٹھائیس صفحات پر مشتمل مقالے کی اشاعت آپ کی علم دوستی، ادب نوازی اور فنِ تاریخ گوئی سے لگاؤ کا مظہر ہے۔ مذکورہ مقالے کے صفحہ نمبر ۴۲ پر سطر نمبر ۱۳، ۱۴ پر راقم الحروف نے تحریر کیا ہے۔

"گلزار فتح شاہ ہند از عبدالجلیل واسطی بلگرامی کو قطعاتِ تاریخ کا سب سے پہلا مجموعہ قرار دیا جا سکتا ہے"

سہ ماہی "اردو" انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی کا نیا شمارہ مجریہ جنوری تا دسمبر ۲۰۰۶ء جو ۲۲۹ صفحات پر مشتمل ہے اور سارے کے سارے صفحات "تذکرۂ درفشاں" کی قسط دہم کے لئے مختص کئے گئے ہیں۔ اس کے صفحہ نمبر ۹۲۰، ۹۲۱ پر مظہر اکبر آبادی کا احوال درج ہے۔ جس میں صاحبِ تذکرۂ دُرخشاں سید خورشید علی مہر تقوی جے پوری نے لکھا ہے:۔

"ابو عبداللہ محمد فاضل (ابن سید احمد بن سید حسن حسینی ترمذی) معروف بہ مظہر الحق (مظہر اکبر آبادی) ساکن اکبر آباد (آگرہ) آپ نے ایک کتاب لکھی۔ جس کا تاریخی نام "مخبر الواصلین" (۱۰۶۰ھ) رکھا۔ اس کے شروع میں یہ عبارت اس کے مرتب (نور علی خان) کی طرف سے درج ہے"۔

"در عہدِ دولتِ شاہجہاں بادشاہ در سنہ یک ہزار و شصت بنظم آں پرداختہ واز نامِ کتاب تاریخ آں برمی آید"

اس اقتباس کی روشنی میں کتاب "گلزارِ فتح شاہ ہند" از عبدالجلیل واسطی بلگرامی کو قطعاتِ تاریخ کا پہلا مجموعہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لہٰذا قارئین الاقرباء نوٹ فرمالیں۔ کہ قطعاتِ تاریخ کا پہلا مجموعہ "گلزارِ فتح شاہ ہند" نہیں ہے بلکہ "مخبر الواصلین" (۱۰۶۰ھ) کو قرار دیا جانا چاہئے۔ کیونکہ گلزار فتح شاہ ہند" بہ عہدِ عالمگیری سنہ اشاعت ۱۱۱۱ ہجری مطابق ۱۶۹۹ عیسوی کی کتاب ہے اور "مخبر الواصلین" بہ عہد شاہ جہاں (۱۰۶۰ھ ہجری مطابق ۱۶۴۹ عیسوی) کی کتاب ہے۔ البتہ اسے (مخبر الواصلین کو) نُور علی خاں نے ۱۲۴۹ ہجری مطابق ۱۸۳۳ عیسوی میں مرتب کیا۔ مخبر الواصلین کا حوالہ راقم الحروف کے مقالے میں سیریل نمبر ۴۔ صفحہ نمبر ۴۳ پر درج ہے۔ قارئین الاقرباء تصحیح فرمالیں۔

سید حبیب اللہ بخاری۔ بہاولپور

امسال رمضان المبارک کے مقدس مہینہ میں مجھے ادائیگی عمرہ کی سعادت نصیب ہوئی دس دن مکہ شریف میں رہا اور بیس دن مدینہ منورہ میں۔ اس دفعہ عید الفطر بھی مدینہ میں پڑھی۔ میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کرمِ خاص سے تین مرتبہ حج ادا کرنے اور پندرہ مرتبہ ادائیگی عمر کی توفیق عطا فرمائی۔

طوافِ کعبہ اور روضہ رسول اللہ ﷺ پر حاضری کے وقت آپ روحانی طور پر میرے ساتھ تھے اور دعاؤں میں شامل ، یہ سب آپ سے خصوصی تعلق خاطر کی بنا پر لکھ رہا ہوں۔ میرے تصور میں یہ رہا کہ۔

گرچہ دوریم بیادِ تو قدح می خواریم　　　　بُعدِ منزل نہ بود در سفرِ روحانی

۲۳ر اکتوبر کو جب میں گھر پہنچا تو سب سے پہلے ''الاقرباء'' کے بارے میں اپنے بچوں سے پوچھا تا کہ آپ سے ملاقات ہو جائے۔ ماہِ اکتوبر دسمبر ۲۰۰۶ کا مجلّہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ اپنے اداریہ میں آپ نے نامور شاعر ادیب احمد ندیم قاسمی کو بجا طور پر خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ بلاشبہ یہ اُن کا استحقاق تھا۔ افسوس ہے کہ ہمارے اس قدر عظیم شاعر و ادیب کو ہمارے صحافتی اور نشریاتی حلقے میں وہ پذیرائی نہیں ملی جس کے وہ مستحق تھے۔ کسی کے ساتھ فکری و نظریاتی اختلافات زندگی میں تو کسی حد تک جائز قرار دئے جا سکتے ہیں لیکن دائمی مفارقت کے بعد اس کی قابلِ ستائش کاوشوں اور خوبیوں سے اغماض مناسب نہیں۔ بقول جوش ملیح آبادی

اے دوست دل میں گردِ کدورت نہ چاہیے　　　　اچھے تو کیا بروں سے بھی نفرت نہ چاہیے

''غالب کی شاعرانہ عظمت و آفاقیت'' پر جناب محمد شفیع دہلوی کا مقالہ اُن کی معرفتِ فکر کا آئینہ دار ہے۔ جناب سید انتخاب علی کمال کو فنِ تاریخ گوئی میں جو کمال حاصل ہے کون اس کا معترف نہیں۔ اس مرتبہ ''فنِ تاریخ گوئی پر یکصد مطبوعات و مخطوطات کا اشاریہ'' کے عنوان پر ان کی محققانہ کاوش ان کے وسعتِ مطالعہ کی مظہر ہے۔ اس مرتبہ مسجد نبوی میں وہاں کے شیخ محمد عبد الرزاق کے توسط سے ایک کتب خانہ دیکھنے کا اتفاق ہوا جسے ''المخطوطات'' کا نام دیا گیا ہے۔ پاکستان کے محمد ہاشم صاحب اس کے

انچارج ہیں۔ یہ بلاشبہ ایک گرانقدر سرمایہ ہے جس میں تقریباً دس ہزار مخطوطات اور صحابہ کرامؓ کے زمانے کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ یہ تمام مروّج و مستعمل طریقہ ہائے خطوط میں لکھے ہوئے ہیں۔ اُن مخطوطات و دستاویزات کی زیارت و مطالعہ کے وقت مجھے کمال صاحب یاد آئے۔ میں دعا کرتا رہا کہ اللہ کمال صاحب کے علم و فن میں برکت عطا فرمائے۔ برادرِ بزرگ جناب علامہ قابل گلاؤٹھوی کی شاعری پر جناب ڈاکٹر انور سدید کا تبصرہ قابل قدر اور بصیرت افروز ہے۔ بلاشبہ برادرِ بزرگ اپنی ذات میں ایک دبستانِ شعر تھے۔ آپ کے توسط سے ان کی زیارت تو نصیب ہوئی مگر اُن کے فکر و فن سے فیضیاب ہونے کا موقع نہ مل سکا۔ اس لئے کہ وہ ہماری عمر کا لاشعوری دور تھا۔ اب ڈاکٹر صاحب کی مہربانی سے احساس محرومی نہیں رہا۔

ڈاکٹر شاہد اقبال کامران کے ''رپورتاژ'' سے یہ احساس ہوا کہ اردو کی تفہیم و تحقیق اور ترویج و ترقی میں ہمارے غیر ملکی مفکرین کس قدر مستعد ہیں۔ افسوس ہے کہ قومی نقطۂ نگاہ سے اپنی بے بضاعتی پر کوئی ندامت نہیں۔ دعا ہے کہ ہماری نئی نسل کا ہر فرد صباحت قمر اور رابعہ سرفراز کی طرح قابلِ اعتماد اور باوقار ہو جائے۔

''قومی زبان'' کے سلسلہ میں ہمارے اربابِ بست و کشاد کی بے توجہی ہمیں اُردو کے گرانقدر سرمایہ علمی سے محروم کرنے کا باعث ہو رہی ہے۔ اکبر حیدرآبادی، صابر عظیم آبادی، خالد یوسف، نور الزمان ادرج، سہیل اختر پروفیسر زہیر کنجاہی کے کلام سے محظوظ ہونے کا موقع ملا۔

یقین جانئے کہ ''گلشن الاقرباء'' کی آرائنگی میں ہر صاحبِ فن محوِ جستجو ہے اور ہم جیسے لوگوں کو اس رنگ و نور سے مستفید ہونے کا موقع عطا کر رہا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

خبرنامہ

الاقرباء فاؤنڈیشن

(اراکین کیلئے)

مرتبہ

پروفیسر ہما سالاری

احوال وکوائف

☆ امریکہ میں ''الاقرباء'' کے معاونِ خصوصی محمد اویس جعفری کے صاجزادے

کی شادی خانہ آبادی

دلہا دلہن

جناب محمد اویس جعفری و بیگم مسرت جعفری کے صاجزادے ڈاکٹر سہیل محمد جعفری کی شادی خانہ آبادی کی تقریبات گزشتہ دنوں نیویارک میں منعقد ہوئیں۔ دلہن بشریٰ اسلم جو آنکالوجی (Oncology) میں پی۔ایچ۔ڈی کر رہی ہیں جناب محمد اسلم و محترمہ پروفیسر بلقیس اسلم کی دختر فرخندہ اختر ہیں۔

شادی کی تقاریب دینی وقار اور اسلامی تہذیب وثقافت کی آئینہ دار تھیں۔ نکاح اور استقبالیہ کی تقریب نیویارک کے معروف بینکوئٹ ہال (Banquet Hall) لینارڈز (Lenoards) میں منعقد ہوئی جبکہ ولیمہ کا اہتمام میریٹ ہوٹل (Marriot Hotel) میں کیا گیا تھا۔ اویس جعفری صاحب جو ایک طویل مدت سے سیاٹل (واشنگٹن اسٹیٹ) میں رہائش پذیر ہیں بحیثیت ادیب وشاعر وسیع علمی وادبی حلقوں میں متعارف ہیں اور اہلِ قلم سے ان کے تعلقات امریکہ ہی نہیں بلکہ متعدد دیگر ممالک جن میں لیٹن امریکہ کی ریاستیں کینیڈا۔ یورپ بالخصوص برطانیہ اور سیکنڈ ینیویا کے ممالک آسٹریلیا' جنوبی ایشیا' سعودی عرب اور گلف ریاستیں شامل ہیں استوار ہیں بلکہ سہ ماہی ''الاقرباء'' کو جو بین الاقوامی شناخت میسر آئی وہ اصلاً جعفری صاحب ہی کے اثر ورسوخ اور مخلصانہ کاوشوں کے رہینِ منت ہے۔ چنانچہ شادی کی تقاریب بھی

ہال میں شرکاء نکاح کے دوران قرآنی آیات کی تلاوت سماعت کر رہے ہیں۔

بین الاقوامی اجتماع کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ میریٹ ہوٹل میں ولیمہ کی تقریب کے بعد جو محفلِ شعر و سخن منعقد ہوئی وہ یادگار رہے گی۔

شادی کی تقریب میں کثیر تعداد میں مہمانوں نے شرکت کی جن میں چند قابلِ ذکر اسمائے گرامی یہ ہیں: ڈاکٹر محمد عارف طور (امریکہ میں ڈاکٹر ایسوسی ایشن کے سابق صدر)، مانٹریال (کینیڈا) سے محمد اسلام، ثاقب اسلام، عارف اسلام۔ سڈنی (آسٹریلیا) سے بیگم نیلوفر وجاہت، محمد احمد اسلم، فرحین احمد، عنبرین قریشی، امریکہ کے مختلف مقامات سے پروفیسر بلقیس اسلم، محمد اسلم، میاں محمد اشرف، بیگم خالدہ اشرف، پروفیسر ڈاکٹر آصف خان، ڈاکٹر عابدہ رپلی (ڈائریکٹر VOA اردو پروگرام) ڈاکٹر آصف طارق، ڈاکٹر جولیا ناصر، ڈاکٹر نیلوفر، پروفیسر ناصر شمسی (صدر اقبال اکیڈمی نیوجرسی) ونگ کمانڈر (ر) فریدالدین احمد ہاشمی، ممتاز سرجن حسن فرید ہاشمی (تمغہ امتیاز، پاکستان) ڈاکٹر ارجمند ہاشمی (تمغہ امتیاز رخ پاکستان۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ کارڈیالوجسٹ) جناب وراثت خان، ڈاکٹر ملیحہ خان، محمد اسد خان، انصار برنی، اقبال برنی، ظہیر برنی، ڈاکٹر سبطِ حسن برنی، پروفیسر انور جہاں برنی، ڈاکٹر منصور اشرف، ڈاکٹر سارہ اشرف، جناب منیر الدین، جناب مشتاق احمد چوہان، سید جمیل احمد (نیوکلیئر سائنٹسٹ) اور جناب اعجاز احمد (سیاٹل کے معروف صنعت کار)۔ ادارہ سہ ماہی الاقرباء جناب و بیگم جعفری اور جناب و بیگم محمد اسلم نیز دیگر اعزاء و اقارب کو دلی تہنیت پیش کرتا ہے اور دلہا دلہن کی ابدی مسرتوں کیلئے دعا گو ہے۔

☆ **حج بیت اللہ کی سعادت:** ہر سال کی طرح اس مرتبہ بھی الاقرباء فاؤنڈیشن کے اراکین و عہدیداران حج بیت اللہ بالخصوص اس بار حج اکبر کی سعادت سے بہرہ مند ہوئے جو خواتین وحضرات اس سعادت سے شرف یاب ہوئے ان میں نائب صدر الاقرباء فاؤنڈیشن و مدیرہ مسئول سہ ماہی الاقرباء محترمہ شہلا احمد ان کے برادر عزیز محمد فیروز خان واہلیہ، سید نعیم احمد (سیکرٹری جنرل) اور اہلیہ عظمیٰ نعیم، ڈاکٹر ایم ایم شیخ اور اہلیہ۔ بیگم نجمہ رکن مجلس انتظامیہ سید گوہر علی کی صاحبزادی ہانیہ خالد اور داماد جناب خالد ریاض، سید منسوب علی زیدی و بیگم فیروزہ زیدی اور محترمہ شہلا حسن زیدی (رکن مجلس انتظامیہ) اور ان کے بھائی جو کیلیفورنیا (امریکہ) میں رہائش پذیر ہیں پاکستان سے سفر حج کیا اور حج اکبر کی سعادت سے بہرہ مند ہوئے۔ ہم ان تمام خواتین وحضرات کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔

☆ صدر الاقرباء سید منصور عاقل کی ہمشیرہ کا سانحہ رحلت:

جناب سید منصور عاقل کی ہمشیرہ محترمہ سیدہ تنظیم ناصر جو الاقرباء فاؤنڈیشن کی تاحیات رکن بھی تھیں ۲۲ جنوری ۲۰۰۷ء مطابق ۳ محرم الحرام ۱۴۲۸ھ کو انتقال کر گئیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مرحومہ چند ماہ قبل بعارضہء قلب انجو گرافی / پلاسٹی کے مراحل سے گزری تھیں اور بفضلِ خدا صحت یاب ہو گئی تھیں لیکن ۲۰ اور ۲۱ جنوری ۲۰۰۷ء کی درمیانی شب ان پر اچانک فالج کا حملہ ہوا جس سے زبان اور ذہن دونوں متاثر ہوئے۔ پمز ہسپتال میں چوبیس گھنٹے عالم بیہوشی میں زیر علاج رہنے کے بعد خالقِ حقیقی سے جا ملیں ان کے شوہر کا انتقال ۱۹۹۹ء میں کراچی میں ہو گیا تھا، تب ہی سے وہ اپنے بھائی اور بھاوج کے ساتھ اسلام آباد میں مقیم تھیں۔ مرحومہ پابندِ صوم وصلوۃ تھیں اور کثرت سے قرآنِ کریم کی تلاوت ان کا معمول تھا۔ ہم ان کی مغفرت اور پسماندگان کے صبر جمیل کے لئے دعا گو ہیں۔

☆ معز الدین صابری کا اعزاز:

گزشتہ ماہ الاقرباء فاؤنڈیشن کی مجلس انتظامیہ کے رکن جناب جی۔اے۔صابری و بیگم ماریہ صابری کے صاحبزادے معز الدین جو اٹلی (Milan) سے Environmental Economics میں

ماسٹرز کر رہے ہیں پاکستان آئے۔ انہیں LUMS سے Graduate Degree حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ Dean's Honour List میں شامل ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ ادارہ ان کو اس پرمسرت موقع پر مبارکباد پیش کرتا ہے اور ان کی مزید کامیابیوں کے لئے دعا گو ہے۔

☆ بریگیڈیئر اختر وحید کی نئی تعیناتی:

بیگم طیبہ آفتاب کے داماد بریگیڈیئر اختر وحید نے سیالکوٹ سے تبادلے کے بعد راولپنڈی میں AFIRM کے Commanding Officer کا عہدہ سنبھال لیا ہے۔ ادارہ ان کی کامیابی کے لئے دعا گو ہے۔

☆ زیدی برادران کا دورۂ بھارت

محترم جناب نظر علی زیدی دسمبر کے آخری ہفتے میں اہلیہ اور صاحبزادی کے ساتھ انڈیا تشریف لے گئے۔ وہ دہلی، علی گڑھ، آگرہ، اجمیر اور جودھ پور میں قیام پذیر رہے۔ اسی دوران جناب سید حسن زیدی بھی جو ر پورٹس اینڈ شپنگ کی وزارت میں جائنٹ سیکرٹری کے عہدہ پر فائز ہیں حکومت پاکستان و بھارت کے درمیان دہلی میں دستخط ہونے والے ایک معاہدہ (پروٹوکول) پر دستخطوں کی تقریب کے سلسلہ میں وہاں گئے اور پاکستان کی نمائندگی کی۔

☆ سید فہیم احمد گردیزی کا دورۂ افریقہ:

سید فہیم احمد گردیزی و بیگم عفت گردیزی (اراکین مجلس انتظامیہ) گزشتہ دنوں ایتھوپیا (حبشہ) کے دارالحکومت عدیس ابابا تشریف لے گئے جہاں ان کے داماد ڈاکٹر قیس اقوام متحدہ کے مشن میں تعینات ہیں اور حسنِ اتفاق کہ ان کے بڑے صاحبزادے میجر عاصم حسین گردیزی بھی یو این مشن اریٹیریا میں تعینات ہیں چنانچہ وہ بیٹی، داماد اور بیٹے کے پاس تقریباً ایک ماہ ان ممالک میں رہے جنہیں Horn of Africa کے ممالک کہا جاتا ہے، وہاں انہوں نے اہم مقامات کی سیر کی اور واپسی میں دبئی میں مختصر قیام کے بعد واپس وطن پہنچ گئے ہیں۔

سید صفدر حسین جعفری

منصور عاقل کے نام

(ہمشیرہ محترمہ کی دائمی جدائی پر)

ہم بھی پرسہ تمہیں دینے آئے
موت اک امرِ خُدا ہے تمہیں کہنے آئے
یہ فقط وقتِ دعا ہے تمہیں کہنے آئے

اپنے ہاتھوں سے جسے تم نے کیا تھا رخصت
عارضی عہدِ مسرت کے لیے عمر ہوئی
اب انہی ہاتھوں سے یہ دائمی رخصت...... رخصت
زخم بھر جائیں گے کہتے ہیں یہ لوگ
اور ہم نے تو یہی دیکھا ہے
جو جگہ خالی ہوئی...... خالی ہے!
اب یہ تا حشر نہیں بھر سکتی

ہم بھی پرسہ تمہیں دینے آئے
اور ہونٹوں پہ کوئی لفظ نہیں
لفظ کم پڑتے ہیں اظہارِ تاسف کے لئے
اب نہ پرسہ نہ دلاسہ ہے فقط آنسو ہیں
نطق ولب گویا تہی داماں ہیں
ہاں مگر نوکِ زباں پر ہے یہ مسنون دُعا
روحِ مرحومہ کو دے دامنِ رحمت میں قرار
ربِ کعبہ تری رحمت کا نہیں کوئی شمار

فہیم گردیزی

افریقہ کے سینگ کی سیر

یہ ستمبر اکتوبر ۲۰۰۶ء کی بات ہے میں بنک میں داخل ہوا سامنے میز پر بیٹھے ہوئے بنک آفیسر سے درخواست کی کہ مجھے ڈرافت بنوانا ہے اس نے مجھے ایک فارم دیکر اُسے پر کرنے کیلئے کہا میں نے فارم پر کر کے اسے واپس دیا۔ اسنے فارم کو بغور دیکھنے کے بعد مجھے بھی بغور دیکھا اور استفسار کیا کہ ڈرافت کس مقصد کیلئے چاہیے۔ میں نے مختصراً جواب دیا ''ویزہ فیس''۔ آفیسر نے مجھے پھر غور سے دیکھا اور تعجب سے کہا کہ وہاں تو جنگ شروع ہو رہی ہے۔ مجھے معلوم ہے میں نے کہا۔ وہاں تو بھوک اور افلاس کے ڈیرے ہیں۔ میں نے پھر وہی جواب دیا مجھے معلوم ہے کہنے لگا وہاں کے لوگ تو اُجڈ گنوار اور جاہل ہیں میں نے کہا تو پھر کیا ہوا؟ کہنے لگا وہاں تو کوئی قابل ذکر جگہ بھی نہیں میں نے کہا نہیں ابھی کل کی بات ہے کہ اخبار میں لکھا تھا ''ایتھوپیا'' مسلمانوں کی قدیم جائے پناہ۔ بادلِ ناخواستہ اسنے ڈرافٹ بنا کر دیا اور ازراہ ہمدردی بنک کی طرف سے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ اسکے بعد جس کسی سے ملاقات ہوئی اس میں سے اکثر نے ایتھوپیا کی برائی میں زمین و آسمان ایک کر دیے اور مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا جیسے میرا قصد

لوٹو یل پر ایتھوپیائی بچوں کے ساتھ

ایتھوپیا کا نہیں کالے پانی کا ہو۔ بہر حال میں انہیں منفی تصورات کو لیکر عازم ایتھوپیا ہوا۔ ہماری سب سے بڑی مجبوری یا دلچسپی یہ تھی کہ وہاں وزارت صحت میں میرا داماد قیس محمود یو۔این کی طرف سے Chief Technical Advisor تعینات ہے اور اسی وجہ سے برخوردار ی شاز یہ بھی وہیں مقیم ہیں اور یہ بھی ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ برخوردار میجر عاصم حسین گردیزی بھی UN آبزرور کی حیثیت سے ایتھوپیا اور اریٹیریا کی سرحد پر تعینات ہیں۔ دونوں کی شدید خواہش تھی کہ ہم دونوں میاں بیوی چند دن کیلئے عدیس ابابا ان کے پاس آئیں۔

عدیس ابابا کیلئے پاکستان سے براہ راست کوئی پرواز نہیں تھی ہر صورت میں دوبئی سے ہوکر جانا

عدیس ابابا یونیورسٹی

پڑتا تھا۔ دوبئی سے دو تین راستے تھے ہم نے براستہ نیروبی جانے کا فیصلہ کیا۔

ہم پروگرام کے تحت اسلام آباد سے ۱۶ نومبر کی شام پی۔آئی۔اے کی پرواز سے دوبئی روانہ ہوئے اور وہاں سے ہمیں تقریباً ۲ بجے رات نیروبی کیلئے روانہ ہونا تھا اس طرح تقریباً ۸ گھنٹے ہمارے پاس تھے۔ اس دوران ہم نے ایئرپورٹ کی سیر کی ایئرپورٹ کیا ہے ایک طلسماتی دنیا ہے۔ صرف ونڈو شاپنگ اور کچھ چاکلیٹ خریدنے میں آٹھ گھنٹے پلک جھپکنے میں گذر گئے۔ دوبئی کا ڈیوٹی فری بازار آنکھوں کو چکا چوند کر دیتا ہے انواع واقسام کی دوکانیں گاہکوں کو کچھ نہ کچھ خریدنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ بہر حال

کونہ کونہ دیکھا۔ رات ۵۵: ۱ پر کینیا ایئر لائن سے نیروبی روانہ ہو کر صبح ۶ بجے کینیا کے نیروبی ایئر پورٹ پر جا پہنچے۔ صبح ۶ بجے جہاز سے دیکھا تو نیروبی انتہائی سرسبز نظر آیا۔ نیروبی بذات خود ایک بڑا شہر ہے نیروبی میں ہمارے پاس صرف دو گھنٹے تھے وہ بھی وہاں ڈیوٹی فری بازار میں صرف ہوئے جلدی جلدی ہم نے سارے بازار کا چکر لگایا۔ نیروبی سے دو گھنٹے بعد عدیس ابابا پہنچ گئے۔ مجھے جہاز میں ٹیلیوژن سکرین پر دیکھ کر اس وقت بہت حیرت ہوئی جب سکرین پر سطح سمندر سے بلندی ۷ ہزار فٹ سے متجاوز تھی اور جہاز کے ویلز زمین کو چھو رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ عدیس ابابا سطح سمندر سے ۷ ہزار فٹ بلندی پر واقع ہے۔ اس قدر بلندی پر ہونے کے باوجود وہاں موسم بہت ہی عمدہ تھا۔ ایئر پورٹ پر شازیہ قیس استقبال کے لیے موجود تھی۔ عزیزم قیس دفتری مصروفیات اور بچے سکول کی مجبوری کی وجہ سے نہ آسکے تھے۔

عجائب گھر عدیس ابابا کا بیرونی منظر

ہم نے عدیس ابابا میں ۲۵ دن قیام کیا کیونکہ ایتھوپیا والے ایک ماہ سے زائد کا ویزا نہیں دیتے اور وہ بھی سنگل انٹری اس لیے اس دوران ہم کسی ہمسایہ ملک بھی نہ جا سکے البتہ عدیس ابابا اور مضافات کی بہت سیر کی۔ ایتھوپیا کے متعلق جو تصورات لیکر ہم وہاں پہنچے تھے انہیں اگر یکسر نہ سہی تو بہت حد تک غلط پایا خاص طور پر عدیس ابابا تو ایک ماڈرن شہر بنتا جا رہا ہے۔ وہاں بڑے بڑے ہال ہیں۔ کھلی کھلی سڑکیں ہیں پارک ہیں۔ عدیس ابابا تقریباً ۵۰ لاکھ افراد کا شہر ہے لیکن کہیں بھی ٹریفک کا مسئلہ نہیں دیکھا۔ لوگوں میں ٹریفک آگاہی ہے ہر شخص ''دوسرے کو راستہ دو'' کے اصول پر عمل پیرا ہے اگرچہ پڑھا لکھا طبقہ کافی ہے لیکن اعلیٰ تعلیم عام نہیں ہے۔ عام پبلک سے غربت نمایاں ہے ویسے جو امیر ہیں وہ بہت امیر ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ سرکاری مذہب

عیسائیت ہے لیکن مسلمان بھی تقریباً ۴۰% ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو سرکاری ملازمت سے قصداً دور رکھا گیا ہے۔ لیکن تجارت میں مسلمان آگے آگے ہیں۔ سرکاری ملازمت میں مسلمان برائے نام ہیں۔ ہمارے وہاں ہوتے ہوئے ڈاکٹروں کی ایک کانفرنس ہوئی۔ سارے ملک سے تقریباً دو ڈھائی سو ڈاکٹر آئے تھے اس میں وہاں صرف ایک مسلمان ڈاکٹر تھا۔ مسلمانوں نے سرکاری ملازمت کی اس طرح تلافی کی ہے کہ تجارت میں اپنے قدم جما لیے ہیں کہا جاتا ہے کہ دنیا میں سب سے حسین شیرٹن ہوٹل عدیس ابابا میں ہے جو ایک مسلمان کی ملکیت ہے اکثر سونے کی کانیں بھی ان کی ملکیت ہیں۔ ایتھوپیا کی معیشت میں سونے کی کانیں اور کافی کی برآمد بہت اہم ہے۔

مثل مشہور ہے کہ ایتھوپیا کا موسم ہمیشہ خوشگوار رہتا ہے۔ جون جولائی میں معمولی سردی ہوتی ہے نومبر سے فروری تک موسم بہت خوشگوار ہوتا ہے۔ دن اور رات کا فرق سارے سال میں تقریباً یکساں رہتا ہے۔

افریقہ میں تقریباً ۱۳۰۰ سو زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن ایتھوپیا میں وقت اور سال کے دو ضابطے ہیں ایک تو سال کا کیلنڈر وہی ہے جو ہمارا ہے اور دوسرا ان کا اپنا سال ۳۶۷ دن کا ہوتا ہے اس حساب سے وہاں ابھی ۱۹۹۹ چل رہا ہے اور ان کی نئی صدی کا آغاز اس سال ۲۰۰۷ میں ہوگا۔ وہاں کا اپنا سال بھی ۱۰ ستمبر کو ہوتا ہے۔ ان کا مقامی وقت بھی ۶ گھنٹے پیچھے ہے یعنی اگر گرین وچ کے حساب سے صبح کے چھ بجے ہیں تو ان کے حساب سے ۱۲ بجیں گے۔ یوں سمجھئے کہ پاکستان میں شام کے تین بجے ہیں تو وہاں سٹینڈرڈ ٹائم سے ایک بجا ہے۔ وہاں مساجد میں جو گھڑیاں آویزاں ہیں ان میں مقامی وقت رکھا یا جاتا ہے۔ جمعہ کے دن جب نماز پڑھنے گیا تو

عدیس ابابا کے ایک مشہور چوک کا منظر

جنجم ہفت اونیل پر

بہت حیرت ہوئی کہ وقت نماز ۱۵-۷ پر درج تھا جبکہ سرکاری طور پر ۱۵-۱ ہوئے تھے۔

عدلیس ابابا اچھا خاصا سرسبز شہر ہے ہمارے شہر ایبٹ آباد سے ملتا جلتا ہے مگر کئی گنا بڑا ہے۔ موسم انتہائی خوشگوار ہے ایک طرف پہاڑ ہیں جو شہر سے دو تین ہزار فٹ بلند ہیں بالکل ایسے جیسے اسلام آباد میں دامنِ کوہ یا پیر سوہادہ۔ پہاڑ بہت سرسبز ہیں۔ چیڑ وغیرہ مفقود ہیں لیکن سفیدے کی بہتات ہے۔ شہر کے تقریباً وسط میں ایک کافی بلند مقام پر Hill Top Hotel ہے جس سے سارے شہر کا نظارہ بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں کی عدلیس ابابا یونیورسٹی اور عجائب گھر بہت نمایاں ہیں۔ عدلیس ابابا کے مضافات میں بہت سی بڑی بڑی جھیلیں ہیں چونکہ بارش عام ہوتی ہے اس لیے پانی وافر ہے مشہورِ زمانہ نیل ایتھوپیا سے ہی نکلتا ہے۔ بعض جھیلیں تو اس قدر بڑی ہیں کہ دوسرا کنارہ نظر نہیں آتا بلکہ جہاز سے دیکھو تو سمندر کا گماں ہوتا ہے۔ ان میں سب سے بڑی جھیل شالا جھیل ہے جو ۳۱۵ کلو میٹر مربع پر پھیلی ہوئی ہے۔ سطح سمندر سے ۱۵۷۰ میٹر بلندی پر ہے اور ۲۶۶ میٹر گہری ہے۔ دوسری بڑی جھیل لنگانو ہے جو ۲۲۵ مربع کلومیٹر پر محیط ہے ۱۵۸۲ میٹر سطح سمندر سے بلند ہے اور صرف ۱۵ میٹر گہری ہے۔ ہمیں لنگانو پر ایک رات گزارنے کا موقع ملا۔ وہ ہفتہ کا آخری دن تھا اور جھیل عدلیس ابابا سے تقریباً ڈھائی سو کلومیٹر دور تھی۔ شہر سے بہت بڑی تعداد میں مقامی اور بدیسی لوگ آئے ہوئے تھے۔ جنگل میں منگل تھا۔ اس رات چاند بھی پورے زوروں پر تھا۔ تمام رات جھیل کے کنارے ایک جشن کا سماں تھا۔ ہر شخص حسبِ توفیق لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں بھی کہ رات ۹ بجے سونے کا عادی تھا تین بجے تک جاگتا رہا۔ عاصم خاص طور پر اپنے ساتھ آرگن اور گٹار

کے ساتھ کھیلتا رہا اور مجمع میں کافی Popular ہو گیا۔ دوسرے دن بعد دوپہر واپسی ہوئی۔ راستہ میں شتر مرغ پارک دیکھا۔ وہاں شتر مرغ کا سائز ہمارے چڑیا گھر کے شتر مرغ سے بہت بڑا ہوتا ہے۔

عدیس ابابا میں کافی ہوٹل ہیں لیکن عام طور پر نو دس بجے ہوٹلوں کی رونق ماند پڑ جاتی ہے اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ صرف گاف کورس اور بڑے ہوٹل کھلے رہتے ہیں۔ یہاں کے بازاروں میں حرکاتو ایسٹ افریقہ کی سب سے پرانی مارکیٹ ہے۔ یہ سمجھ لیجئے کہ راولپنڈی کا راجہ بازار ہے۔

ایک عجیب بات ہے کہ تعلیم کے فقدان کے باوجود یہاں عورتیں بہت محنت کش ہیں بازاروں سے لیکر پارکنگ تک عورتوں کا قبضہ ہے۔ یہاں کے لوگوں کے نقش عیدی امین سے بہت مختلف ہیں۔ تیکھے نقوش کے مالک ہیں اور رنگ بھی کالے نہیں صرف سانولے کہہ سکتے ہیں۔ بات چیت میں نرم گفتار اور نرم خو ہیں۔ وہاں کا مرغوب مشروب بُنّا کہلاتا ہے جو خاص طریقہ اور خاص کافی سے بنایا جاتا ہے۔

دوران سیاحت کئی دلچسپ واقعات پیش آئے جنہیں بوجہ طوالت نظر انداز کر دیا لیکن ایک واقعہ انتہائی دلچسپ تھا۔ ہم نیروبی سے دوبئی کی طرف محو پرواز تھے میرے داہنی طرف کھڑکی کے ساتھ عفت بیٹھی تھیں اور بائیں طرف ایک اور صاحب تھے۔ بھوک چمک چکی تھی اور غالباً کھانے کی سپلائی شروع ہو چکی تھی۔ میرے پڑوسی بے خبر تھے کہنے لگے "مچھلی کی بو آ رہی ہے" میں نے انتہائی سادگی سے کہا کہ ہم سمندر پر سے گزر رہے ہیں۔ اس پر خاتون نے اسقدر زور سے مجھے ٹھوکا دیا کہ وہ کیرم بورڈ کی گوٹی کی طرح مجھ سے ہوتا ہوا میرے پڑوسی کو جا لگا۔ وہ حیرت سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔

۱۲۔ دسمبر ہمارے ویزے کا آخری دن تھا۔ ہم نے وطن واپسی کے لیے رختِ سفر باندھا۔ ہمارا خیال تھا کہ دو تین دن نیروبی میں گزاریں گے۔ لیکن وہاں کی معلومات بالکل نہ ہونے کے برابر تھیں دوسرے پروازوں کے اوقات ایسے تھے کہ ہمیں کم از کم پانچ دن رکنا پڑتا تھا جو بوجہ علالت ہماری پہنچ سے باہر تھا اس لیے ہم سیدھے دوبئی پہنچے وہاں پانچ دن قیام کیا۔ وہاں کے واقعات۔ حالات و تفریحات ایک الگ داستان ہے پھر کبھی بیان کروں گا دوبئی سے ۱۸ دسمبر کو بخیر و عافیت واپس اسلام آباد پہنچ گئے۔

بیگم طیبہ آفتاب

گھریلو ٹوٹکے

۱۔ دستوں میں لیموں کے فائدے: دستوں میں دودھ میں لیموں نچوڑ کر پینے سے فائدہ ہوتا ہے۔ دستوں کے ساتھ آؤں آتی ہو یا مروڑ ہوں تو لیموں کا رس ایک کپ پانی میں ملائیں اس طرح دن میں پانچ بار پی لیں دست آنا بند ہو جائیں گے۔

۲۔ ناخن نہ بڑھنا: اگر آپ کے ناخن نہ بڑھتے ہوں تو گرم پانی میں لیموں نچوڑ کر اس میں پانچ منٹ انگلیاں ڈبوئیں رکھیں پھر ہاتھ ٹھنڈے پانی سے دھولیں۔ ناخنوں پر لیموں لگانے سے یہ مضبوط اور چمک دار ہو جاتے ہیں۔

۳۔ گیس کا گولا محسوس ہونا: اگر آپ کے پیٹ میں گیس کا گولا محسوس ہو تو ۶ گرام لیموں کا رس آدھا گلاس پانی میں پلانے سے آرام آجاتا ہے۔

۴۔ پیچش میں لیموں کا فائدہ: اگر آپ کو پیچش ہو تو مٹی کے برتن میں 250 گرام دودھ میں ملا کر اور ذائقہ کے مطابق چینی اور آدھا لیموں نچوڑ کر پی لینے سے اگر چہ پیٹ میں ہلکی سی جلن ہو گی۔ لیکن خونی پیچش بند ہو جائے گی۔

۵۔ اگر پیٹ میں کیڑے ہو گئے ہوں تو: اگر پیٹ میں کیڑے ہوں تو لیموں کے بیج پیس کر چورن بنالیں، اور پانی کے ساتھ لیں اس سے پیٹ کے کیڑے ختم ہو جائیں گے اس کی مقدار بڑوں کے لئے ایک سے تین گرام بچوں کے لئے اس کا چوتھائی خالی پیٹ لیموں پانی بھی لیں۔

۶۔ سر درد میں لیموں کے فائدے: اگر سر میں درد ہو تو لیموں کے پتوں کو پیس کر رس نکال

لیں۔اوراس رس کو پی لیں ۔جن لوگوں کے سر میں اکثر درد رہتا ہے ان کے لئے یہ نسخہ اکسیر ہے۔اس کے پتوں کوسوکھا کر سونگھنے سے اور چائے پینے سے بھی بہت فائدہ ہوتا ہے۔

۷۔زکام میں سونف کے فائدے: ۱۵ گرام سونف ۳عدد لونگ آدھا کلو پانی ابال لیں چوتھائی پانی رہنے پر چینی ملا کر گھونٹ گھونٹ کرکے پینے سے زکام کو آرام آتا ہے۔

۸۔ بچوں کے دانت آسانی نکل آئیں گے: اگر بچہ دانت نکالتے وقت روتا ہوتو گائے کے دودھ میں موٹی سونف ابال کر چھان لیں اور ٹھنڈے ہونے پر ایک بوتل میں بھر لیں اور ایک ،ایک چمچہ چار بار پلائیں۔اس سے دانت آسانی سے نکل آتے ہیں۔

۹۔قالین کے داغ صاف کرنے کا طریقہ: قالین پر اکثر بچے چائے گرادیتے ہیں جس کا داغ بہت برا لگتا ہے آپ اس پر فوراً نمک چھڑک دیں جب خشک ہو جائے تو برش سے صاف کر دیجئے داغ صاف ہو جائے گا۔

۱۰۔ گھی گوار کا پودا بہت کام کا ہوتا ہے: اس کو گھر میں ضرور لگایئے۔باورچی خانہ میں ہاتھ جل جائے۔یا جسم پر گرم پانی گرے فوراً گھیگوار کی شاخ کاٹ کر اس کا لیپ کریں چند منٹ لگانے سے جلن اور درد ختم ہو جائے گا۔

۱۱۔ روغن کلونجی کے فائدے: روغن کلونجی کے چند قطرے صبح وشام نیم گرم دودھ یا چائے میں ملا کر چند ہفتے استعمال کرنے سے فالج۔لقوہ اعصابی کمزوری اور جوڑوں کے درد کو فائدہ ہوتا ہے۔

۱۲۔ الرجی سے پیچھا چھڑایئے: پنساری سے گل بنفشہ خریدیئے پھول دیکھ لیں پرانے اور بدبو دار نہ ہوں رات کو مٹی کے برتن یا شیشے کے پیالے میں مٹھی بھر بھگو دیں صبح چھان کر پی لیں، چند دن میں فائدہ ہوگا۔بے ضرر نسخہ ہے۔